

ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
دسمبر 2016
Darr Digest December 2016

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 3 دسمبر 2016ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

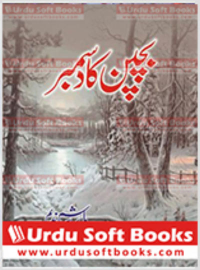
سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے



www.urdusoftbooks.com



بچپن کا دسمبر
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



لہو کا بوجھ
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



قیدِ حیات
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



رنگ لاتی ہے حنا
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



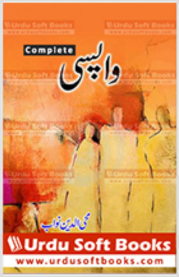
کمال راز زوال
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



ٹکراؤ
محمد محی الدین
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



مقدس
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



Complete
واپسی
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



عبداللہ
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



ایک محبت اور سہی
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



ایک رات کی ملکہ
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



خدا اور محبت
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



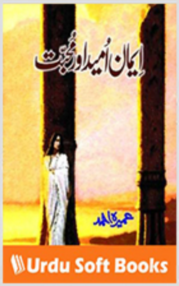
بدستِ زندہ
محی الدین نواب
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



پری زاد
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



صلیبِ عشق
ہاشم ندیم
Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com



ایمان اُمید اور محبت
عمیرہ احمد
Urdu Soft Books

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے کہ آندھی کے دن اس پر زور کی ہوا چلے اور اسے اڑا لے جائے اسی طرح جو کام وہ کرتے رہے، ان پر کچھ دسترس نہ ہوگی یہی تو پرلے سرے کی گمراہی ہے۔ (سورۃ ابراہیم 14 آیت 18)

☆ اور وہی تو ہے جو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 12)

☆ اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور بہت کچھ جاننے کے بعد ہر چیز سے بے علم ہو جاتے ہیں بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 70)

☆ اور آسمان سے برکت والا پانی اتارا اور اس سے باغ و بستان اگائے اور کھیتی کا اناج۔ (سورۃ ق 50 آیت 9)

☆ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا کنیزوں سے جو ان کی ملک ہوتی ہیں کہ ان سے مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں۔ (سورۃ مومنون 23 آیت 5 سے 6)

☆ (اے محمد) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہہ دو کہ وہ لوگوں کے کاموں کی میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 189)

☆ تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 3)

☆ تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرے اور اس کی آیتوں کو جھٹلائے؟ بے شک گنہگار فلاح نہیں پائیں گے۔ (سورۃ یونس 10 آیت 17)

☆ کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا ڈالا تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 88)

☆ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لئے تمہارے باپ ابراہیم کا دین پسند کیا۔ اسی نے پہلے یعنی پہلی کتابوں میں تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی وہی نام رکھا ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 78)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

انعم شہزادی گجرات سے، مسکراہٹیں بکھیرتے، دل لبھاتے قارئین اینڈ اسٹاف ڈر السلام علیکم، بفضل خدا آئی ایم فائن اینڈ آئی ہوپ کہ آپ سب ساتھی بھی خیر و عافیت سے ہوں گے، لیجئے میں پرخلوص نیک تمناؤں، خالص ترین دعاؤں کے ساتھ نوازش نامہ لئے حاضر خدمت ہوں۔ لیکن مجھے ہر ماہ حاضری کے لئے بڑی دقت درپیش آتی ہے۔ فرسٹلی حصول رسالہ سیکنڈلی ارسال ڈاک کیونکہ میں گھر سے نکلتی نہیں اور بھائی کوئی کام جلدی سے کئے نہیں دیتا، بڑی چال چاپلوسی کرنا پڑتی ہے۔ صد شکر، دونوں پرابلم سہہ لوں گی مگر اتنی محنت و لگن اور مشقت اٹھا کر کراچی تک تبصرہ پہنچا کر گھر لوٹے ابھی پسینہ خشک نہیں ہونے پاتا کہ تبصرہ شائع ہوکر جدید تراش خراش، ادھر چیڑی فل باڈی آپریشن، جابجا ٹانکے لگا ہوا، اپنی مظلومیت کا ماتم کرتا میرے پاس آیا، یقین کیجئے میرا بی پی ہائی ہوکر چکر آنے لگ گئے تھے۔ خدا خدا کے لئے بے رحم جبڑوں والی قینچی کو ذرا دور رکھا کریں۔ خدا آپ کا اقبال بلند فرمائے۔ (آمین) دوسری بات خطوط کی محفل شاندار تب لگتی ہے جب سبھی مہمانان بزم خوشگوار انداز میں گپ شپ کرتے نظر آئیں۔ مگر ڈر کی محفل شاید ڈر کی وجہ سے ڈری سہی دکھائی دیتی ہے...... بالکل سوکھا پن سرد و مہر سا رویہ...... ڈیئر لکھاری بہن و بھائیوں محفل میں دلچسپی و خوشگواریاں لائیں...... میری طرف سے تمام ریڈرو رائٹر، ممبران شاہین گروپ و گجراتی بہنیں ماریہ سرور اینڈ پیا سحر کو ڈھیروں دعائیں خدا سب کو سلامت رکھے۔

☆☆ انعم صاحبہ: چلئے آپ کے کہنے سے بے رحم قینچی کی چھٹی کردی۔ اب تو خوش ہیں ناں اور اب یہ بھی امید ہے کہ تمام قارئین آپ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے خط میں دلچسپی ضرور پیدا کریں گے اور ہاں ایک بات آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولئے گا مت۔

Thanks۔

رابعہ عباس بستی فتے والی سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، اب بات کی جائے ٹائٹل کی تو لاجواب ہے۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ پچھلے مہینے ستمبر 2016ء کا ڈر لینے دکان پر پہنچے۔ یہ سن کر موڈ سارا بگڑ گیا کہ ڈر ختم ہوچکا ہے۔ اور پھر کیا دکان دار سے لڑائی ہوگئی۔ ہم ہر مہینے لے کر جاتے ہیں آپ نے ہمارا ایک ڈر رکھا کیوں نہیں۔ اس وجہ سے ہماری عید بھی اچھی نہ گزری۔ کیونکہ ڈر جو نہیں ملا تھا۔ اس بات پر صبر کہ چلو سالگرہ نمبر تو ملے گا۔ اب بات کی جائے اکتوبر 2016ء کی تو واہ کیا بات کروں۔ سب سے پہلے پہنچے دشمن روحیں تو نوٹ دیکھ کر پتہ چلا۔ تو ایم اے راحت کے لئے دل سے لاکھوں دعائیں نکلیں۔ اس کے بعد جلدی جلدی محمد خالد شاہان کی کہانی اسرار پر پہنچے تو ساری کی ساری پڑھ کر دم لیا۔ شاہان بھائی مبارکاں۔ ادھوری چاہت، قاسم بھائی بہت بہت مبارک ہو۔ آئینہ کا راز، رضوان آپ بھی مبارکباد کے حقدار ٹھہرے۔ بہت اچھی ہے کہانی، ملک این اے کاوش، کیا بات ہے اتنی زبردست کہانی، آپ بھی مبارکباد کے حقدار ٹھہرے۔ ایس امتیاز احمد موت کی آواز کیا زبردست کہانی ہے۔ آپ بھی مبارکباد کے حقدار ٹھہرے۔ باقی ڈر میں نے پڑھا نہیں یقین ہے کہ وہ بھی اچھا ہوگا۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: اس لئے کہا گیا ہے کہ جلدی آیئے اور جلدی پایئے۔ دکان دار سے لڑنے کے بجائے ذرا جلدی دکان پر حاضری دے دیا کریں۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے آپ اور ڈر کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے، نومبر کا میگزین ہاتھ میں ہے۔ سرورق انتہائی شاندار لگا، بالکل ہارر، ڈائجسٹ کی مناسبت سے اتنا بہترین رسالہ نکالنے کے لئے تھینکس آف!! ہر ماہ ہم جیسے قارئین کو ایک ہی رسالے میں اتنا ڈھیر سارا مواد مہیا کیا جاتا ہے کہ حرید کی چاہ نہیں رہتی۔ ڈر ابتدا سے انتہا تک شاندار تحریریں لئے حاضر ہوا۔ "خوابوں کا اسیر" بلاشبہ بہترین تحریر تھی اور "آب حیات" احسان الحق صاحب کمال کی تحریر لائے ہیں آپ، قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوگیا کیا عمدہ تحریر ہے! بہترین طرز تحریر نے ایک لمحہ کے لئے بھی دھیان بھٹکنے نہ دیا۔ "شیطانی محل" ایس امتیاز احمد حسب سابق چھائے رہے لاجواب تحریر تھی۔ "کتابی کردار" پرتحیر، اتنی دلچسپ کہ ایک ہی نشست میں ختم کرکے دم لیا، پرچے کی جان ثابت ہوئی، "مہنگی دوستی" "وہ کون تھا" ضرغام محمود "رہنمائی" احسان سحر "پوجا" ناصر محمود فرہاد نے اپنی مکمل گرفت میں جکڑے رکھا (Awesome) خطوط میں دوستوں کے مختصر اور جامع تبصرے دلچسپی کا باعث بنے مگر ساتھ کافی دوست غیر حاضر تھے جن کی کمی محسوس ہوئی، فلک زاہد اور ساحل دعا

بخاری کی تحریروں کی بھی کمی محسوس ہوئی۔نئی کہانی مکمل ہوتے ہی ارسال کردوں گی اور ہاں جنہوں نے مجھے ''برتھ ڈے'' پروش کیا تھینکس سوچ!!! آخر میں ڈر کی تمام ٹیم کے لئے دعاگو ہوں۔

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: دلی لگاؤ کے ساتھ کہانیاں پسند کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ، لیجئے ساحل دعا بخاری کی کہانی شامل اشاعت ہے۔امید ہے نئی کہانی کے ساتھ تبصرہ جلد ارسال کریں گی۔شکریہ۔

فلک زاھد لاہور سے، السلام علیکم! ماہ نومبر کا ڈر بذریعہ ڈاک 21 اکتوبر کو موصول ہوا سرورق دلفریب تھا خطوط کی محفل گرما گرم تھی میری کہانی ''پاگل عورت'' پسند کرنے کے لئے اقراقریشی، ایس حبیب خان، ضرغام محمود، طارق محمد، گلاب خان سولنگی اور پیارے بھائی محسن عزیز حلیم کا بہت بہت شکریہ، بھائی ضرغام محمود کبھی کبھی غلط فہمیاں ہوجاتی ہیں کوئی بات نہیں۔خطوط میں سبھی کے تبصرے پسند آئے، خاص کر محسن عزیز حلیم کا خلوص نامہ پڑھ کر ہمیشہ بہت خوشی ہوتی ہے......اس ماہ کہانیوں میں سب سے سپرہٹ اسٹوری احسان الحق کی ''آب حیات'' رہی......دوسری ہٹ اسٹوری شہزادہ چاند زیب کی ''خوابوں کا اسیر'' تھی......''کتابی کردار'' شکیل نیازی کی تیسری زبردست اسٹوری تھی......''وہ کون تھا'' ضرغام محمود صاحب اعلیٰ اسٹوری......''آخری آرام گاہ'' مریم فاطمہ اچھی اسٹوری......''آسیبی گھر'' اقراء قریشی ویری گڈ اسٹوری......''شیطانی محل'' ایس امتیاز احمد نائس اسٹوری......''فردوس'' رضوان علی سومرو اور ''موت کا معمہ'' محمد شعیب یہ دونوں بھی اچھی کہانیاں تھیں......اب اجازت خدا حافظ......!

☆☆ فلک صاحبہ: یہ حقیقت ہے کہ اکثر غلط فہمی ہوجاتی ہے لہٰذا اسے فراخ دلی کے ساتھ نظر انداز کردینا چاہئے۔خیر آپ کی کہانی شامل اشاعت ہے۔اور نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم! نومبر کے ڈر ڈائجسٹ میں ایم الیاس صاحب کی کہانی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔جس کسی نے میری کہانی آسیبی اسکول پر تبصرہ کیا اس کا بہت بہت شکریہ اور آپ کا بھی شکریہ کہ نومبر کے شمارے میں میری کہانی آخری آرام گاہ شائع کی۔میں اپنی ایک اور چھوٹی سی کہانی ''موم کی گڑیا'' لکھ کر بھیج رہی ہوں، برائے مہربانی اسے ضرور شائع کیجئے گا اور میری باقی کی کہانیاں ''قاتل پنچھی'' ''اپارٹمنٹ 1607'' ''رات کا بادشاہ کب شائع ہوں گی۔پلیز انہیں بھی شائع کردیں۔اچھا اب اجازت۔

☆☆ مریم صاحبہ: آپ کی کہانی کمپوز ہوچکی ہے۔آئندہ شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔دیگر کہانیاں بھی وقت کے حساب سے شائع ہورہی ہیں۔آئندہ آپ جو کہانی لکھیں تو پلیز اس کے صفحات مزید بڑھادیں۔Thanks۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، قابل قدر خالد بھائی آداب، آپ کے ادارے کے قابل احترام شاہد علی، آصف حسن، محمد ذیشان جس طرح چھوٹے بڑے لکھنے والوں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے ڈر میں جگہ دیتے ہیں، میں آپ سب کا مشکور ہوں، شروع میں شہزادہ چاند زیب کو آخر میں احسان الحق کو جگہ دے کر رسالے کو چار چاند لگادیئے۔ٹائٹل بھی ڈر کے مطابق تھا۔شاہد کی ذہانت کو سلام، بہت سمجھدار ہیں، شہاب شیخ کے لئے دعاگو ہیں۔اللہ ان کی مغفرت فرما کر جنت میں جگہ دے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: خلوص دل سے ڈر کی کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، یہاں یاد آیا، خط میں اپنا فون نمبر ضرور لکھئے گا۔

طارق محمود کامرہ اٹک سے، السلام علیکم! نیا شمارہ سامنے ہے، سرورق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے قرآن کی باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے پہنچے خطوط کی محفل میں، جہاں کچھ کھٹی میٹھی تنقید و تعریف کی باتیں پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، ''وقت کی قیمت'' اور ''رہنمائی'' اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے اچھی کہانیاں تھیں۔ناصر محمود فرہاد ''پوجا'' سسپنس کے لبادے میں لپٹی تجسس وہارر زدہ کہانی لیکن بہت ہی مختصر مگر عمدہ اسٹوری، بہت اچھی جی......''رولوکا'' اے وحید صاحب بہت ہی بہترین طریقہ سے چلارہے ہیں۔ایس امتیاز احمد صاحب کی ''شیطانی محل'' ایک حقیقت پر لکھی کہانی جسے پڑھ کر لطف آیا، ''دشمن روحیں'' اور ''اسرار'' پڑھ کر مزہ آرہا ہے۔''آخری آرام گاہ'' مریم فاطمہ کی ہارر اسٹوری اچھی لگی۔''آب حیات'' جب شروع کی تو تھوڑی سی پڑھ کر محسوس ہوا کہ وہی کہانی ہوگی آب حیات تلاش کرنے کی لیکن کہانی تو بالکل اس موضوع سے مختلف ثابت ہوئی، کہانی ہوتی ہے جیسے اسے بہتر لگتا ہے اس کہانی کے آخر میں بہت اچھا سبق تھا، آب حیات کا اصل راز تو واقعی اللہ کے احکامات اور سچے دل سے عبادات کرنے میں ہی پوشیدہ ہے۔''خوابوں کا اسیر'' ''فردوس'' اپنے اچھوتے خیال اور بہترین کہانیاں تھیں۔باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں، ہر رائٹر نے محنت سے لکھی۔قوس قزح بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔رسالہ ہر لحاظ سے اچھا جارہا ہے۔میری دعا ہے کہ ڈر ترقی کی مزید منزلیں طے کرتا رہے۔آمین۔

☆☆ طارق صاحب: کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہوجائیں، نئی کہانی موصول ہوچکی ہے اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

ضرغام محمود کراچی سے، آداب عرض ہے، ماہ نومبر 2016ء کا ڈر ڈائجسٹ 24 اکتوبر کو ملا، سرورق اچھا لگا، ڈر ڈائجسٹ کے خوب صورت گلشن میں ہم داخل ہوئے تو سب سے پہلے خطوط پر نظر پڑی رنگ برنگے نت نئے تلخ و شیریں خطوط پر نظر دوڑائی ایک بار پھر قارئین کہانیوں پر تبصرہ کم کرتے نظر آئے۔ قارئین بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے اور تعمیری تنقید کیا کیجئے تاکہ مصنفین آپ کی آرا کی روشنی میں اپنی تحریروں کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔ ڈر کے گلشن کا پہلا پھول شہزادے صاحب کی ”خوابوں کا اسیر“ تھی۔ نہایت عمدہ تحریر جس نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑ کر رکھا، ڈر کے گلشن کا دوسرا پھول ایم الیاس کی ”وقت کی قیمت“ تھی اور ڈر کے گلشن کا تیسرا پھول احسان سحر کی ”رہنمائی“ تھی۔ لگتا ہے یہ دونوں پھول غلطی سے ڈر کے گلشن میں کھل گئے کیونکہ یہ تو کسی معاشرتی گلشن کے پھول تھے ڈر کے گلشن کا بنیادی تھیم ایڈونچر اور خوف ہے جس سے یہ دونوں تحریریں عاری تھیں، ڈر کے گلشن کا اگلا پھول ناصر محمود فرہاد کی ”پوجا“ تھی اس تحریر کی خوشبو چہار سو پھیلی رہی۔ مہر پرویز احمد دولو کا ”پچھتاوا“ یہ پھول بھی شاید غلطی سے ڈر ڈائجسٹ کے گلشن میں کھل گیا ورنہ اسے بھی کسی معاشرتی باغیچے میں کھلنا چاہئے تھا۔ ڈر کے گلشن میں اگلا مہکتا اور کھلکھلاتا پھول رضوان علی سومرو کی ”فردوس“ تھی جو ہر جانب اپنی جانفزا بہار دکھلا رہا تھا۔ انہوں نے واقعات سے پر ایک پرتجسس تحریر ”آسیبی گھر“ اقراء قریشی کے ہاتھوں سے کھلا پھول ڈر کے باغیچے کو مہکا رہا تھا۔ ڈر کے باغیچے میں اگلا پھول شکیل نیازی کا ”کتابی کردار“ تھا۔ عمدہ خیال اور لکھنے کا دلچسپ انداز کہانی کو خوب صورت بنا گیا اگر شکیل نیازی اس پھول پر تھوڑی سی اور محنت کر لیتے تو یہ پھول یقیناً ڈر ڈائجسٹ کے باغ کا سب سے عمدہ پھول بن جاتا۔ کہانی کو بہت جلدی سمیٹ دیا گیا شکیل بھائی بعض کہانیاں اپنے آپ کو طویل کرتی ہیں تو انہیں طویل ہونے دیا کریں۔ ڈر کے باغ کا اگلا مہکتا پھول مریم فاطمہ کی ”آخری آرام گاہ“ تھی۔ یہ عمدہ تحریر تھی جو ڈر کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ ڈر کے گلشن میں آگے ”موت کا معمہ“ محمد شعیب ”پراسرار بلی“ ماریہ سرور ”مہنگی دوستی“ رضوان قیوم ”ناگن کا انتقام“ ملک این اے کاوش...... یہ سارے پھول ڈر کے گلشن کو اپنی خوشبو سے مہکار ہے تھے۔

اب آخر میں ڈر کے گلشن کا سب سے عمدہ خوش رنگ، خوش جمال، خوشبودار پھول احسان الحق کی ”آب حیات“ تھی اس پھول کی خوشبو ڈر کے گلشن میں چاروں طرف چھائی رہی۔ غرض ڈر ڈائجسٹ کا گلشن مہکتے پھولوں اور خوش رنگ کلیوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر پھول ڈر کے گلشن کی رونق بڑھا رہا تھا اسی لئے جو بھی ڈر ڈائجسٹ کے گلشن میں ایک بار آجاتا ہے پھر وہ کہیں نہیں جاتا...... اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کے گلشن کو اسی طرح کھلتا اور مہکتا رکھے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆ ضرغام صاحب: ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے گلشن کا ہر پھول ہر لمحے تروتازہ اور مہکتا رہے۔ خلوص دل سے تجزیہ لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔

محمد ندیم عباس میواتی چوکی سے، السلام علیکم! نومبر کا شمارہ چونکا دینے والے ٹائٹل کے ہمراہ ہاتھوں کو لرزانے لگا تو جلدی سے ورق در ورق پلٹے۔ خطوط کی محفل میں پہنچا، جہاں محترمہ انجم شہزادی صدارت محفل نظر آئیں، واقعی کافی عرصہ بعد جلوہ گر ہوئی ہیں ویلڈن، اقرا قریشی، محترمہ ایس حبیب خان، ضرغام محمود، طارق، ریاض حسین قمر، مہر پرویز احمد، محمد اسلم جاوید، خضر حیات، ابوہریرہ بلوچ، محسن عزیز حلیم کے جامع مانع تبصرے تھے۔ ویلڈن تمام لکھاریوں کی تحریروں میں دم آپ سب کی ہی بدولت ہے۔ کہانیوں کی طرف سے صفحہ اول کے رائٹر ایم الیاس، ایم اے راحت، ایم خالد شاہان کی اسٹوریاں ٹاپ کلاس جا رہی ہیں خاص کر ”اسرار“ میں شریم کے کردار نے کافی ڈرا دیا ہے۔ ویلڈن خالد بھائی خدا آپ کو صحت و سلامتی عطا فرمائے۔ ناگن کا انتقام، ملک این اے کاوش زبردست تھی۔ آپ بہت علیل ہیں۔ خدا آپ کو صحت عطا فرمائے۔ آمین۔ پچھتاوا، مہر پرویز احمد گڈ مین، رہنمائی واقعی اچھی کہانی تھی گڈ احسان سحر، آسیبی گھر، کتابی کردار، پراسرار بلی، خواب کا اسیر، آخری آرام گاہ، آب حیات زبردست اسٹوریاں تھیں۔ قوس قزح اور غزلیات کا سلسلہ اچھا رہا ہے۔

☆☆ محمد ندیم صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، مدیران محترم! اسلام مسنون! آپ کے لئے اور آپ کے محنتی عملہ کے لئے ڈھیروں دعائیں، آپ کے معاونین کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے کہ ہمارا یہ پسندیدہ جریدہ بروقت ہمارے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ فہرست پر نظر پڑتے ہی مصنفین

کے نام پڑھ کر ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس بات بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ صرف ایک صفحہ پر پڑھیں، ایمان تو تازہ ہوا مگر ایک تشنگی سی باقی رہ گئی، تشنگی تو دو صفحات میں بھی قمی رہتی ہے۔ مگر حد تک دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ خطوط کی محفل میں اس بار 22 بہن بھائی موجود ہیں اور اپنی اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار فرمارہے ہیں محترمہ انعم شہزادی کافی عرصہ کے بعد تشریف لائیں۔ اور جلدی سے لوٹ گئیں، اقرا قریشی، ایس حبیب خان اور مریم فاطمہ کے تبصرے اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ آپ نے دو محمودوں (ضرغام محمود اور طارق محمود) کو یکجا کر دیا، دونوں کے خطوط اور تبصرے خوب تھے۔ طارق بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ، مہر پرویز احمد بھی اچھا تبصرہ لائے ہیں۔ شرف الدین جیلانی کا مختصر تبصرہ پسند آیا۔ گلاب خان سولنگی بھی ایک اچھا تبصرہ لے کر تشریف لائے۔ محترم ایم اے راحت کی صحت مندی کے لئے دعا کی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ کریم سب کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ میری بھی دلی دعا ہے کہ خداوند کریم ایم اے راحت صاحب کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ باقی کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ''قوس قزح'' کے تمام اشعار بہت اچھے ہیں۔

☆☆ ریاض حسین صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر بہت خوشی محسوس ہوتی ہے اور امید ہے کہ اس خوشی کا ہر ماہ خیال رکھیں گے۔ Thanks۔

اسلم ساگر لاہور سے، محترم ڈر اسٹاف، رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے تو ڈر انتظامیہ سے شکوہ ہے کہ میرا خط کیوں شامل نہیں کیا، میں نے بڑی مشکل سے ٹائم نکال کر سالگرہ نمبر کے لئے تبصرہ اور کئی ضروری پیغام رائٹرز کے نام لکھے تھے، اپنا خط نہ دیکھ کر دلی دکھ ہوا ہم تو 18 تاریخ سے ڈر کی راہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ہاں احسان الحق صاحب کا خط بھی نہیں تھا۔ اللہ انہیں صحت عطا فرمائے چلیں خیر اب پلیز دونوں خط ضرور شائع کرنا شکریہ، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پھر خطوط پڑھے، خط سب کے اچھے تھے بس میرا اور احسان الحق صاحب کا نہیں تھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے قسط وار پڑھیں رولو کا اے وحید صاحب ملک کے ایک بڑے رائٹر ہم کیا تبصرہ کریں 101% شاہکار کہانی، دشمن روحیں، ایم اے راحت صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو جلدی صحت یاب کرے۔ (آمین) اس بار مختصر لیکن شریک ہوئے ویلڈن جناب۔ اسرار محمد خالد شاہان، خالد شاہان بھائی آپ 100% صحیح جارہے تھے۔ خوابوں کا اسیر۔ شہزادہ چاندزیب ڈر خوف سسپنس سے بھرپور شاہکار کہانی عیاش پولیس افسرن کے لئے اچھا سبق 100 میں 100 نمبر، وقت کی قیمت ایم الیاس صاحب مختصر مگر اچھی انٹری الیاس صاحب کی 100 میں 80 نمبر، پوجا ناصر محمود فرہاد جناب آپ پرانے رائٹر ہیں جاندار اسٹوری لائیں آپ کی کہانی نے بور کیا پھر بھی 100 میں سے 70 نمبر۔ پچھتاوا مہر پرویز صاحب واقعی آپ کا ایک ایک لفظ سچا ہے اس دور میں ایسا بھی ہے پیسے کے لئے اور عیاشیوں کی خاطر لوگ خدا کو بھول چکے ہیں ایک اچھا سبق Good، 100 میں سے 100 نمبر آپ کے ہوئے، فردوس، رضوان علی سومرو، ویلڈن جناب وہ سب کچھ کہانی میں موجود ہے جو ہم لوگ پڑھنا چاہتے ہیں، خوف، سسپنس عیاش راجاؤں کا برا انجام 100 میں سے 100 نمبر آپ کے ہوئے۔ آسیبی گھر اقرا قریشی، مختصر مگر Good اور محنت کریں بڑی اسٹوری بعد میں لانا محنت جاری رکھیں۔ ایک دن آپ بڑی رائٹر ہوں گی۔ اقرا جی نمبر آپ کو ملتے ہیں 100 میں سے 80، کتابی کردار شکیل نیازی ویری گڈ جناب اچھی کہانی 100 میں سے 90 نمبر آپ کو ملے۔ شیطانی محل ایس امتیاز احمد بھائی آپ بڑے رائٹر ہیں کوئی Long Story لائیں۔ آج کل تبصرہ بھی نہیں آرہا، اللہ آپ کو جلدی مکمل صحت یاب کرے۔ 100 میں سے 90 نمبر آپ کے ہوئے۔ وہ کون تھا ضرغام محمود ویلڈن جناب بہت خوب جب چاہت سچی ہو تو لوگ مر کر بھی مدد کے لئے آجاتے ہیں 100 میں سے 100 کے حقدار ہیں آپ، آخری آرام گاہ مریم فاطمہ ویری گڈ نوجوان نسل سوچے سمجھے بغیر پنگا لے تو انجام موت بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا سبق 100 میں سے 90 فیصد نمبر ملتے ہیں آپ کو، موت کا معمہ محمد شعیب ویلڈن جی آپ نے بھی اچھا لکھا 100 میں سے 80 نمبر۔ پراسرار بلی، ماریہ سرور کی بہت ہی اچھی کہانی Good ماریہ جی 100 میں سے 100 نمبر کی حقدار کہانی، مہنگی دوستی رضوان قیوم، رضوان بھئی یہ کہانی آج دوسری مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ بہت اچھی کہانی نمبر تو 100 میں سے 100 ہیں لیکن میں ڈر میں اسے دوسری مرتبہ پڑھ رہا ہوں، کچھ سال پہلے بھی یہ پڑھ چکا ہوں۔ ناگن کا انتقام گڈ ملک جی گڈ ناگن تو آئی مگر مختصر اچھی کہانی 100 میں سے 100 نمبر ہو گئے۔ آپ کے شعر غزلیں بھی بہت اچھی تھیں۔ آخری کہانی آب حیات، احسان الحق صاحب جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ Good، 100 میں سے 100 نمبر اور ڈھیروں دعائیں آپ کی صحت کے لئے اس کے ساتھ ہی اس مہینے کا تبصرہ ختم جن کو تبصرہ پسند آیا ان کا شکریہ، اس ماہ محسن عزیز حلیم کا تجزیہ بڑا شاندار تھا۔ Good لڑکے ایسے ہی ہر ماہ لکھتے

رہو۔سب کے نام لکھنا مشکل ہے سب کو سلام میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، ڈر کی ترقی کے لئے دعا ہے کسی کو میری کوئی بات بری لگے تو معاف کرنا۔

☆☆اسلم صاحب: دراصل پچھلے ماہ آپ کا خط بہت لیٹ موصول ہوا تھا، کاپیاں جا چکی تھیں اور آپ کو دکھ پہنچا اس کے لئے ویری سوری، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ اور خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم! تمام ڈر اسٹاف، ریڈر اینڈ رائٹرز کو میری طرف سے محبت بھرا اسلام، نومبر کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے ہے۔قرآن کی باتیں بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔خطوط میں بہت سے ستارے غائب تھے۔جس نے لکھا اچھا لکھا۔خوابوں کا اسیر جہانزیب بھائی لائے اور اچھا گئے ویری نائس۔وقت کی قیمت ایم الیاس صاحب لائے ایکسکیوزمی سر آپ کی اسٹوری گھریلو اسٹوری تھی اور آپ کہاں غائب ہیں آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی ہے۔رہنمائی احسان سحر، آپ کی کہانی واقعی قابل ستائش ہے۔پوجا ناصر محمود فرہاد یہ کہانی بھی مقبرہ کی طرح تھی۔پچھتاوا پرویز احمد نے بہت اچھا لکھا۔فردوس رضوان علی ویری نائس، آسیبی گھر اقرا قریشی آپ بہت اچھا لکھنے لگی ہیں ویلڈن، کتابی کردار شکیل نیازی بہت زبردست کہانی لے کر آئے، کمال کردیا آپ نے، شیطانی محل امتیاز احمد ویری گڈ، دشمن روحیں ایم اے راحت یہ قسط بھی اچھی رہی آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہیں۔وہ کون تھا ضرغام محمود بہت سپر ہٹ اسٹوری رہی، آخری آرام گاہ مریم فاطمہ گزشتہ کہانی سے یہ کہانی کئی گنا اچھی تھی۔ اسرار محمد خالد شاہان قسط نمبر 4 بھی زبردست رہی۔موت کا معمہ محمد شعیب نے بہت اچھا لکھا۔اس کے علاوہ تمام کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆محسن عزیز صاحب: امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں شکریہ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ماہ نومبر 2016 کا شمارہ سامنے ہے۔ٹائٹل متاثر نہ کرسکا؟ مگر اسٹوریز کا جواب نہیں، "ڈر" میں خوبصورت لکھنے والے آرہے ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے، ہمارے آرٹیکلز اور غزل کو جگہ دینے کا Thanks۔میٹرز آپ کے پاس ہیں۔پلیز دیکھئے گا۔اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام۔اپنا خیال رکھئے گا۔!

☆☆امتیاز صاحب: آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی مگر تجزیہ کی کمی بھی محسوس ہوئی، امید ہے غور فرمائیں گے Thanks۔

سید محمود حسن کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب ایڈیٹر و اسٹاف خیریت سے ہوں گے، ہر ماہ کی طرح ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کا انتظار رہا، لیکن جب ڈر ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں آیا اور ہمیشہ کی طرح تمام کہانیاں ہی معیاری اور اچھی تھیں، لیکن اپنا خط، خطوط کی محفل میں نہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ نجانے میرا لکھا ہوا خط بذریعہ ای میل میں نے بھیجا تھا، شاید پہنچا ہی نہیں یا جگہ کی کمی کے باعث شائع نہیں ہوا، بہرحال خوابوں کا اسیر ایک بہترین قسم کی تحریر تھی، یعنی شہزادہ جہانزیب عباسی صاحب نے اپنے لکھنے کے اعلیٰ معیار کو حسب سابق برقرار رکھا تھا، اسی طرح احسان الحق صاحب کی آب حیات نے بھی آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا، رولوکا، دشمن روحیں اور اسرار تو کسی تعریف کی محتاج ہی نہیں، امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح اپنے قارئین کو اپنی گرفت میں رکھیں گی، نہایت خلوص کے ساتھ ڈر ڈائجسٹ کی ترقی و کامرانی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆محمود صاحب: پچھلا خط ہم تک پہنچا نہیں، کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو اگلے شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب ڈر ڈائجسٹ، آداب عرض! حیرت ہے اور بہت زیادہ حیرت! کسی دوسرے پر نہیں بلکہ خود پر حیرت ہے۔جو ادب سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود ادب کے لئے وقت نہیں نکال پا رہا۔پچھلے کچھ ماہ سے میں ڈر سے غیر حاضر رہا۔جس کے لئے معذرت، میری مکمل کوشش ہوگی کہ ڈر کو مکمل توجہ دوں اور کوئی غیر حاضری نہ ہو۔نومبر 2016 کا ڈر ملا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت، آب حیات کو پڑھا، خوب صورت کردار نگاری اور واقعات کا خوب صورت انداز میں پیش کرنے کے بعد خوب صورت سوچ سامنے آئی۔واقعی خدا کا ذکر ہی اصل آب حیات ہے۔Good۔وقت کی قیمت، ایم الیاس کی، میری تحریروں کو پسند کرنے والے تمام قارئین کا دلی شکریہ۔ڈر ڈائجسٹ میں پہلے جیسی محبت محسوس ہوئی ہے۔امید ہے یہ محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔یہ محبت قارئین کے خطوط سے ظاہر ہوتی ہے جو بڑے اچھے انداز میں تحریروں کو پسند کرتے ہیں، خدا ان سب کو خوش رکھے۔آمین۔سب

کے لئے دلی دعا۔ خدا کرے ڈر اور اس کے تمام ساتھی ہمیشہ ترقی کریں۔ آمین۔

☆☆ مدثر صاحب: نیا موسم بھی شروع ہو چکا ہے۔ مگر نئی کہانی ابھی تک نہیں پہنچی۔ پلیز! غور کریں اور پہلی فرصت میں..... کہانی کمپوز ہو چکی ہے آئندہ شمارے میں Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کافی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ شہر جاؤں گا مگر کام کی مصروفیات کی وجہ سے مقررہ تاریخ پر شہر نہ جاسکا۔ آج جب گیا تو بکسٹال پر پہنچا تو ماہ نومبر کے شمارے سے ملاقات ہوگئی۔ سرورق پہلے سے زیادہ بہتر تھا۔ یہی تو پرچے کی جان ہوتی ہے۔ اندر جب جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی۔ ایسا کامیاب اور معیاری ڈر ڈائجسٹ نکالنا اس مہنگائی کے دور میں آپ ہی کا کام ہے۔ قارئین کی دعاؤں اور آپ کی انتھک محنت سے آپ کو اسی کا ثمر ملتا ہے۔ قرآن کی باتیں خوب اچھا سلسلہ ہے اس بار ہر کہانی اپنی اپنی جگہ پر بہتر تھیں۔ غزلیں خوب سے خوب تر تھیں، نئے اور پرانے قارئین کو آپ احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہی آپ کی بڑی عنایت ہے اسی جذبے کے تحت ہم دل کے بے حد اقرار آپ کو ہر ماہ یاد کرتے ہیں، خطوط میں قارئین کی رائے سے ڈر ڈائجسٹ کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا اپنائیت بھرا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے آپ کی محبت قابل دید ہے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ اور خوشیوں میں اضافہ کرے۔ (آمین)

محمد قاسم رحمان ہری پوری سے، السلام علیکم! نومبر کا ڈر 21 اکتوبر کو موصول ہوا جس کے لئے دلی شکریہ، ایسی محبت ایسی اپنائیت صرف ڈر سے ملتی ہے۔ تب ہی ڈر کے لکھنے والوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھنے کے بعد خطوط کا مطالعہ کیا۔ سب خط بہت اچھے تھے۔ سب سے پہلے خوابوں کا اسیر پڑھی۔ شاندار کہانی ثابت ہوئی۔ ویلڈن۔ ایم الیاس اس مرتبہ مختصر کہانی کے ساتھ وقت کی قیمت کا احساس دلوا رہے تھے۔ رہنمائی اور پوجا اچھی مختصر تحریریں تھیں۔ رولو کا حسب معمول سپرہٹ رہی۔ فردوس بہت زبردست رہی۔ آسیبی گھر اور کتابی کردار نارمل درجے کی تحریریں تھیں۔ ایس امتیاز احمد کا شمار ڈر کے بہترین رائٹرز میں ہوتا ہے۔ آج ڈر کی مارکیٹ میں جو Value ہے اور قارئین میں یہ جتنا مقبول اور معیاری ہے، یہ اسٹاف کی انتھک محنت رائٹرز کی کوششوں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی کی وجہ سے ہے۔ دشمن روحیں اور اسرار بھی بہت انٹرسٹنگ ہوگئی ہیں۔ آب حیات ایک اعلیٰ درجے کا ناول تھا۔ میں بھائی احسان الحق کو مبارکباد دینا چاہوں گا کہ بہت جلد انہوں نے ڈر میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ اب اجازت۔

☆☆ قاسم صاحب: کہانی کمپوز ہو چکی ہے، اگلے ماہ ضرور جلوہ گر ہوگی، گھبرائیں نہیں آپ کی کہانیاں شائع ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں، یعنی نئی نئی کہانیاں۔

اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ شمارہ نومبر 2016ء کے ساتھ ڈر ڈائجسٹ اپنی عمر کے 18 سال 2 ماہ گزار کر آگے کی جانب خوب صورتی سے گامزن ہمیں چھوڑ کر نئے پرانے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے اسے کامیابی ملتی رہے۔ ہم خوش ہیں۔ جو ہوسکا ہم نے اس کی خاطر قدم اٹھائے اور آئندہ بھی اگر زندگی نے کچھ اور وفا کی تو ہماری ہر طرح کی کوشش جاری رہے گی۔ دل کی حالت ان بے وفا دوستوں کی طرح ساتھ نہیں دے رہی جس کی وجہ سے محفل یاراں، یعنی ڈر ڈائجسٹ کے خطوط کی محفل میں شامل نہیں ہو پاتا، کچھ دوستوں نے کہا چلو کبھی کبھی ہی سہی! لکھتے رہا کریں، آپ کا انتظار رہتا ہے! سو اس لئے اس بار حاضری کے لئے حاضر ہیں! تمام دوستوں کو سلام، کہانیاں اور ڈر ڈائجسٹ خوب رہا، خاص کر ''آب حیات'' کے ساتھ کچھ اور رہی۔

☆☆ اسحاق صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ اللہ سے دعا کریں ہم بھی آپ کے لئے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کا سننے والا ہے اور دعا مانگنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آپ کے رسالے ارسال کئے جا رہے ہیں۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! یقیناً سب خیر و عافیت سے ہوں گے اور زندگی کے مزوں سے پرلطف ہو رہے ہوں گے، سب رائٹرز اور ریڈرز، زندگی کو بااحسن طریقے سے آگے بڑھا رہے ہوں گے۔ ڈر میں کچھ لوگوں نے لکھنا بہت کم کر دیا ہے۔ جن میں عمران قریشی، شہاب شیخ، ایس حبیب خان، بلقیس خان، عثمان علی صاحب، راحیل بخاری، افشاں رمضان، انوری رمضان، مدثر عزیز،

شائستہ سحر، حمیرا کیریو اور بہت سے رائٹرز ہیں جو کہ بہت کم کم اور خال خال لکھ رہے ہیں۔ پلیز آپ سب جہاں بھی ہیں اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے۔ ایڈیٹر صاحب! میرے پیارے بھائی میری بہت سی کہانیاں آپ کے پاس ہیں۔ جو کہ آپ لگا نہیں رہے ہیں۔ پلیز مہربانی فرما کر کہانیوں کا نمبر لے آئیں۔ نئی کہانیاں بھی انشاء اللہ جلد بھجوا دیں گی۔ اور سالگرہ نمبر کے لئے کہانی لکھی تھی۔ مگر اس لئے نہیں بھجوائی کیونکہ آپ لگاتے لگاتے اچھی خاصی دیر کر دیتے ہیں۔ ڈر کا ہر سلسلہ اچھا ہے۔ قسط وار کہانیوں میں ایم اے راحت اور ایم الیاس کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ ایم الیاس کو صحت و تندرستی دے۔ آمین۔ اور ادارے سے درخواست ہے کہ ہم پر بھی نظر کرم کیجئے۔ ہم بھی آپ کی راہوں میں پڑتے ہیں۔

☆☆ عثمان صاحب: جن لوگوں نے لکھنا کم کر دیا ہے۔ ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ پلیز! غصہ تھوک دیں اور اپنے چاہنے والوں کا خیال رکھیں، بہت بہت شکریہ۔

نعیم اللہ بڈالی سے، نومبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل بھی بہترین تھا۔ کہانیوں میں مہنگی دوستی، ناگن کا انتقام، پراسرار بلی، شیطانی محل، آسیبی گھر، کتابی کردار، پوجا، فردوس، پچھتاوا، رہنمائی، وقت کی قیمت، آخری آرام گاہ، اسرار، موت کا معمہ، وہ کون تھا۔ خوابوں کے آسیر اور آب حیات بہترین کہانیاں تھیں۔ تمام کی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ میں ایک کہانی ''خوفناک سرد رات'' ارسال کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اب مزید انتظار نہیں کروائیں گے۔ یعنی کہانی انتہائی قریبی شمارہ میں شائع کر دیں گے گزشتہ چند ماہ ڈر ڈائجسٹ کے لئے نہ لکھ سکا۔ اب یک خط (تبصرہ) اور کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ میری کہانی قریبی شمارہ میں شائع کر دیں گے آپ، پہلے بھی کئی کہانیاں ارسال کی تھیں مگر کوئی بھی شائع نہ کی۔ پلیز اب اس نئی کہانی کو قریبی شمارہ میں شائع کر دیجئے گا، امید کرتا ہوں کہ آپ قریبی شمارہ میں میری کہانی شائع کر دیں گے۔

☆☆ نعیم صاحب: خط لکھنے اور نئی کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ، میرے بھائی کہانیاں لکھتے رہا کریں کیونکہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔

اویس نور بلوچ میر پور ماتھیلو سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ جیسا کہ ڈر ڈائجسٹ اکتوبر 2016 کا شمارہ 19 اکتوبر کو ملا، پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ رسالہ تاخیر سے ملنے کی وجہ سے اب تک صرف 3 ہی کہانیاں پڑھ سکا ہوں۔ وہ یہ ہیں، ''پاگل عورت'' ''ادھوری چاہت'' اور ''سوتن'' زبردست کہانیاں تھیں۔ غزلوں کا سلسلہ بھی بہت خوب رہا۔ جن احباب کے کلام بہت زیادہ پسند آئے وہ یہ ہیں۔ ''عامر زمان عامر'' ''پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی'' ''عروج ماہین طٰہٰ اور جناب ''احسان سحر'' صاحب۔ آپ تمام شعراء کرام کو میری طرف سے اتنی اچھی اچھی کاوشیں پیش کرنے پر ڈھیروں داد اور لاکھوں مبارکباد قبول ہوں۔

☆☆ اویس نور صاحب: آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے، ویسے ڈر صرف ہارر کہانیوں کے لئے لوگوں کا دلدادہ ہے۔

گلاب خان سولنگی لاہور سے، السلام علیکم! نومبر کے شمارے کا سرورق نہایت شاندار تھا۔ قرآن کی باتیں حسب معمول دل میں اترنے والی تھیں۔ خطوط کی محفل بھی جاندار تھی جبکہ تمام کی تمام کہانیاں رائٹرز کی محنت اور قابلیت کا عکس تھیں۔ شاعری بھی خوب تھی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ گلاب خان سولنگی نے اس مرتبہ اپنا مختصر سا تجزیہ پیش کیا ہے، تو آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ دراصل آج میں ڈر کے لئے چند تجاویز پیش کروں گا، تجویز اول یہ ہے کہ ڈر کے اندرونی صفحات یا پھر اندرونی تصویریں اگر رنگین ہو جائیں تو قارئین کے ذوق کا مظہر ہوگا۔ تجویز دوئم یہ ہے کہ بیشک ڈر ہر عمر کے افراد میں یکساں مقبول ہے۔ اگر اس میں وطن عزیز کے نونہالوں کے لئے یعنی بچوں کے ادب کے لئے بھی چند صفحے مخصوص کئے جائیں تو ماہانہ ڈر ایک مکمل فیملی ڈائجسٹ بن جائے گا اور بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں میں بھی ڈر کی مقبولیت اور ترقی بڑھ جائے گی۔ آخری تجویز یہ ہے کہ ڈر میں چند اسلامی صفحوں کا بھی اضافہ کیا جائے گا جس میں کسی مستند اسلامی کتاب سے لی گئی اصلاحی کہانی یا حدیث اگر شامل کی جائے تو مجھے یقین اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارے کو خوب ترقی عطا فرمائے۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارے کو خوب ترقی عطا فرمائے گا، آمین، کہانی حاضر ہے، امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ ملے گی۔ شکریہ۔

☆☆ گلاب صاحب۔ مشورہ نوٹ کر لیا گیا ہے، اب دیکھتے ہیں کہ بڑے کیا فیصلہ کرتے ہیں، کہانی شامل اشاعت ہے، اور نئی کہانی کا انتظار ہے۔

☆☆

ابدی زندگی

ساحل ابڑو-بلوچستان

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلتے ہی خونی اور انگارہ اگلتی آنکھوں والے پرندے دھما چوکڑی مچانے لگے، کان پھاڑ آوازیں دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگیں کہ پھر اچانک ایک دلدوز منظر رونما ہوا۔

ابدی زندگی کی خواہش کرنے والا یقینی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

میں بچپن ہی سے بہت نڈر اور مہم جو واقع ہوا ہوں۔ اپنی فطری، دلیری کی وجہ سے بارہا مشکلات میں گھر چکا ہوں کئی مرتبہ تو گاؤں والوں نے مجھے موت کے منہ سے بچایا۔ میری ان حرکتوں سے تمام گھر والے پریشان ہی نہیں بلکہ نالاں بھی تھے۔

میرے والد جو بہت ہی سخت گیر انسان تھے۔ اپنے چابک سے میری مرمت کرنے کے بعد مجھے کمرے میں بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا کرتے تھے تا کہ ان کی عدم موجودگی میں گھر سے باہر قدم نہ رکھوں۔ مجھے اس وقت تک کمرے میں قید رکھا جاتا جب تک آئندہ کوئی حرکت نہ کرنے کا وعدہ نہ کر لیتا۔ اس طرح چند دن تو سکون سے گزر جاتے اس کے بعد پھر کوئی نہ کوئی حرکت ایسی سرزرد ہو ہی جاتی جس کی وجہ سے میری خوب مرمت ہوتی۔ میرے برعکس میرا چھوٹا بھائی جیمز بہت ہی سنجیدہ واقع ہوا تھا۔ اسی لئے تمام گھر والے اسے چاہتے تھے آپ شاید یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ دس برس کی عمر میں ایک دن میں گاؤں کے قریب ہی گھنے جنگل میں اکیلا شکار کھیلنے چلا گیا یہ بھی نہ سوچا کہ جنگلی درندے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جبکہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح نہ تو شکار کھیلنا جانتا تھا اور نہ ہی میرے پاس کوئی ہتھیار تھا۔ شکار کی اس مہم میں میرے ساتھ میرا پالتو کتا مارش تھا۔ اگر اس دن مارش نہ ہوتا تو میرا زندہ سلامت جنگل سے واپس آنا ممکن نہ تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مارش کو بھی میں نے مہم جوئی کے دوران ہی حاصل کیا تھا۔ شکار کے اس واقعہ سے تین برس پہلے میں نے اسے دوسرے گاؤں سے چوری کرکے لایا تھا۔ جو ہمارے گاؤں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے والد کو کتوں سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے انہوں نے مارش کو گھر میں رکھنا پسند نہ کیا۔ لیکن میں اپنی ضد پر اڑ گیا اور میری خوب پٹائی ہوئی یہ تو خدا کا شکر ہے کہ چوری کی بابت علم نہیں ہوا ورنہ وہ مجھے مارش کے ساتھ ہی گھر سے نکال دیتے۔ میری ضد کو دیکھتے ہوئے آخر والدہ کو میری سفارش کرنا پڑی۔ تب کہیں جا کر والد رضامند ہوئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے چھ ماہ تک مجھ سے بات نہ کی ویسے بھی ان کی آنکھوں کا تارا میرا چھوٹا بھائی جیمز تھا۔

☆......☆......☆

اب یہ کتا جوان ہو چکا تھا جسے میں مارش کے نام سے پکارتا ہوں مارش بھی مجھے اس قدر چاہتا کہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہتا۔ شکار والے دن



www.urdusoftbooks.com

بھی مارش میرے ہمراہ تھا۔ اسی کی بدولت میں اسے گھنے اور خطرناک جنگل سے زندہ بچا۔ یہ جنگل مقامی لوگوں میں موت کی وادی کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں داخل ہونے کے بعد کسی اجنبی شخص کا صحیح سلامت زندہ واپس آجانا معجزے سے کم نہ تھا۔ اول تو باہر نکلنے کا راستہ ہی نہ ملتا اور دوسرے قدم قدم پر خوف ناک درندوں کا خطرہ موجود تھا۔ میں متواتر تین گھنٹے تک اس خطرناک جنگل میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ تھک کر ایک پتھر کی اوٹ میں ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بھیڑیئے کی دلدوز چیخ بلند ہوئی۔

اس جنگل میں بے شمار بھیڑیئے تھے جو گردونواح کے لوگوں کے لئے اکثر پریشانی کا باعث ہوتے۔ میں نے فوراً یہاں سے نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔ واپسی میں مجھے جلد ہی اپنے گم کردہ راہ کا احساس ہوگیا اب میرے لئے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ اور مصیبت تھی۔ میں اندازے کے مطابق ایک طرف کو ہولیا۔ اس طرح جب مجھے جنگل میں بھٹکتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تو لحہ بہ لحہ پریشانی بڑھتی چلی گئی دوپہر ڈھلی درختوں کے سائے بڑھنے لگے۔

دن بھی ڈھل گیا۔ اور شام کے دھندلکے پھیل گئے۔ ایسے حالات اور پرخطر ماحول میں میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی لازماً خوف زدہ ہوجاتا۔ دھیرے دھیرے رات کی تاریکی پھیلنے لگی جس سے جنگل کا ماحول اور بھی وحشت ناک اور پراسرار ہوگیا جنگلی درندے بہت ہی ڈراؤنی آوازیں نکالنے لگے۔ اور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی مجھے اور مارش کو دیکھ کر شور مچانے لگے اس پر مستزاد بدروحوں اور بھوت پریت کے خوف نے تو میرے دل ودماغ کی تمام قوتیں سلب کرلیں۔

میں نے بدروحوں کے متعلق بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ جن کا مسکن جنگل یا کھنڈر ہوا کرتے ہیں اور وہ رات کی تاریکیوں میں اپنے لئے شکار تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ایسے الٹے سیدھے خیالات نے مجھے اس قدر خوف زدہ کردیا کہ چلتے ہوئے جب میرے پاؤں تلے کوئی سوکھی ہوئی شاخ یا ٹہنی چیخ کر ٹوٹتی تو اس کی آواز ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگتا گویا پسلیوں کو توڑ کر باہر آنا چاہتا ہے یہ صورت حال میرے لئے ناقابل برداشت تھی جس کی وجہ سے ایک بار تو میں رو پڑا۔ میرے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی اور توبہ کی کہ آئندہ کبھی اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کروں گا۔

ایک تو تھکن اور خوف سے میری حالت خراب ہورہی تھی۔ پھر بھوک کی شدت سے نڈھال ہوچکا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ شکار پر چلتے وقت دوسری حماقت جو مجھ سے ہوئی وہ یہ تھی کہ میں اپنے ساتھ کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر نہ آیا تھا کہ شکار کا تازہ گوشت بھون کر کھاؤں گا نتیجہ ظاہر ہے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

اس طرح بہت دیر جنگل کی پراسرار تاریکی میں بھٹکتا پھرا۔ کبھی ایک سمت چل پڑتا تو کبھی دوسری سمت۔ میری حالت اس چوہے کی سی تھی جسے بلی کے ساتھ ایک ہی پنجرے میں بند کردیا جاتا ہے اور چوہا بلی سے بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگتا ہے لیکن پنجرے کی آہنی سلاخیں اسے ہر طرف سے روک دیتی ہیں اور آخر تھکن اور خوف سے نڈھال ہوکر بلی کے سامنے گر پڑتا ہے کہتے ہیں جب انسان ہر طرف سے مایوس ہوجاتا ہے اور مصائب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ایسے مشکل اور کٹھن وقت میں خدا بندوں کی امداد کے لئے کوئی راہ نکال دیتا ہے۔ بندے کی مشکل خود ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اور مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں میرے ساتھ بھی اس رات بالکل ایسا ہی ہوا۔

چاند نکلا اور اس کی روپہلی کرنوں نے تاریکی کا پردہ چاک کردیا۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو چند گز کے فاصلے پر ایک غار دکھائی دیا میں نے سوچا کہ رات اس غار میں گزار کر صبح پھر راستہ تلاش کروں گا میں غار میں داخل ہوگیا مارش جواب تک خاموشی سے میرے ساتھ چلا

آرہا تھا۔ غار کے منہ پر ہی رک کر بھونکنے لگا۔ میں نے اسے خاموش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ تو اندر ہی داخل ہوا اور نہ ہی خاموش۔ مارش کی غراہٹ سے مجھے بھی خطرے کا احساس ستانے لگا۔ غار میں نظر جو دوڑائی تو جلد ہی خطرہ بھی دکھائی دیا جس سے مارش خوف زدہ ہو رہا تھا۔ بھیڑیے کا بچہ۔ وہ بھی میری ہی طرح تنہا۔ بھوکا اور سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اسے دیکھ کر پہلے تو میں گھبرایا کہ کسی بھی وقت اس کی ماں غار میں آسکتی ہے۔ لیکن میرے خوف کو میری خواہش نے کچل دیا۔ بچپنے اور حماقت میں زیادہ فرق نہیں ہوا کرتا۔ جن حالات کا میں نے ذکر کیا ہے اگر کوئی بڑا آدمی ہوتا تو فوراً ہی غار سے نکل بھاگتا۔ لیکن میری خواہش بھیڑیے کے بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی تھی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے اٹھایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مارش بدستور غرا کر مجھے نادیدہ خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ لیکن میرے قدم تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ تھکن اب نام کو نہ تھی اور نہ ہی بھوک کی شدت سے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے مجھے ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ نئی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر تک بھیڑیے کا بچہ اٹھائے بھاگتا چلا گیا کتنا فاصلے طے کیا اور کتنے نشیب و فراز سے گزرا۔ اچانک درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا سامنے میرے گاؤں کی ویران اور سنسان گلیاں تھیں میں ان ویران راہوں سے ہوتا ہوا اپنے گھر کے سامنے جا پہنچا۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ سردی پورے شباب پر تھی مگر جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں کا احساس ہوا۔ سب گھر والے میری وجہ سے پریشان تھے اور اب تک جاگ رہے تھے۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میں رات کو ساڑھے تین بجے گھر پہنچا ہوں میرے لئے سب سے تعجب خیز بات میرے سخت گیر باپ کا رویہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک لفظ تک نہیں کہا بلکہ بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھایا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو مجھے پالینے کی خوشی کا مظہر تھے۔ یا میری نازیبا حرکت کی وجہ سے روحانی اور ذہنی کرب کی علامت۔ میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

بہرحال یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں اپنے کیے پر پہلی مرتبہ نادم ہوا اور مستقبل میں کوئی حرکت نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ جو میرے والد کو ناگوار گزرے۔ جس طرح بعض اوقات حادثات انسان کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح بچپن کی یہ حماقت میری زندگی کے دھاروں کا رخ تبدیل کرنے کا سبب بن گئی۔

اس کے بعد میں نے پوری توجہ تعلیم پر مبذول کردی۔ تعلیم سے فارغ ہوکر میرا ارادہ فوج میں بھرتی ہونے کا تھا۔ جو بدقسمتی سے پورا نہ ہوسکا اور مجبوراً مجھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ پولیس کی ملازمت میں میری فطری دلیری اور جرأت بہت فائدہ مند ثابت ہوئی اور چار برس کی مختصر مدت میں انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ انسپکٹر بنتے ہی میرا تبادلہ ہندوستان کردیا گیا۔ ہندوستان میں پانچ برس تک بظاہر مجھے اخباری نمائندے کا کام سپرد کیا گیا۔ حالانکہ یہاں میرا کام سیاسی تحریکوں کے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرکے حکومت کو پہنچانا تھا۔ کیونکہ ان دنوں پہلی جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ہندوستان میں تحریک آزادی زور پکڑ چکی تھی۔ ترقی پاکر قدرتی طور پر مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن آج جب میں سوچتا ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے یہ ترقی میرے لئے تباہی کا باعث ثابت ہوئی وطن سے عدم موجودگی کے سبب چھوٹا بھائی جیمز میری سرپرستی سے محروم ہوگیا وہ ان دنوں لندن ہی میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔ والدین چند برس پیشتر وفات پاچکے تھے۔ ان کی موت کے بعد ہم دونوں بھائی اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔ میرے ہندوستان آنے کے دو برس بعد جیمز تعلیم مکمل کرکے ایسے خطرناک راستے پر چل پڑا۔ جہاں سے لوٹ کر واپس نہ آسکا۔

مجھے ہندوستان آئے تقریباً پانچ برس ہوئے تھے کہ ایک دن مجھے اپنے چھوٹے بھائی جیمز کے لاپتہ

ہونے کی اطلاع ملی۔ پولیس ہر ممکن کوشش کے باوجود اسے تلاش کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اطلاع ملتے ہی میں نے لندن کی راہ لی تا کہ صحیح حالات سے آگاہ ہونے کے بعد اپنے گمشدہ بھائی کو تلاش کرسکوں لندن پہنچنے کے بعد معلوم ہوا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیمز کا کوئی دوست نہیں تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والوں سے بھی تعلقات صرف کلاس روم تک محدود تھے۔ کسی لڑکی سے بھی اس کی دوستی نہ تھی حالانکہ اس عمر کے لڑکے عموماً ہنگامہ پرور اور رومانی زندگی گزارتے ہیں اور لڑکیوں کے گرد تو پروانوں کی طرح منڈلاتے ہیں۔

جب مجھے لندن سے کوئی اہم بات معلوم نہ ہوسکی تو گاؤں کی راہ لی۔ وہاں بھی مجھے خاص کامیابی نہ ہوئی حالانکہ گاؤں کی پولیس کا انچارج میرا پرانا دوست انسپکٹر مالکم تھا۔ مالکم نے چند ایک سیدھی سادھی موٹی موٹی باتیں بتائیں کہ گمشدگی سے چند دن پہلے جیمز کو گاؤں کی ایک دکان سے پانچ پونڈ کافی، دس پونڈ شکر دو پونڈ لوہے کا تار اور مچھلی کے شکار کا ایک جال خریدتے دیکھا گیا تھا۔ ان چیزوں کو خریدنے کے چار دن بعد ولیم نامی ایک بوڑھے شخص کا گزر مکان کے قریب سے ہوا۔ اس دن شدید برف باری ہو رہی تھی۔ اور یخ بستہ طوفانی ہواؤں کی وجہ سے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بہت نیچے گرا ہوا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر کوئی شخص گھر سے نکلا بھی تو کسی اشد ضرورت کے تحت۔ ورنہ سارے گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔

ولیم کو بازار تک مجبوراً ہی جانا پڑا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی بیمار بیٹی کے لئے دوا لینی تھی۔ ولیم کی عمر ستر برس سے متجاوز ہے۔ اور گھر بھی دور جنگل کے کنارے واقع ہے اس کے گھر سے بازار تک کا قریب ترین راستہ ہمارے گھر کے قریب سے گزرتا ہے حالانکہ ہمارا مقام بھی گاؤں کی آبادی سے کافی پرے پہاڑ کے دامن میں ہے۔ ولیم جب گھر کے قریب سے گزرا تو سردی کی شدت سے اس کے ہاتھ پاؤں اور بوڑھے جسم میں درد ہونے لگا اس نے اس خیال سے دروازے پر دستک دی کہ اندر جا کر آگ تاپ کر اپنے جسم کی حرارت بحال کرسکے۔ دستک دینے کے باوجود چند منٹ تک کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا کہ کہیں جیمز باہر تو نہیں گیا ہوا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ولیم اندر چلا گیا لیکن جیمز گھر میں موجود نہیں تھا تھوڑی دیر رکنے کے بعد اس نے مکان سے نکل کر اپنی راہ لی۔ یہی حال دوسرے دن بھی ہوا سردی پورے شباب پر تھی اور ولیم کو اپنی بیٹی کی دوا لینے کے لئے گھر سے نکلنا پڑا۔ اس مرتبہ وہ بغیر دستک دیئے ہی مکان میں داخل ہو گیا۔ اور دیکھ کر سخت متعجب بلکہ پریشان ہوا کہ ہر چیز جوں کی توں رکھی ہے انگیٹھی آج بھی سرد ہے۔ میز پر کھلی کتاب پڑی ہے اور بستر پر کوئی شکن نہیں گویا جیمز رات یہاں نہیں سویا۔

ایک سمجھدار شخص کی طرح ولیم کو حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا اور وہ فوراً ہی مکان سے چل دیا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گاؤں کے لوگ جیمز سے سخت نفرت کرتے ہیں اور اس کے بارے میں لوگوں میں بڑی ہی پراسرار باتیں مشہور ہیں ولیم نے بازار پہنچ کر دوا فروش سے اس واقعہ کا ذکر کیا دوا فروش بھی بڑا جہاندیدہ شخص ہے اس نے ولیم کو مشورہ دیا کہ پولیس کو حالات سے آگاہ کردے۔

اطلاع ملتے ہی پولیس نے سب سے پہلے مکان میں جا کر دیکھا اور اس کے بعد بڑی سرگرمی سے جیمز کی تلاش شروع کردی۔ میری تمام دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی مفید بات معلوم نہ ہوسکی جب میں مالکم سے مکان کی چابیاں لے کر رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک عجیب بات یہ بتائی کہ شدید برف باری کے باوجود جیمز کسی دوسرے شخص کے قدموں کے نشان بھی نہیں دیکھنے میں آئے سوائے ولیم کے قدموں کے نشانات کے۔ انسپکٹر مالکم کے کہنے کے مطابق مکان سے کافی فاصلے تک ایک ایک انچ زمین کا بہ غور معائنہ کیا گیا۔ سب بے سود حالانکہ متواتر دس دنوں سے ہلکی ہلکی برف باری سے میلوں تک زمین پر برف کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔

انسپکٹر مالکم سے رخصت ہو کر میں مکان کی طرف چل دیا۔ چونکہ میں خود بھی پولیس کا آدمی تھا اس

لئے سوچنے لگا کہ بعض اوقات مجرم بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں اور جرم کرنے کے بعد اپنے پیچھے بظاہر کوئی ایسی علامت نہیں چھوڑ جاتے جس سے تفتیش کے دوران کوئی مدد مل سکے۔ اور مجرموں کی نشاندہی ہو یا کوئی معمولی سی بات بھی انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کا باعث ہے۔ مگر میرا تجربہ یہ تھا کہ ایسے مجرم نادانستہ طور پر جلد یا بہ دیر کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کر بیٹھتے ہیں جس سے ان کے جرم کا راز افشاء ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی حرکت جس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔

جب میں گھر پہنچا۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ اپنا مختصر سامان اندر رکھنے کے بعد ولیم سے ملنے چلا گیا سوچا ولیم سے خود مل لینا زیادہ بہتر ہے اور ہمسایوں سے بھی بات چیت کر لینا چاہئے۔ ممکن ہے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے ولیم کا گھر ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر جنگل کے کنارے واقع تھا۔ جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں وہاں تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے۔ ویسے یہ فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا یعنی دو میل ہوگا۔ اس تاخیر کی وجہ راستے میں دوسرے لوگوں سے میل ملاقات تھی چونکہ میری زندگی کا بیشتر حصہ ان لوگوں میں گزرا تھا۔ اس لئے سب ہی مجھ سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں پانچ برس وطن سے باہر گزار آیا ہوں لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ سب ہی مجھ سے رسمی طور سے ملے ملاقات میں وہ گرم جوشی نہ تھی۔ جس سے خوشی اور خلوص کا اظہار ہوتا۔ ممکن ہے اس کشیدگی کی وجہ جیمز ہی ہو اور میں جیمز کا بڑا بھائی تھا۔

ولیم سے میری ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ اس کی باتوں میں بزرگانہ خلوص اور شفقت تھی۔ لیکن اس کی بیوی لوسی کا رویہ اپنے خاوند کے برعکس انتہائی تلخ بلکہ قابل اعتراض تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران لوسی بار بار مداخلت کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا ولیم نے وہ سب باتیں دہرائیں جو میں اپنے دوست مالکم سے پہلے ہی سن چکا تھا۔ البتہ ولیم نے دبے دبے الفاظ میں کہا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے مسٹر ایبل۔ آپ کے بھائی جیمز کے پاس کالے جادو کی چند نادر کتابیں تھیں جن کے مطالعے سے یہ سب نتیجہ نکلا ہے۔" ولیم نے سوچتے ہوئے بتایا۔ ممکن ہے جیمز عملیات کے چکر میں پڑ گیا ہو یہ میرا خیال ہے۔ خدا کرے غلط ہو۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔"

میں نے ولیم کی بات کی تائید اس خیال سے کی کہ اس سے مزید کچھ معمولات حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔ کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ گاؤں کے لوگ جیمز کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور بتانا نہیں چاہتے۔

"مسٹر ایبل۔" ولیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بھی وہ کتاب دیکھی ہوگی۔"

"نہیں۔" میں نے اب تک نہیں دیکھی۔ سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔"

"یسوع مسیح آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔" ولیم نے پھر نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"ایسی کتابیں انسانوں کی تباہی کا موجب ہوا کرتی ہیں۔ آپ جب گھر جائیں تو اسے اٹھا کر نذر آتش کر دیں۔"

اس کے بعد چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میں گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ولیم بھی میرے ساتھ چند قدم تک رخصت کرنے آیا۔ رخصت کرتے وقت بوڑھے ولیم نے صلیب میری گردن میں ڈال دی اور نصیحت کی کہ اسے ہمیشہ اپنے گلے میں لٹکائے رکھوں۔ کم از کم اس وقت تک مجھے ایسا ضرور کرنا چاہئے جب تک میں اس مکان میں مقیم ہوں اس کے بعد میں رخصت ہو گیا۔

سورج ابھی غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن دھوپ اپنی تمازت کھو چکی تھی فروری کے مہینے میں ویسے بھی سردی بہت شدید ہوا کرتی ہے جس کو سرد ہوائیں ناقابل برداشت بنا دیتی ہیں حتیٰ کہ دوپہر کے وقت جب سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے تو حالت

اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔

جب میں ولیم کے گھر سے روانہ ہوا سردی کی تیز لہر میرے بدن کو چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کپکپی لگ گئی اور دانت بجنے لگے اس لئے میں نے کہیں اور جانے کی بجائے سیدھے گھر کی راہ لی۔

قدیم طرز کا یہ مکان پانچ کمروں پر مشتمل تھا تین کمرے نیچے اور دو اوپر کی منزل پر تھے۔ جس کے ساتھ ایک چھوٹا باورچی خانہ تھا میرے بچپن کی بے پناہ یادیں اس مختصر سے مکان سے وابستہ تھیں نچلی منزل کے ایک کمرے میں ہمارا بوڑھا ملازم رہا کرتا تھا دوسرا کمرہ مہمانوں کے لئے اور تیسرا بطور گودام استعمال کیا جاتا جس میں گھر کا ٹوٹا ہوا فرنیچر، کچھ پرانے صندوق اور جلانے کی لکڑی پڑی رہتی اوپر کی منزل کے دو کمروں میں سے ایک ہم دونوں بھائیوں کے تصرف میں تھا دوسرا والد اور والدہ کے لئے مخصوص تھا۔

جب میں مکان میں داخل ہوا تو نچلی منزل کے تینوں کمرے اس طرح ویران پڑے تھے جیسے برسوں سے ان کو کسی نے کھولا بھی نہ ہو۔ فرش پر مٹی کی موٹی تہہ جم چکی تھی دیواریں گرد سے اٹی ہوئی تھیں اور مکڑیوں نے جالا بن رکھا تھا۔ گویا میں اپنے مکان کے بجائے آثار قدیمہ کے کھنڈروں میں آ گیا تھا اوپر کی منزل کی حالت اس کے بالکل برعکس دکھائی دے رہی تھی کمرے کی دیواروں پر ہلکا سبز رنگ کیا ہوا تھا ہر چیز صاف ستھری اور بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ دروازے اور کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کے پردے لٹک رہے تھے پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا جس پر اجلی چادر پڑی تھی۔ مختصر یہ کہ کمرہ ہر لحاظ سے قابل تعریف تھا۔ ساتھ والا کمرہ جس میں ہم دونوں بھائی سویا کرتے تھے اس کی حالت ایسی نہ تھی۔ مگر وہ بھی ہر طرح سے صاف ستھرا تھا۔ جیمز اس کمرے کو گودام کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ نیچے سے اوپر تک شلف لگے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان شلفوں پر کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ نئی اور پرانی کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ ہر کتاب پر سیریل نمبر اور نام کی پرچی چسپاں تھی۔ تاکہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ کمرہ کے دروازے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ چند لکڑی کے بنے ہوئے پرانے صندوق اوپر تلے رکھے تھے۔ جن کا رنگ تک خراب ہو چکا تھا ان صندوق کے کے ساتھ دس پندرہ لکڑی کی پیٹیاں اوپر تلے پڑی تھیں۔ جو عموماً پیکنگ کے کام آتی ہیں ان پیٹیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ جیمز لندن سے آتے وقت ان میں کتابیں بند کر کے لایا ہوگا۔ اور اب خالی رکھی ہیں۔

ہر ایک کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میں کمرے میں آ گیا آگ جلائی اور کافی کے لئے کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ آتش دان کے قریب ہی دیوار میں لگی ہوئی الماری کو کھولا۔ تو اس میں اب تک کافی اور شکر بند پڑی تھی۔ جو میرا گمشدہ بھائی چند دن پیشتر بازار سے خرید کر لایا تھا لوہے کے تار اور مچھلی پکڑنے کا جال البتہ وہاں نہیں تھے۔

یہ دونوں چیزیں تیسرے دن گودام سے ملیں۔

کافی پینے کے بعد میں نے میز پر رکھی ہوئی کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا خدا جانے یہ کسی زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ کتاب کے صفحات اور جلد چمڑے کی تھی اور تحریر ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ جس کی بنا پر میں نے کتاب کی قدامت کا اندازہ لگایا کہ یہ چھاپ خانے کی ایجاد سے پہلے زمانے کی ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر جیمز کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ دیکھ کر پتہ چلا کہ یہ کتاب، بہت قدیم زمانے کی ہے۔ اسی نوٹ میں ایک دوسری کتاب کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔

میں نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور سونے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا لیٹتے ہی نیند آ گئی، مجھے سوئے ابھی تین چار گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ بے پناہ شور وغل سے آنکھ کھل گئی سرہانے رکھے ہوئے میز پر ٹیبل لیمپ کو روشن کیا۔ باہر پرندوں کی آواز بہت تیز ہو چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔ چاندنی رات تھی اور ہر طرف سیاہ رنگ کے پرندے موجود تھے۔ رنگ گہرا سیاہ بالکل کوؤں جیسا مگر جسامت کے اعتبار سے وہ گدھ کے برابر تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ بڑی ہی ہیبت

ناک آواز میں شور مچانے لگتے۔ پہلے ان میں سے ایک آواز نکالتا اور اس کے بعد سب اپنی اپنی چونچیں کھول کر آسمان کی طرف گردن اٹھاتے اور زور زور سے چیخنے لگتے۔ مکان کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے پرندوں کی خوف ناک آوازن سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اور چھت پر بیٹھے ہوئے پرندے جب اپنی مکروہ آواز نکالتے تو اس کی گونج نچلی منزل سے ٹکرا کر عجیب بھیانک صورت اختیار کرلیتی۔ ڈر تھا اگر میں مکان سے باہر نکلا تو ممکن ہے۔ یہ ظالم گدھ نما پرندے مجھ پر حملہ آور ہوجائیں اور اپنی لمبی چونچوں سے مجھے نوچ کھائیں۔

شور ہر لحہ بڑھتا گیا اور میری پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر مجبور ہوکر میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور بستر میں گھس کر کمبل بھی منہ پر اوڑھ لیا اور لیٹ گیا۔ نیند تو خیر کیا آنا تھی۔ قدرے اطمینان ہوگیا رات بھر کروٹیں بدلتا رہا حتیٰ کہ شور بتدریج کم ہوتا گیا اور باہر سے پرندے کی اڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ سب اڑ گئے۔

صبح ہوئی اور کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس آفت سے نجات ملی ہے۔ رات بھر جاگنے سے میرا سر بوجھل ہورہا تھا۔ سکون ملتے ہی آنکھ لگ گئی اور میں گیارہ بجے دن تک بے خبر سوتا رہا۔ ناشتہ کیا اور لباس تبدیل کرکے باہر نکلا تاکہ ہمسایوں سے ملاقات کرکے معلومات حاصل کروں۔ لیکن آج سب کا رویہ کل کی نسبت بہت ہی مختلف تھا۔ کوئی شخص مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتا۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر میں گھر چلا آیا۔ اور میز پر رکھی ہوئی کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر مجھے دوسری کتاب کا خیال آیا جس کا حوالہ جیمز نے اپنے نوٹ میں دیا تھا۔ میں نے گودام میں جاکر دیکھا۔ جلد ہی مطلوب کتاب مل گئی۔ یہ کتاب بھی کافی پرانی تھی۔ کاغذ کا رنگ بگڑ کر گہرا زرد ہوچکا تھا۔ اور اس قدر بھربھرا کہ ہاتھ لگتے ہی ٹوٹ جاتا۔

یہ کتاب بھی میرے لئے بہت عجیب تھی اور اس کی زبان تو میرے لئے لاطینی ثابت ہوئی۔ البتہ اس میں دو کاغذ میرے بھائی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے ان دو کاغذوں کو لے کر میں کمرے میں آگیا اور بیٹھ کر اطمینان سے پڑھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ میز پر رکھی ہوئی متبرک کتاب ایک ہزار سال پرانی ہے۔ اور اس وقت صرف تین جلدیں ساری دنیا میں موجود ہیں کتاب کا نام ۔''ابدی زندگی'' ہے اور اس کا مصنف ایک سادھو گزرا ہے۔ جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ سادھو اپنی طبعی موت مرنے کے بعد زندہ ہوگیا ہے۔ اور لامحدود وقت تک زندہ رہے گا۔ اس سادھو کے تین نائب اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ جن کے پاس اس کے کتاب کی ایک ایک جلد موجود ہے۔ نیز کتاب کے صفحات اور جلد انسانی کھال کے ہیں۔ اس سادھو کے پیروکار ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جوان تین نائبوں کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ اور حالات کے مطابق روپ دھار لیتے ہیں جیمز کی تحریر پڑھنے کے بعد مجھے اتنا شدید صدمہ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے کتاب میز سے اٹھا کر زمین پر دے ماری۔ اور دونوں کاغذ نذر آتش کردیئے۔ مجھے نہ تو شیطانی پراسرار قوتوں پر یقین تھا اور نہ ہی بدروحوں پر۔ گو بعد کے واقعات نے میرے نظریات کو غلط ثابت کردیا بہر حال میں نے رات کو آ کر مکان کا گھیراؤ کرنے والی بدروحوں سے نبرد آزما ہونے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بازار سے ایک بندوق اور گولیوں کے چار ڈبے خریدے اور اپنے ریوالور میں بھی گولیاں بھر کر جیب میں رکھ لیا۔ اور ان کے کالے پرندوں یا بدروحوں کا انتظار کرنے لگا۔ سورج غروب ہوگیا رات نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میری طبیعت بے چین ہونے لگی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں کبھی میز کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتا۔ اور کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کئی مرتبہ کھڑکی پر لٹکتے ہوئے پردے کو سرکا کر باہر دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔

رات کے دس بج گئے چاند نے دور پہاڑوں کی اوٹ سے اپنا زرد چہرہ نکالا تاریکی کم ہوگئی گاؤں کے کچے مکانوں کے سائے پھیلے چاند بلند ہوتا گیا اور مکانوں کے

سائے سمٹتے چلے گئے آدھی رات گزر گئی ہر طرف خاموشی اور پر ہول سکوت تھا جیسے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ حالات کا غلط اندازہ لگا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ پلنگ پر دراز ہو کر ڈبیہ سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا شام سے اب تک تین پیکٹ سے زیادہ سگریٹ پی چکا تھا۔ حالانکہ عام حالات میں چوبیس گھنٹوں میں ایک پیکٹ سے زیادہ سگریٹ نہیں پیا کرتا۔ لیکن گزشتہ رات کے بھیانک واقعہ نے میرے دماغی سکون کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے اعصاب پر وحشت سی طاری ہو چکی تھی۔ اس لئے گھر آتے وقت بازار سے میں دس پیکٹ سگریٹ لیتا آیا تھا۔

ابھی تک میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے آدھا سگریٹ ہی پیا ہوگا کہ باہر سے وہی مکروہ چیخ بلند ہوئی اور اس کے بعد بے شمار پرندوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا لاتعداد سیاہ پرندے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ابھی جنگل کی طرف سے ان کے جھنڈ کے جھنڈ آ رہے تھے۔ چند ہی منٹ میں مکان کا محاصرہ ہو چکا تھا حتیٰ کہ چھت بھی اس وقت ناگہانی سے محفوظ نہ رہی۔ پھر وہی پرہول شور اور خوفناک آوازیں کچھ دیر تک تو میں ان کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے کھڑکی کو کھول کر دو تین ہوائی فائر کئے۔ ایک لمحہ کے لئے آوازیں بند ہو گئیں انہوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں گھما کر اردگرد دیکھا اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھائے مکروہ آوازیں نکالنے لگے ان کو پرسکون دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے سب کو گولیوں کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے باہر دیکھا ایک کوا کا جو کھڑکی کے بالکل سامنے بیٹھا اپنی گول گول بھیانک آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا وہ جسامت اور قد و قامت میں اپنے تمام ساتھیوں سے بڑا تھا۔ سب سے پہلے وہی اپنی مکروہ چونچ کھول کر بھیانک آواز نکالتا اور اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے بھی بعد میں شور مچاتے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی ان سب کا لیڈر ہے۔ اگر اسے مار دیا جائے تو یقیناً باقی سب ڈر کے مارے اڑ جائیں گے وہ بدستور مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی لمبی چونچ اور گردن سب سے لمبی تھی اس لئے اسے نشانہ بنانا بھی آسان تھا۔ میں نے گولی چلا دی جو اس کی گردن کو توڑتی ہوئی پار نکل گئی ایک دلدوز انسانی چیخ بلند ہوئی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کالی بلائیں اب تک اپنی جگہ موجود تھیں اور اب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بلند آواز میں شور مچا رہی تھیں پھر اچانک خاموش ہو گئیں میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کا لیڈر اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ لیکن اس کی جگہ خالی تھی یہ میں نے محسوس کیا کسی نے بھی آگے بڑھ کر خالی جگہ کو پُر نہیں کیا۔

پھر ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ مگر کہاں سے؟

مجھے یوں لگا جیسے مکان کے اندر سے آئی ہو۔ اس آواز کے بعد باہر بیٹھے ہوئے کالے پرندے نے پھر شور مچانا شروع کر دیا پھر وہی ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس مرتبہ ان کے آوازوں میں نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی جیسے سب مل کر رو رہے ہوں۔ بین کر رہے ہوں میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سنا گودام سے ہلکی ہلکی کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہاں کون ہو سکتا ہے کیا کوئی شخص پرندوں کے ڈر سے وہاں آ چھپا ہے یا ان کالی بلاؤں نے کسی راہ گزر کو زخمی کر دیا ہے اور وہ یہاں پناہ لینے آیا ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پھر ایک مکروہ آواز گودام سے آئی جس کی تائید میں باہر بیٹھے ہوئے پرندوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ تھوڑے تھوڑے سے گودام سے آوازیں بلند ہوتیں اور درد کے ہلکے ہلکے کراہنے کی آواز بھی آتی۔ کبھی کبھی دلدوز انسانی چیخیں بھی ابھرتی تھیں مجھے دماغ پر ہتھوڑے سے برستے محسوس ہونے لگے۔ اعصاب جواب دے گئے۔ حتیٰ کہ اس ناقابل برداشت روحانی اور ذہنی کرب سے میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔ جب ہوش آیا تو دن کے دو بجے تھے، گرنے سے میرے سر میں سخت چوٹ آئی تھی درد کی شدت سے سر پھٹا جا رہا تھا گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے سب سے پہلے مجھے دروازے کا خیال آیا دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی دیکھ کر اطمینان ہوا۔ میں بے حد خوف زدہ تھا۔

کمرے کا جائزہ لیا ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کوئی خلاف معمول بات دکھائی نہ دی۔ میں نے ناشتہ کیا اور لباس تبدیل کر کے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ سخت پریشان تھا کہ اس مصیبت سے کیونکر نجات پائی جا سکتی ہے۔

سوچتے سوچتے خیال آیا کہ جیمز کی جمع کی ہوئی کتابوں میں اس کا حل یقیناً موجود ہوگا۔ مجھے وہ کتاب "ابدی زندگی" یاد آ گئی جسے میں نے گزشتہ رات غصے میں آ کر زمین پر دے پٹخا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی کتاب وہاں نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پلنگ پر لیٹنے سے قبل میں نے کتاب کو اٹھا کر دوبارہ میز پر رکھا تھا۔ اب وہ کہیں بھی نہ تھی کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر بے سود۔ کتاب ہوتی تو ملتی۔ پھر مجھے اپنی جیب میں رکھے ہوئے پستول کا خیال آیا فوراً کوٹ کی جیب دیکھی پستول موجود تھا۔ اور گولیاں بھی ویسے ہی بھری ہوئی تھیں بندوق بھی کھڑکی کے پاس ہی پڑی دکھائی دی۔

اب مجھے گودام میں کراہنے والے شخص کا خیال آیا۔

گودام میں داخل ہوتے وقت میری کیفیت اس بزدل شخص سے مختلف نہیں تھی جو اپنے سائے سے بھی خوف کھانے لگتا ہے قدم اٹھاتے ہوئے میری ٹانگیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ جیسے ابھی سینے کو توڑتا ہوا اچھل کر باہر آ گرے گا۔

گودام خالی تھا۔ دھڑکتے دل سے صندوقوں کے پیچھے دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ قدرے اطمینان ہوا۔ آگے بڑھا تو دیوار کے وسط میں کھڑکی کے سامنے کرسی پڑی ہوئی دکھائی دی۔ کرسی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ کمرے میں کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو نظر نہ آتی تاوقتیکہ وہ صندوقوں کے پیچھے آ کر نہ دیکھے۔ جب میں کرسی کے قریب آیا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اس پر میرے بھائی جیمز کے کپڑے اس طرح ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے جیسے وہ یہاں بیٹھا ہوا اور بیٹھے ہی بیٹھے ایک دم اس کا جسم ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ قمیض پر کالر کے پاس خون کا گہرا دھبہ تھا۔

میرے لئے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ باوجود کھڑکی کے بند ہونے اور انتہائی سردی کے میرا جسم پسینے میں نہا گیا۔ یہ سب کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے میرے حواس معطل ہو گئے میں لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے پلٹا اور شلفوں میں لگی ہوئی کتاب کو دیکھنے لگا۔ گمشدہ کتاب "ابدی زندگی" اپنے سریل نمبر پر رکھی ہوئی تھی کتاب کو وہاں دیکھ کر مجھے اپنی یادداشت پر بھی شک ہونے لگا۔ کہیں میں خود ہی تو کتاب کو یہاں رکھ کر بھول گیا ہوں میں نے بہت سوچا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

میں کتاب کو وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لایا اور میز کی دراز میں رکھ کر تالہ لگا دیا۔ تا کہ میری عدم موجودگی میں بھی کوئی شخص تالہ توڑے بغیر نہ لے جا سکے۔

☆......☆......☆

یہ سارے واقعات میرا ذہنی توازن بگاڑنے کے لئے کافی تھے۔ مگر میں نے بھی پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کرنے اور ان کالی بلاؤں کو فنا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ رات کے واقعات نے میرے تمام نظریات متزلزل کر دیئے تھے اور اب مجھے شیطانی قوتوں پر یقین آنے لگا تھا۔ یقیناً ان بدروحوں نے میرے بھائی جیمز پر قابو پا لیا تھا۔ اور مجھے اپنے بھائی کو ان سے نجات دلانا ہے، چاہے مجھے اپنی جان ہی سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں ان بدروحوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور بندوق یا چھوٹے پستول سے انہیں ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ڈائنا مائٹ بچھا کر انہیں جہنم واصل کیا جائے اور اگر کسی نے مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو اسے میں گولیوں کا نشانہ بنا دوں گا۔

اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بارود، بجلی کے تار اور بیٹری خریدنے کے لئے بازار گیا۔ لیکن افسوس گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر یہ چیزیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ میرے لئے ان چیزوں کو لندن سے خرید کر لانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لندن تو زیادہ دور نہیں تھا مگر وہاں تک جا کر مطلوبہ اشیاء خرید کر واپس گاؤں پہنچنے کے لئے کم از کم چار گھنٹے درکار تھے گویا میں رات کے نو بجے سے پہلے واپس نہیں آ سکتا تھا۔

سورج غروب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنی اسکیم ناکام ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ظاہر ہے رات کے نو بجے کے بعد مکان کے چاروں طرف ڈائنا مائٹ بچھانا کسی بھی صورت میں ممکن نہ تھا۔ اس لئے یہ کام کرنے کے لئے دوسرے دن کا انتظار کرنا پڑتا مختصر یہ کہ میں ہر طرح سے مجبور تھا۔

لندن سے جب میں واپس گاؤں پہنچا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ آدھے گھنٹے کی مزید تاخیر نے میری پریشانی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے انجانہ سا خوف محسوس ہو رہا تھا جس کو رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی نے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے کمرے میں جا کر ڈر کے مارے دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا۔ ایک دو مرتبہ تو گاؤں میں کتوں کی آواز سن کر ہی میرے پسینے چھوٹ گئے حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اضطراب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ میں بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے گھڑی کو سوئیاں بہت ہی آہستہ رینگ رہی ہیں رات طویل تر ہو چکی ہے۔ چاند نکلا ہتاریکی چھٹنے لگی پر ہول خاموشی کو اڑتے ہوئے پرندوں نے توڑا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا ہر طرف کالی بلائیں دکھائی دیں۔ سب کی نظریں مکان پر لگی ہوئی تھیں گویا مکان پر حملہ کرنے کے لئے مستعد ہوں اور محض اپنے سردار کے حکم کا انہیں انتظار ہے۔ ان خبیث روحوں کا سردار کون ہے۔ میں نے غور سے دیکھا یہ سب ایک سی تھیں ان کے بیچوں بیچ ایک جگہ خالی تھی۔ کھڑکی کے بالکل سامنے والی جگہ جہاں میں نے گزشتہ رات سب سے بڑی جسامت والی بلا کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ سب اپنے لیڈر کے منتظر ہیں۔ ان کی خاموشی نے میرے خیال کی تائید کر دی۔ اطمینان ہوا کہ رات سکون سے گزرنے لگی اور کل رات ان سب کو ڈائنا مائٹ سے بھون کر رکھ دوں گا۔ ایک گھنٹہ بڑے سکون سے گزرا۔ چاند آسمان پر پوری طرح بلند ہو چکا تھا اتنے میں ایک فلک شگاف چیخ گونجی۔ کسی انسان کی دلدوز چیخ پھر دوسری چیخ بلند ہوئی۔

کوئی شخص یقیناً گودام میں موجود تھا۔ چیخ وہیں سے سنائی دی تھی۔ میرے اوسان خطا ہو گئے اس وقت گودام میں کون ہو سکتا ہے کہیں کسی راہ گزر پر ان کالی بلاؤں نے حملہ کر کے اسے زخمی تو نہیں کر دیا اور اس بے چارے نے جان بچانے کے لئے مکان میں پناہ لی ہو، مگر وہ گودام میں کس راستے سے داخل ہوا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر بیٹھی ہوئی بلاؤں نے بھیانک اور دردناک آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ آج ان آوازوں میں سوز و کرب کی سی کیفیت تھی۔ جیسے وہ رو رہی ہوں۔ ماتم کناں ہوں۔ آہ و بکا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مجھے کھڑکی سے باہر جھانکتے دیکھ کر ان کے شور و غل میں اضافہ ہو گیا تھا۔

دو پرندے مجھ پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹے مگر پھر کھڑکی کے قریب پہنچ کر چیختے ہوئے واپس پلٹے۔ میں حیران تھا کہ آخر انہیں مجھ پر حملہ کرنے میں کون سی چیز حائل ہے۔ میں نے فوراً ہی کھڑکی بند کر دی اور خدا کا شکر ادا کیا کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخوں کی وجہ سے میری جان بچ گئی ہے اس وقت مجھ میں کھڑا رہنے کی بھی سکت نہ رہی۔ میں قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے وقت میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ میری حالت مردوں کی سی تھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں میرے دل کی دھڑکنیں غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی تھیں اور تازہ انسانی چیخ سن کر میں غیر ارادی طور پر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ کرسی اوندھی ہو کر فرش پر گری۔

گودام میں چھپے ہوئے شخص کی مدد کرنی چاہئے۔ یہ میرا اخلاقی فرض ہے جبکہ میرے پاس پستول اور بندوق دونوں چیزیں موجود ہیں۔ میں نے سوچا اور دائیں ہاتھ میں پستول اور بائیں ہاتھ میں چھوٹی ٹارچ لے کر کمرے سے نکلا۔ گودام میں مکمل تاریکی تھی

اور پراسرار خاموشی سے میرا دل دہل گیا تھوڑی دیر تک دروازے ہی میں کھڑا چاروں طرف گھورتا رہا۔ میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوگئیں مگر وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ نہ کوئی آہٹ اور نہ کوئی کپڑوں کی سرسراہٹ ۔میں نے جیبی ٹارچ کو روشن کرکے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوکر پیٹیوں کی طرف بڑھا تاکہ بعد میں پریشانی کا امکان ہی نہ رہے۔ ابھی میں پیٹیوں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کھڑکی کھلنے کی دھیمی سی چرچراہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی شخص بڑی احتیاط سے کھڑکی کو کھول رہا ہے۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گشت کرنے لگے۔ اور میں جلدی سے آگے بڑھا تاکہ کھڑکی کے راستے سے جو شخص بھی باہر نکلنا چاہتا ہے اسے پکڑلوں۔

پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے تہیہ کرلیا کہ صورت حال کا مقابلہ کروں گا۔ چھ کی چھ گولیاں چلا دوں گا چاہے کوئی مرے یا زندہ رہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔ مگر آپ یقین جانیے کہ میں ایک گولی بھی نہ چلا سکا گولی کس پر چلاتا۔

میرے سامنے میرا چھوٹا بھائی جمیز کھڑا تھا۔ میرا بھائی جسے میں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اس کی خاطر میں اپنی جان کی بازی لگائے ان منحوس کالی بلاؤں کی ہولناک آوازیں گزشتہ دو راتوں سے سن رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا۔

”جمیز۔“

وہ کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے رکا۔ پلٹا اور پھر میری جانب لپکا اس کے ہاتھ میرے گلے کی طرف بڑھے آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور چہرے سے نفرت کا بے پناہ اظہار ہو رہا تھا۔ میں ڈر کے ایک قدم پیچھے کو ہٹا۔ وہ آگے بڑھتا گیا لیکن میرے قریب پہنچتے ہی ایک فلک شگاف چیخ مارتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی سے باہر کود گیا......

کاش میں جمیز کو نہ دیکھتا۔

وہ منظر آج بھی یاد کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اس کی تھوڑی سے نیچے گردن میں گہرا سوراخ تھا اور شہ رگ میں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا جس کی وجہ سے سر ایک طرف لٹک رہا تھا۔

خوف کے مارے آواز میرے حلق میں اٹک کررہ گئی میں بھاگ کر گودام سے نکلا اور کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے مقفل کرلیا میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور میں یوں ہانپ رہا تھا۔ جیسے کئی میل کی دوڑ لگائی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اوسان بحال ہوئے۔ لیکن میں اب تک ایک بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب دو پرندے مجھ پر حملہ کے لئے جھپٹے تھے تو چیختے ہوئے واپس کیوں پلٹ گئے تھے اب جیمز نے بھی ایسا ہی کیا تھا وہ مجھے ہلاک کرنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ مگر چیختا ہوا بھاگ کیوں گیا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا۔ ان بدروحوں کو صلیب سے ڈر لگتا ہے اور اسی لئے وہ اب تک مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیں ورنہ وہ کبھی بھی مجھے اس مکان میں زندہ نہ چھوڑتیں۔

اس خیال سے میری ہمت بندھی کہ بوڑھے ولیم کی دی ہوئی صلیب مجھے ان آفات سے بچائے ہوئے ہے اور کوئی بھی شیطانی قوت میرا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا یہ بلائیں اب تک شور ہی مچا رہی تھیں ان کی ہیبت ناک آوازوں میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی اور اب ان میں کرب کا نہیں بلکہ شدید غصے اور نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ جس جگہ پر ان کا لیڈر راب بیٹھا ہوا تھا۔ وہی بلند قامت جسے گزشتہ شب میں نے گولی سے زخمی کردیا تھا۔ اس کی گردن میں اب تک گہرا نشان موجود تھا۔ جو اس کی بڑی سی مکروہ چونچ کے عین نیچے گولی کے لگنے سے ہوگیا تھا اس کی گردن بھی ایک طرف لٹک رہی تھی۔

میرے لئے یہ منظر انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ میں نے گولی سے اپنے بھائی کو شدید زخمی کردیا تھا۔

جیمز ہی ان بدروحوں کا سردار تھا۔

دل کو ہلادینے والی آوازیں بدستور جاری

تھیں۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہا اور میں ایک پل کے لئے بھی نہ سوسکا۔ اب مجھے اس مکان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ یہ مکان اب بدروحوں کا مسکن تھا۔ اسی لئے گاؤں کے لوگ جیمز سے خوف زدہ اور متنفر تھے۔ ان کی نفرت جائز تھی مگر اس کا حل کیا ہے۔

میں سوچنے لگا۔ مجھے سب سے پہلے اس کتاب "ابدی زندگی" کو جلا دینا چاہئے۔ یہی سارے ہنگامے کا سبب ہے۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور میز کی دراز کھولی۔ وہ خالی تھی کتاب ایک بار پھر غائب ہو چکی تھی۔ ایسے حالات میں میرے لئے گودام میں جاکر کتاب تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس لئے صبح تک کمرے میں بند رہنا ہی بہتر سمجھا۔ یہی کمرہ میری بہترین پناہ گاہ تھی وقت کی رفتار بے حد سست تھی۔ کمرے کی پرہول تاریکی میں بھیانک آوازیں میرے لئے عذاب بن گئیں۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور ان بدروحوں سے نجات ملی۔

صبح تڑکے ہی میں نے مکان کے چاروں طرف دس دس گز تک ڈائنا مائٹ کا گھنا جال بچھا دیا۔ اور تاروں کا کنکشن بیٹری سے ملا کر پہاڑ تک لے گیا۔ جہاں ایک بڑے پتھر کے پیچھے چار پانچ آدمیوں کے چھپ کر محفوظ بیٹھنے کی جگہ تھی سورج نکلنے سے پیشتر ہی سب کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا پولیس اسٹیشن اپنے دوست انسپکٹر مالکم سے ملنے گیا اسے تمام حالات اور واقعات سے آگاہ کیا اس نے پوری بات سن کر میرے خیال کی تائید کی اور تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ وہ پہلے ہی اس مکان کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن میری اجازت کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس اسٹیشن سے ہم دونوں مکان کی طرف چل دیئے کیونکہ دوبارہ اس منحوس مکان میں تنہا جاتے ہوئے میں ڈر رہا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر سارے مکان کی تلاشی لی لیکن کوئی ایسی علامت ظاہر نہیں ہوئی جس سے پتہ چلتا کہ یہ مکان بدروحوں کا مسکن ہے میں نے لکڑی کے چار صندوق اور اپنا سامان باہر نکال لیا تاکہ والدین کی آخری نشانیاں اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی سارا سامان اور کتابیں وغیرہ وہیں رہنے دیں۔ جن کا تعلق کسی بھی طرح جیمز سے تھا۔ سامان کو پولیس اسٹیشن پہنچایا اور اطمینان کا سانس لیا۔

یہ سارا کام ہم نے اس قدر خاموشی سے کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اتنی رازداری اس لئے ضروری تھی کہ پہلے ہی گاؤں کے لوگوں میں بہت افوائیں پھیلی ہوئی تھیں اب نہ جانے وہ کیا سمجھیں کام سے فارغ ہو کر رات کے دس بجے تک کا سارا وقت میں نے انسپکٹر مالکم کے ساتھ ہی گزر گیا۔

جونہی رات کی تاریکی میں گاؤں ڈوب گیا ہم دونوں مکان کے پچھواڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے پولیس اسٹیشن سے چلتے وقت مالکم نے بھی میرے کہنے پر ایک صلیب اپنے گلے میں لٹکالی تاکہ حالات قابو سے باہر ہونے کی صورت میں جان تو بچی رہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اسٹین گن بھی مالکم اپنے ساتھ لیتا آیا اس طرح ہم دونوں نے اپنے طور پر بچاؤ کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرلیں۔ ہم دونوں چپ سادھے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ سردی بڑھتی جارہی تھی اور یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں اور اس سے ہم کانپنے لگے تھے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے میں نے اپنے ساتھ ایک کمبل لے لیا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ کالی بلائیں اپنی منحوس شکلوں کے ساتھ اس وقت آتی ہیں جب چاند نکل آتا ہے چاند کے نکلنے میں میرے اندازے کے مطابق ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے یعنی ایک بجے کے قریب چاند نکلنا تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا میری بے چینی بڑھتی گئی لیکن مالکم کے سامنے میں اپنی بے چینی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا یہی کیفیت مالکم کی بھی تھی۔

وقت گزرتا رہا چاند نکلا تاریکی کی ہیبت ذرا کم ہوئی اور اس کے بعد جنگل کی سمت سے مہیب پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ نمودار ہوئے اور حسب معمول

سارے مکان کا محاصرہ کرلیا مالکم کے لئے یہ سب بالکل نیا بلکہ انوکھا تجربہ تھا وہ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ کر حیران ہورہا تھا میرے لئے یہ نئی بات نہیں تھی میں تو گزشتہ تین راتوں سے ان منحوس مکروہ اورخوف ناک بدروحوں کو دیکھ رہا تھا پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا پہلے مکان کے اندر سے بڑی ہولناک انسانی چیخ بلند ہوئی یہ جمیز کی آواز تھی جسے سن کر مالکم بھی کانپ گیا اوراسٹین گن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی ہرطرف شور سنائی دینے لگا وہی ہولناک اورمکروہ آوازیں دماغ پر ہتھوڑے سے برستے ہوئے محسوس ہوئیں، ان حالات میں مالکم کا ڈرنا اورخوف زدہ ہونا یقینی تھا حقیقت یہ ہے کہ میرے بھی اوسان خطا ہوگئے حالانکہ اس سے پیشتر بھی میں جیمز کی بہت سی دل دہلا دینے والی چیخیں سن چکا تھا۔

مالکم سے زیادہ دیر تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا مشکل ہوگیا اس نے اندھادھند اسٹین گن سے کالی بدروحوں پرآگ برسانی شروع کردی لیکن ان پرکوئی اثر نہ ہوا مالکم دیکھ کرگھبرا گیا اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اور مجھے بھی اپنی ہمت جواب دیتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے مالکم سے کہا کہ وہ اسٹین گن سنبھالے یہیں بیٹھا رہے اوراگر حالات خطرناک ہوں تو بے دریغ گولیاں چلائے یا پھر موقع محل کے مطابق اپنی جان بچانے کی خاطر یہاں سے بھاگ جائے اس نے مجھے مکان کے قریب جانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی ہربات ان سنی کردی اور بھاگتا ہوا مکان کی طرف بڑھا جونہی میں کالی بلاؤں کے قریب پہنچا وہ وہ گھبرا کر ایک طرف ہٹ جاتیں لیکن میں ان کے درمیان پھنس کر اپنی موت کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا اس لئے صلیب کو گلے سے اتار کر دور ہی سے مکان کی چھت پر پھینکا اوراندھادھند بھاگتا ہوا واپس مالکم کے پاس آگیا یہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد میری حالت قابل دید تھی گھبراہٹ خوف اور جوش کی وجہ سے سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

صلیب کو چھت پر پھینکنے کے بعد بھاگتے ہوئے بہت سے پرندوں نے میرا تعاقب کیا لیکن میرا کچھ نہ بگاڑ سکے اب تو اس قدر ہنگامہ برپا ہوا کہ خدا کی پناہ اتنے میں ہماری نظر پولیس کے سپاہیوں پر پڑی جو گولیوں کی آوازسن کر بھاگے چلے آرہے تھے سپاہیوں کو مکان کی طرف آتا دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا کہیں یہ شیطانی قوتیں ان بے چاروں پر نہ ٹوٹ پڑیں میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بیٹری کا ہینڈل پوری قوت سے دبا دیا، دھماکہ ہوا ایک دو اور پھر کئی دھماکے لگاتار ہونے لگے، زمین یوں لرز رہی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو، پوری عمارت کے پرخچے اڑ گئے مکان کی طرف سے کالے پرندوں کی بھیانک آوازیں ختم ہوچکی تھیں سپاہی سڑک کے کنارے ہی لیٹ کر یہ بھیانک منظر دیکھ رہے تھے گاؤں کے لوگ بھی گھروں سے باہر نکل آئے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے یہ سلسلہ تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہا اور پھر ہرطرف گھمبیر خاموشی طاری ہوگئی میں اور مالکم جائے پناہ سے نکل کر سپاہیوں کے پاس پہنچے۔ گاؤں کے لوگ ہماری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے اس کے بعد ہم نے مکان کے اردگرد کی زمین کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا لیکن وہاں نہ تو ہمیں کسی پرندے کی لاش ملی اور نہ ہی کوئی ایسی علامت دکھائی دی جس سے ان کا وجود ظاہر ہوتا۔

دوسرے دن جب میں لندن روانہ ہونے لگا تو گاؤں کے سارے لوگ مجھے الوداع کہنے مالکم کے گھر آئے جہاں میں نے ایک رات اور ایک دن قیام کیا تھا سب خوش تھے لیکن میری آنکھیں آنسوؤں سے ترتھیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس پر شاید آپ کو یقین نہ آئے میں اپنی اس آپ بیتی کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس شخص کو میری بات پر یقین نہیں وہ لندن پولیس ہیڈ کوارٹر جاکر اس اندوہناک واقعہ کے متعلق معلوم کرسکتا ہے۔



رات کی کہانی

فلک زاہد-لاہور

چاند کی روپہلی چاندنی سمندر کنارے عجیب سماں پیدا کررہی تھی کہ اتنے میں سطح سمندر پر ایک خوبرو دلکش اور دلفریب دوشیزہ نمودار ہوئی اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور پھر……

ایک عجیب وغریب……دلفریب فرحت بخش ناقابل یقین حقیقت پرمبنی کہانی

میری عمر پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی جب میں اور میری فیملی اپنی زیادہ تر موسم سرما کی چھٹیاں سمندر کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کاٹیج میں گزارا کرتے تھے۔ مغربی ویلز میرے اور میرے بڑے بھائی کے لئے دوسرے گھر جیسا تھا۔ وہاں کی آب وہوا میں کچھ الگ ہی اپنا پن اور جادو سا تھا۔ جب سمندر کی لہریں خاموشی سے ساحل کنارے سے ٹکراتیں تو پانی کے شور کی آواز مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے سنائی دیتی ہر رات میں خالی الذہن آنکھیں کھولے آرام سے اپنے بستر پر لیٹ جاتی اور سمندر کی لہروں کی پرسکون آوازیں سنتی رہتی جو مجھ پر ماں کی سنائی ہوئی لوری کے جیسا کام کرتی اور میں سمندر کی لہروں کے ساتھ نیند کی وادیوں میں کہیں گم ہوجاتی۔

ہم دونوں بہن بھائی اپنا زیادہ تر وقت سمندر

کنارے ساحل کی ریت پر کھیلتے ہوئے گزارتے جو کافی وسیع رقبے تک پھیلا ہوتا تھا سمندر کے شفاف پانی کے اوپر ڈوبتے سورج کا وہ دلفریب منظر اس قدر سحر زدہ ہوتا تھا کہ میں کافی دیر اس کے سحر میں جکڑی رہتی تھی ان لمحات میں میرے دل میں شدید خواہش جاگتی تھی کہ کاش میں کبھی کسی جل پری سے مل سکوں یا پھر کسی پانی کے گھوڑے کو ہی کف دریا پر تیرتے ہوئے دیکھ سکوں۔

جب میں اپنی ان خواہشات کا ذکر اپنے بھائی سے کرتی تو وہ ہنس کر میرے خیالات کو خیالی قرار دے دیتا اور میں اس کے ایسا کہنے پر چپ سادھ کر رہ جاتی۔

وہ دن بھی باقی دنوں کی طرح ایک عام سا دن تھا میں اور میرا بھائی سمندر کے کنارے ریت پر کھیل رہے تھے جب ہی میں پانی پر کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گئی۔ بہ مشکل سمجھنے کے بعد جب میں نے اس جانب دیکھا جہاں سے مجھے ٹھوکر لگی تھی تو کسی چیز کو ریت کے اندر چمکتے ہوئے پایا اس پر سے سمندر کی لہریں آ جا رہی تھیں۔ میں اس کے قریب پہنچی تو وہ چیز سورج کی کرنوں میں پہلے سے بھی زیادہ ٹمٹمانے لگی۔ سمندر کی آوارہ موجیں بار بار ساحل کنارے آ کر ریت کو چوم رہی تھیں جیسے ہی لہروں نے واپسی کا رخ کیا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر قدرے جھک کر ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس چیز کو گیلی ریت کے اندر سے نکال لیا اور اپنے ہاتھ میں اسے مضبوطی سے تھام کر غور سے دیکھنے لگی۔ یہ ایک نہایت خوبصورت چمکتا دمکتا سیپ تھا۔ جس کی ٹمٹماہٹ اسے مزید دلکش بنا رہی تھی۔ ''شاید یہ سیپ کسی جل پری کے ہار کا ہے۔'' یہ خیال یونہی اچانک سے میرے ذہن میں کوندا تھا کیونکہ سیپ کے خدوخال نہایت قدیم طرز کے تھے اور ایسا سیپ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں ابھی غور غور سے اس دلکش سیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہی تھی جب ہی میری سماعتوں سے میرے بھائی کی آواز ٹکرائی۔ ''کیسی تم وہاں کیا کر رہی ہو؟'' میرے بھائی نے دور سے آواز لگائی۔ ''ادھر آؤ اور کیکڑوں کو دیکھو۔''

میں نے نہایت آرام کے ساتھ اس سیپ کو اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اپنے بھائی کی جانب بڑھ گئی اس دن ہم سمندر کنارے سورج غروب ہونے تک کھیلتے رہے تھے۔ کاٹیج واپس آنے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آئی تو مجھے اس سیپ کا خیال آیا جو مجھے آج ساحل کنارے سے ملا تھا۔

جیسے ہی میں نے اسے اپنی جیب سے نکالا ٹھیک اسی وقت میری ممی میرے کمرے میں چلی آئیں اور میرے ہاتھ میں کسی چیز کو دیکھ کر مجھ سے بولیں۔ ''کیا آج سمندر کنارے کچھ خاص تلاش کیا ہے؟''

جب میں نے انہیں وہ سیپ دکھا کر انہیں اس بارے میں بتایا کہ کس طرح وہ سیپ میرے ہاتھ لگا تو وہ میری پوری بات سن کر دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔ ''کیسی میرا بچہ ادھر آؤ میرے پاس کچھ دیر کے لئے۔'' ان کی ممتا سے لبریز آواز ابھری تو میں صوفے پر ان کے پہلو میں جا بیٹھی۔

''یہ سیپ تمہارے پاس کیوں ہے اس کا مطلب جانتی ہو تم؟'' ممی نے پیار سے میری طرف دیکھ کر پوچھا مگر میں جواباً انہیں سوالیاں نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وہ مسکرائیں اور بولیں۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بچی بہت خوش قسمت ہے کیونکہ اسے جل پریوں کے ہار سے نکلا سیپ ملا ہے۔''

ممی کے ایسا کہنے پر مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ میں انہیں حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی اور خوش گوار حیرت سے بولی۔ ''کیا سچ میں ممی؟'' مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ممی نے اثبات میں سر ہلا کر کہنا شروع کیا۔ ''ہاں...... روایات میں ہے کہ جب بھی کبھی آسمان پر پورا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا ہے تو سمندر کی تمام جل پریاں سطح سمندر پر آ کر سمندر کی تمام مخلوقات کے ساتھ جشن مناتی ہیں اور کف دریا پر خوب صورت سفید گھوڑوں کی سواری بھی کرتی ہیں

ساتھ ہی ساتھ وہ ان ملاحوں کی رہنمائی اور مدد بھی کرتی ہیں جو سمندری طوفان کے باعث اپنا راستہ بھٹک جاتے ہیں یا پھر مصیبت میں ہوتے ہیں وہ کبھی کبھار ساحل کنارے بھی آتی ہیں اور وہی وہ وقت ہوتا ہے جب وہ تمہارے جیسے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے تحفے رکھ کر چلی جاتی ہیں جیسا کہ یہ ایک تحفہ تمہیں مل چکا ہے۔"

ممی نے تفصیل سے بتایا تو میں انتہائی دلچسپ کہانی سننے کے بعد اشتیاق سے ممی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے بھی کسی جل پری کو دیکھا ہے ممی؟"

"ہاں جب میں تمہاری عمر کی تھی تب میں نے اسے دیکھا تھا مجھے بھی بالکل تمہاری طرح ہی ایک ایسا سیپ ملا تھا جس کے اگلے دن ہی شام کو میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔" ممی نے جواباً کہا تو مجھے حیرت کے کئی شدید جھٹکے لگے۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "وہ دکھتی کیسی تھی ممی۔"

میری حالت دیکھ کر ممی مسکرا کر بولیں۔ "میں تمہیں زیادہ نہیں بتا سکتی میری جان کیونکہ یہ ایک راز ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی اس بارے میں کسی انسان کو نہیں بتاؤں گی لیکن میری گڑیا میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ بہت ہی چمکدار اور خوب صورت تھی اور مجھے یہ احساس ہے کہ بہت جلد تم بھی اپنی کسی جل پری سے ضرور ملو گی۔" ممی نے مسکراتے ہوئے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ تمام رات مجھے ٹھیک سے نیند نہ آ سکی سوچوں کی یلغار تھی جو سونے نہ دے رہی تھی۔ میں بہت پر جوش تھی اور بیڈ پر آنکھیں کھول کر لیٹے ہوئے بس یہی سوچتی جا رہی تھی کہ کیا میں کبھی کسی جل پری سے مل سکوں گی؟ اگر ملوں گی تو اسے کیا کہوں گی؟ ہم کیا باتیں کریں گے؟" بس یہی سب سوچتے سوچتے وہ تمام رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔ اگلے دن ہم Emerald Quay جا پہنچے جہاں ممی ڈیڈی اکثر ہمیں لے جایا کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی الگ تھلگ بے حد خوب صورت اور پر سکون جگہ تھی یہاں کے سمندر کا پانی آئینے کی طرح اس قدر شفاف تھا کہ ہم دور سے ہی پانی کے اندر سکون سے تیرتی ہوئیں مچھلیوں کو بہ آسانی دیکھ سکتے تھے دور کہیں آسمان پر سورج اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا اور بادلوں کا کوئی چھوٹا سا آوارہ ٹکڑا بھی دور دور تک سرگشت پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا بڑا بھائی سمندر کی چھوٹی چھوٹی مخلوقات کو دیکھنے کے لئے بڑے مزے سے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھا۔ جبکہ میں اکیلی ہی ساحل کنارے کنکریوں سے کھیلنے لگی تھی اور خود کو خیالوں ہی خیالوں میں جل پریوں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ہر فکر سے آزاد میں گا رہی تھی ہنس رہی تھی اور خود کو سمندر کی ملکہ ایمیلیا تصور کر رہی تھی جو سمندر کی ہر مخلوق کا خیال رکھتی ہے۔

شام ڈھلتے ہم گھر واپس آئے تو سارا دن کھیلنے کے باعث تھکن اور بھوک سے نڈھال تھے ہم سب رات کے کھانے میں بھنی ہوئی تازہ مچھلیوں کے ساتھ چپس آئس کریم اور کوک کی ٹھنڈی بوتلوں سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس قدر لذیذ کھانا کھانے کے بعد نیند کا خمار سر چڑھ کر بولنے لگا اور سب ہی اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے رات کا کوئی دوسرا پہر رہا ہوگا۔ میں بے خبر اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ معاً میری آنکھ بنا کسی وجہ کے ایک جھٹکے سے کھل گئی۔

مجھے اس طرح اچانک آنکھ کھل جانے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں خالی الذہن آنکھیں کھولے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی کہ معاً دور کہیں ہوا کے دوش پر لہراتی بل کھاتی کوئی مدھم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "کیسی کیسی۔"

اپنا نام سن کر میں بے اختیار چونک کر اٹھ بیٹھی اور آواز کی سمت کا تعین کرنے لگی۔ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی تھی سو فیصد کسی نے میرا نام نہایت دھیمے سے پکارا تھا۔ از خود میری نگاہیں کھڑکی کی جانب جا ٹھہریں غالباً آواز باہر سے ہی آئی تھی۔ میں اپنے اوپر سے لحاف اتار کر بیڈ سے نیچے اتری اور کھڑکی کے پاس چلی آئی باہر آسمان پر رات کی کالی چادر تنی ہوئی تھی جس کے اوپر پورا چاند اپنی تمام

ترحشر سمانیوں کے ساتھ محو رقص تھا اور اس کی دھیمی روشنی میں جزیرے کا منظر نہایت دلفریب تھا سمندر کی پرسکون لہریں جب بار بار آکر اپنا سر ساحل کنارے سے پٹختی تو بے حد رومانوی ماحول پیدا ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوائیں مجھ پر ایک عجیب سا نشہ طاری کرنے پر تلی ہوئی تھیں کہ معاً میں نے ساحل کنارے ایک بڑی سی چٹان پر کسی سراپا وجود کو بیٹھے ہوئے دیکھا جو میری جانب اپنا ہاتھ لہرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو جیسے مجھ پر سکتے طاری ہوگیا۔ کیا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ جب میں نے مزید دیدے پھاڑ کر غور سے دیکھا تو وہی وجود جو کسی سائے کی طرح تھا مجھے ایک بار پھر اپنی جانب اشارہ کرتا ہوا دکھائی دیا......

اب مجھے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ باہر جو کوئی بھی تھا غالباً مجھے ہی بلا رہا تھا۔ ”لیکن اس وقت مجھے باہر کون بلا سکتا ہے مجھے تو یہاں کوئی جانتا بھی نہیں ہے؟“ میں نے لمحے کے لئے سوچا مگر پھر جلد ہی ذہن میں آئے اس خیال کو جھٹک دیا۔

میں پندرہ سال کی کم عمر بچی ضرور تھی مگر اب ایسی بھی کوئی ڈرپوک نہ تھی کہ باہر جاکر صورت حال کا جائزہ نہ لے سکوں۔ چنانچہ میں خود میں تمام ہمت وحوصلے کو یکجا کرکے آہستگی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں چلی آئی۔ پورا گھر اندھیرے کی لپیٹ میں تھا میرے ڈیڈ کے اونچے خراٹے پورے گھر میں گونج رہے تھے جو رات کی خاموشی میں بے ہنگم شور برپا کررہے تھے۔ میرے بدن پہ ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی کیونکہ میرے پاؤں ننگے تھے اور ٹھنڈے فرش پر کھڑے ہونے کی وجہ سے ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہونے لگا تھا میں نے خاموشی سے اندھیرے میں اپنی جرابیں اور جوتے تلاش کئے جنہیں پہننے کے بعد میں لانگ کوٹ اوڑھ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی صدر دروازے کی جانب بڑھی گھر والے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔

لہٰذا مجھے اطمینان تھا کہ وہ میری واپسی سے پہلے تک نہیں جاگیں گے۔ میں نے بنا آواز پیدا کئے نہایت احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول دیا اور باہر دیکھنے لگ بد مست ٹھنڈی ہواؤں کی آغوش نے میرا استقبال کیا میں نے کوٹ کو اپنے گرد مزید اچھے سے لپیٹا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرکے باہر چلی آئی۔ ہمارا کاٹیج ساحل کے پاس ہی تھا لہٰذا تھوڑی ہی دیر میں، میں نرم وملائم ریت پر چلتی ہوئی اس جانب بڑھ رہی تھی۔ جدھر مجھے وہ سایہ دکھائی دیا تھا کھلے آسمان پر پورے چاند کے ساتھ آج ستاروں کی بھی جیسے بارات سجی ہوئی تھی۔ جن کی روشنی میں پورا جزیرہ نہایت سحر انگیز لگ رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں سمندر کے پانی کی ہلکی ہلکی آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

اس وقت میرے علاوہ دوسرا اور کوئی ساحل پر موجود نہیں تھا میں یونہی چلتے چلتے ساحل کنارے پہنچی تو میں نے کسی وجود کو سمندر کے پانی کے اندر اوپر سے نیچے حرکت کرتے ہوئے دیکھا چاند کی دھیمی روشنی میں اس کے چہرے کے نقش ونگار دھندلے تھے مگر اپنی جسمانی خدوخال کے باعث وہ کوئی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

”کیسی ادھر آؤ، ادھر آؤ۔“ ایک پرجوش نسوانی آواز ابھری۔ ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی مگر میں بہادری سے بولی۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام صوفیہ ہے اور میں ایک جل پری ہوں۔“ وہ بولی تو لمحے کے لئے میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور میں حیرت کی کشتی میں ڈولنے لگی مگر پھر اگلے ہی لمحے جیسے مجھے یکدم سے ہوش آگیا اور ایک جل پری سے ملنے کا خواب پورا ہوتا دیکھ کر مجھ پر بے انتہا مسرت کی مستی چھا گئی کیف وسرور کی بے پناہ لہریں مجھے اپنے پورے بدن میں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”جل پری...... کیا واقعی؟“ میرے لہجے میں بھی حد درجہ حیرت اُمڈ آئی تھی مجھے اپنی بصارت اور سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر پھر یکایک میں نے چاند کی ہلکی روشنی میں اس کی لمبی سی خوب صورت سی چمکتی ہوئی دم دیکھی جو چاندنی میں مزید دمک رہی تھی

اور پانی سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں میرا وہ تحفہ ملا جو میں تمہارے لئے چھوڑ کر گئی تھی؟" صوفیہ نے کنارے پر آتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

اب اس کا چہرہ مجھ پر واضح تھا وہ بے حد حسین وجمیل تھی۔ سرخ وسفید رنگت پر بڑی بڑی گول مٹول نیلی آنکھیں، خون کے رنگ جیسے سرخ ہونٹ اور کمر کی پشت پر پھیلتے ہوئے قیامت خیز لمبے ریشمی سرخ بال، اس قدر خوبصورت جل پری کا تصور میں نے کبھی نہیں کیا تھا نہ ہی ایسی حسن پری میں نے کبھی فلموں میں دیکھی تھی۔

"وہ سب جو کل مجھے ساحل کنارے ملا تھا کیا خاص طور پر میرے لئے چھوڑا گیا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا تو صوفیہ نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم ہماری خاص موسم سرما کے وسط کی چاندنی رات کی پارٹی میں آنا چاہو گی؟ ملکہ نے تمہیں یاد کیا ہے۔" صوفیہ بولی۔

"ہاں ہاں ضرور کیوں نہیں۔" میں نے پرجوش ہوتے ہوئے خوشی سے کہا۔

اسی لمحے صوفیہ کا خوب صورت سفید گھوڑا لہروں سے سطح سمندر پر ابھرا۔ گھوڑے کے لمبے ملائم بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی دم بھی ادھر سے ادھر جھوم رہی تھی۔ وہ بالکل فرضی کہانیوں جیسا یونیکورن تھا جس کے سر پر ایک شاخ بھی موجود تھا۔ اس منظر کو اپنی جاگتی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ کر لمحے کے لئے میری نظریں پتھرا گئیں۔

چاند کی روشنی میں جل پری صوفیہ اور اس کے خوب صورت سفید گھوڑے کا منظر ہی عجب تھا۔ صوفیہ نے میری جانب ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ اس کے نرم ونازک ہاتھ میں تھما دیا اور سمندر کے ٹھنڈے پانی میں اتر گئی۔ صوفیہ نے سہارا دے کر مجھے اپنے خوب صورت گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ اب میں مکمل طور پر گھوڑے کے رحم وکرم پر تھی۔ اگلے ہی لمحے ہم Emerald Quay کی رنگ برنگی لہروں کے نیچے

> **حسرت**
>
> ایک نرس کا منگیتر بڑی حسرت سے بولا۔ "جانو" کاش مجھے کوئی حادثہ پیش آتا اور میں تمہارے وارڈ میں ایڈمٹ ہوتا تم میری خدمت کرتی اور میں جلدی ٹھیک ہوتا۔"
>
> یہ سن کر نرس بولی۔ "جان میرے وارڈ میں داخل ہونے کے لئے کسی حادثہ کی نہیں بلکہ معجزہ کی ضرورت ہے کیونکہ زچہ وارڈ میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے۔"
>
> (شرف الدین۔ٹنڈوالہ یار)

غائب ہوگئے دور آسمان پر چمکتی چاند کی روشنی میں ساحل سمندر کے نیچے بکھرے بے شمار رنگ، ہیرے کی مانند چمک رہے تھے اور سمندر کے شفاف پانی سے اوپر آسمان پر چمکتا ہوا چاند بھی بآسانی دکھائی دے رہا تھا۔

ہم نجانے کتنی دیر آرام وسکون سے سمندر کی لہروں کے ساتھ سفر کرتے رہے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہونے کے باوجود میں ٹھیک سے سب کچھ دیکھ سکتی تھی سن سکتی تھی اور سانس لے سکتی تھی یہ سب میرے لئے کسی سہانے خواب سے کم نہیں تھا جس پر یقین کرنا اب بھی میرے لئے خاصا دشوار تھا دور سے ہی مجھے جادوئی دنیا کا ایک سفید محل دکھائی دیا جس کی بلند وبالا عمارت بڑے شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی دیواریں سنگ مرمر جیسی تھیں جیسے ہی ہم اس کے قریب پہنچے تو مجھے اس کی بلندی، چوڑائی، خوبصورتی اور مضبوطی کا اندازہ ہوگیا۔ ہیرے کی مانند چمکتی وہ خوب صورت عمارت میرے تصورات سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی سمندر کی بے پناہ گہرائیوں میں ایسی خوب صورت عمارت دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ سفید گھوڑا ٹھیک سفید محل کے باہر آکر رکا تھا۔ صوفیہ نے سہارا

www.urdusoftbooks.com

دے کر مجھے گھوڑے کی پشت سے اترنے میں مدد دی جس کے بعد ہم سفید محل کے بڑے سے محرابی دروازے سے ہوکر اندر داخل ہو گئے۔ عمارت اندر سے بھی مکمل طور پر سفید تھی۔

ایسی پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر میں اپنا آپ کھو بیٹھی میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرانگی سے دیکھ رہی تھی محل کی خوب صورتی نے مجھے اپنے حسن میں جکڑ لیا تھا۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ایسے شاندار محل میں آخر مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتی تھی کہ یہ سب کوئی خواب تھا یا سراب کوئی افسانہ تھا یا طلسمی کہانی...... کیا تھا یہ؟...... مگر جو بھی تھا میرے خیالات اور تصورات سے کہیں زیادہ آگے تھا۔ دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل سمندر کی گہرائیوں میں بھی ایک الگ خوب صورت اور پرسکون دنیا کو دیکھ کر میری حالت بیان سے باہر تھی۔ میں حیران تھی خوش تھی یا کیا...... میں خود نہیں جانتی تھی محل کے راہ داریوں سے ہلکی موسیقی اور قہقہوں کی آواز نیچے ہال تک آرہی تھی جدھر ہم کھڑے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ کیسی۔'' صوفیہ نے کہا اور مجھے لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آگئی جہاں لاتعداد اور رنگ برنگے خوب صورت سے طرح طرح کے گاؤن موجود تھے۔ جن کے ساتھ ہی زیورات اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے تاج بھی پڑے تھے۔ صوفیہ نے میرے لئے سمندری رنگ کا خوب صورت سا گاؤن منتخب کیا جو مجھے بھی بے حد پسند آیا اور پھر وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے تیار کرنے لگی صوفیہ نے میرے لباس کے رنگ کے مطابق ہی میرے پیروں میں اسی رنگ کی ہیل والی جوتی پہنائی اور پھر ہلکی ہلکی میچنگ جیولری پہنانے کے بعد اس نے سلور رنگ کا خوب صورت سا چھوٹا سا تاج میرے سر پر سجا دیا۔ تیار ہونے کے بعد جب میں نے خود کو بڑے سے قد آدم آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گئی۔ سمندری رنگ کا گاؤن مجھ پر بہت جچ رہا تھا اور اس میں کافی پیاری لگ رہی تھی میں۔ گاؤن بالکل میرے ہی سائز کا تھا جس وجہ سے اسے پہنتے ہوئے مجھے بالکل بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ ایسا لباس میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پہنا تھا جس میں میری شخصیت ہی نکھر گئی تھی۔

میں خود کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اور خود کو کسی شہزادی سے کم محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ''کیسی اب تم جانے کے لئے بالکل تیار ہو۔ میں تمہیں ایک خاص انسان سے ملوانا چاہتی ہوں۔'' صوفیہ نے کہا اور مجھے ساتھ لئے ایک ہال نما کمرے میں چلی آئی جس کے اندر داخل ہوتے ہی خوشبو کے ایک مخمور جھونکے نے میرا استقبال کیا سفید اور سنہری چیزوں سے آراستہ وہ ہال نما کمرہ کسی بادشاہ کی خواب گاہ سے کم نہیں تھا۔

ایک پل کے لئے تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی قدیم زمانے میں آگئی ہوں اور کسی بادشاہ کے محل میں کھڑی ہو کر اس کے محل کی حسین چیزوں کا نظارہ کر رہی ہوں۔ میں ہر چیز کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی جب میری سحر زدہ سی نظر واپس آئی تو بالکل سامنے ہال کے وسط میں بڑی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ملکہ حسن پر جا ٹھہری جو بڑے شان بے نیازی سے تخت پر بیٹھی ہوئی میری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے غیر معمولی حسن کو دیکھ کر لمحے کے لئے میری آنکھیں ساکت رہ گئیں اس کے سر پر سنہری رنگ کا بڑا سا تاج موجود تھا جسے دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ وہی سمندر کی رکھوالی جل پری ملکہ ایملیا تھی۔ ملکہ ایملیا کو اپنے سامنے دیکھ کر میری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن مجھے ملکہ ایملیا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔ وہ سرخ و سفید رنگت کی حامل نہایت حسین و جمیل جل پری تھی اس کے سونے کے جیسے لمبے گھنے سنہری بال تھے جو نیچے سے گھنگھریالے ہوکر اس کے نرم رخساروں کو چوم رہے تھے اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں سمندر کے نیلے پانی ہی کی طرح بے پناہ گہرائی تھی اس کے خوب صورت چہرے پر جہاں رعب اور دبدبہ تھا وہیں نرمی، پیار اور

شفقت بھی تھی۔

وہ واقعی سب سے الگ اور بے مثال تھی صوفیہ نے اس کے سامنے اپنی کمر کو تھوڑا سا خم کیا جس کی دیکھا دیکھی میں نے وہی عمل دہرایا تو ملکہ ایمیلیا مسکرا دی اس کی مسکراہٹ بھی اس کے جیسے حسین تھی پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''کیسی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ صوفیہ نے مجھے تمہارے بارے میں سب بتایا ہے ساتھ میں یہ بھی بتایا ہے کہ تمہیں اس کا دیا ہوا وہ تحفہ مل چکا ہے جس وجہ سے اب تم دونوں دوست ہو...... مجھے بتاؤ سمندر کے نیچے تمہیں ہماری یہ دنیا کیسی لگی؟''

''بہت خوبصورت۔'' میں نے جھٹ سے جواب دیا۔ ''میری تو خواہش ہے کہ میں یہاں ہمیشہ کے لئے رہ سکوں۔'' میں نے خوشی سے کہا تو میرا جواب سن کر ملکہ مسکرا دی۔

''میری جان میرے پاس تمہارے لئے کچھ ہے۔''

ملکہ نے کہہ کر اپنے پاس کھڑی ایک اور جل پری کو اشارہ کیا تو وہ ہال نما کمرے سے چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا جسے اس نے ملکہ ایمیلیا کے حضور پیش کر دیا۔ ملکہ ایمیلیا اپنے تخت سے اٹھ کر چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور اپنے ہاتھوں سے وہ باکس میرے ہاتھوں میں تھما دیا میں نے وہ باکس کھولا تو اس کے اندر نہایت خوب صورت چمکتا دمکتا موتیوں کا ہار تھا جسے دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

''صوفیہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم کس قدر خیال رکھنے والی اور پیار کرنے والی انسان ہو، تمہاری اچھائی اور نیکیاں چھپی ہوئی نہیں تھیں یہ نیکلس ایک چھوٹا سا تحفہ ہے میری طرف سے تمہارے لئے تمہیں یہ بتانے کے لئے کہ تم کتنی خاص ہو۔''

ملکہ کے منہ سے اپنے لئے تعریفی کلمات سن کر مجھے حد درجہ خوشی کا احساس ہوا۔ ملکہ ایمیلیا نے اپنے ہاتھوں سے وہ موتیوں کا ہار میرے گلے میں پہنا دیا اور میں مبہوت سی ہو کر اس کے حسن میں کھو گئی ایک لمحے کے لئے بھی میری نگاہیں اس کے حسن پر سے نہ ہٹی تھیں ہم سب نے مل کر ساری رات خوب موج مستی کی۔ ہم ناچے گائے، خوب قہقہے لگائے یہاں تک کہ ایک نئے دن کا آغاز ہو گیا۔ رات ڈھل کر ایک نئے دن میں بدل چکی تھی میں بخوبی جانتی تھی کہ اب میرے جانے کا وقت آ گیا ہے میرے گھر والے مجھے ضرور یاد کر رہے ہوں گے میں سب سے آخری بار مل کر سفید محل کے باہر کھڑے ہوئے خوب صورت سفید گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئی اور دل میں اس یادگار سفر کی بے پناہ یادیں لئے افسردہ سی صوفیہ کے ساتھ واپسی کی طرف گامزن ہو گئی۔

کچھ ہی لمحوں میں ہم ساحل پر موجود تھے میں صوفیہ کی مدد سے گھوڑے کی پشت سے اتر کر پانی سے نکلی اور ساحل کی نرم اور گیلی ریت پہ ایستادہ ہو گئی۔ صوفیہ اپنے سفید گھوڑے کے ساتھ پانی کے اندر ہی موجود رہی۔ چار سو صبح کا ملگجا اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ ہر طرف سکون بخش ٹھنڈی ہوائیں سرگرداں تھیں۔ سمندر کا پانی بار بار ساحل کنارے آ کر نرم ریت میں جذب ہو جانا چاہتا تھا۔ دور دور تک ساحل پر میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اداسی سے صوفیہ سے پوچھا۔ ''کیا ہم پھر کبھی مل سکیں گے؟''

''ہم جل پریاں سال کے خاص وقتوں میں صرف سطح سمندر کے اوپر آتی ہیں جیسا کہ موسم سرما کے وسط میں یا پھر Halloween میں جب موسم خاصا بدل جاتا ہے باقی کا سارا سال ہم سمندر کی باقی مخلوقات کا خیال رکھتے ہیں مصروف رہتے ہیں ہم ہر وقت سفر میں رہتے ہیں اس لئے شاید اب کافی دیر کے لئے بھی ہمارا یہاں آنا نہ ہو گا۔'' صوفیہ کے جواب نے مجھے مزید اداس کر دیا یہ سوچ کر میں پھر کبھی اپنی جل پری دوست سے دوبارہ نہیں مل سکوں گی۔

مجھے افسردہ اور اداس دیکھ کر صوفیہ مسکرائی اور بولی۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا کیسی جو بیپ

میں نے تمہیں دیا ہے وہ جادوئی ہے جب بھی کبھی تم اداس یا افسردہ ہوتو اس سیپ کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر یہ الفاظ دہرانا۔ ’’گرم اور چمکیلے سیپ جب بھی میں رات کو سوؤں تو میری حفاظت کرنا اور جب بھی میں تنہا یا اداسی محسوس کروں تو مجھے یہ یقین اور احساس دلانا کہ تم بھی میری راہ دیکھ رہے ہو۔‘‘

’’یہ الفاظ کہنے کے بعد میں ہمیشہ تمہیں جواب دوں گی چاہے جہاں بھی ہوں مگر پھر بھی تمہیں اشارہ بھیجوں گی کہ میں تمہیں سن رہی ہوں اور تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی ہو اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کیسی کہ تم بہت ہی اچھی اور پیار کرنے والی انسان ہو اپنا خیال رکھنا۔‘‘ اس کے ساتھ ہی پلک جھپکتے ہی چشم زدن میں صوفیہ اور اس کا سفید گھوڑا غائب ہوگئے۔ اب میں تن تنہا ساحل پر کھڑی تھی اور میری نظریں اب بھی وہیں ساکت تھیں جدھر چند لمحے پہلے صوفیہ اپنے سفید گھوڑے کے ساتھ موجود تھی اب ہوا صرف ڈولتے پانی کے سوا کچھ تھا۔ تاحد نگاہ نیلے پانی کی چادر تنی ہوئی تھی جس کے اوپر بھی نیلے رنگ کے عرش پر بادلوں کی اوٹ سے سورج نے اپنا سر اٹھانا شروع کردیا تھا۔

ماحول میں ایک سکوت سا طاری تھا۔ صرف لمحہ بہ لمحہ ابھرتے پانی کے شور کی آواز چند لمحوں کے لئے فضاء میں ارتعاش پیدا کردیتی تھی جب سمندر کی پرسکون لہریں آکر ساحل سے ٹکراتی تھیں ...... میں بوجھل قدموں سے اپنے کاٹیج کی جانب چل پڑی اور یہ دیکھ کر میں نے سکون کی گہری سانس خارج کی کہ گھر میں اب تک کوئی نہیں جاگا تھا۔ یعنی میرے رات بھر غائب رہنے کا علم کسی کو نہیں ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آئی جس کا دروازہ بند کرکے اپنے بیڈ پر دراز ہوگئی اور رات بھر کی تھکی ہاری جلد ہی نیند کی وادیوں میں جا سوئی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا میں کافی دیر تک سوتی رہی تھی اور شاید ممی نے بھی مجھے گہری نیند سے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا گزشتہ تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ تھے مگر اب وہ سب مجھے کسی خواب کی مانند لگ رہے تھے۔ ان سب کا یقین کرنے کے لئے میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا جو میں سونے سے پہلے اتار کر نہ سوئی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے خوش گوار، حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ سیپ میرے کوٹ کی جیب میں اب بھی موجود تھا جو صوفیہ نے مجھے دیا تھا۔

میں جلدی سے بیڈ سے اتر کر آئینے کے سامنے آئی تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی میرے گلے میں اب بھی وہ نیکلس موجود تھا جو ملکہ ایملیا نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پہنایا تھا اب مجھے مکمل یقین ہوگیا تھا کہ وہ سب ایک خواب یا میرا وہم نہیں تھا بلکہ وہ سب ایک اٹل حقیقت تھی جن سے میں گزری تھی اور یہ جان کر مجھے حد درجہ خوشی کا احساس ہورہا تھا میں نے حفاظت سے اس نیکلس کو اپنی خاص اور قیمتی چیزوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا۔ وقت گزرتا رہا اور یونہی کئی سال بیت گئے۔

میں اب ایک بھرپور جوان لڑکی ہوچکی تھی ہم متعدد بار مغربی ویلز واپس گئے مگر پھر کبھی میں اپنی جل پری دوست سے دوبارہ نہ مل سکی اکثر اوقات میں ساحل کنارے کھڑے ہوکر دور تک پھیلے نیلگوں سمندر پر نظریں گاڑ کر یہی امید یہی خواہش کرتی تھی کہ کاش میں ایک بار پھر اسے سمندر کی سطح پر رقص کرتے ہوئے دیکھ سکوں اور جب بھی کبھی مجھے کسی سچے دوست کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس سے میں اپنی ہر فکر ہر پریشانی شیئر کرسکوں تب میں وہ سیپ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر وہ قیمتی الفاظ دہراتی تھی جو صوفیہ نے مجھے ذہن نشین کروائے تھے میرے ایسا کہتے ہی وہ سیپ پہلے سے بھی کہیں زیادہ چمکنے لگتا تھا اور میری سماعتوں سے صوفیہ کی نرم سرگوشی کی آواز ٹکراتی تھی۔ ’’کیسی ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم کتنی اچھی اور نیک دل ہو۔‘‘ یہی وہ لمحہ ہوتا تھا جب مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہر پل ہر لمحہ دیکھ رہی ہے اور سن رہی ہے اور پھر یہی احساس میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر جاتا تھا۔



ہولناک سانحہ

ایس امتیاز احمد-کراچی

چلندنی رات میں ریل کی پٹڑی چمک رہی تھی، غور سے لیکھنے پر معلوم ہوا کہ جواں سال خوبرو حسینہ کا مردہ جسم تھا جو کہ کئی حصوں میں بکھرا پڑا تھا جو کہ بہت ہی لرزنك منظر پیش کررہا تھا

ایک نادیدہ قوت کی دیدہ دلیری جس نے زور زبردستی......اپنی محبت کا دم بھرنے لگی تھی

میرے والد ریلوے میں گارڈ تھے......

1947ء میں جب میں نے B.A کیا۔ اسی سال وہ انتقال کرگئے۔ ان کا ایک ہندو دوست رام لعل تھا۔ جو ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں ایک بڑا افسر تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ انگریز چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر لے گیا۔ اس انگریز افسر نے مجھے ایک مرحوم ریلوے ملازم کا بیٹا ہونے کے ناطے بطور گارڈ بھرتی کرلیا...... 6 ماہ کی ٹریننگ ختم ہوئی تو کچھ دنوں بعد حیدرآباد میں ٹرانسفر کردیا گیا۔

ملازمت گھر سے اس قدر دور تھی مگر تنخواہ اس وقت کے حساب سے 100 روپے معقول تھی...... میں ٹرین میں سوار ہوکر اگلے دن شام کے دھندلکے سے قبل حیدرآباد پہنچ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر سے ملا جس نے مجھے ایک قلی کے سپرد کردیا کہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں لے جاؤ۔ یہ نئے گارڈ صاحب آئے ہیں۔ قلی نے بستہ اٹھاتے ہوئے میرے کوائف پوچھے تو میں نے اسے بتادیا کہ کراچی کا رہنے والا ہوں تو اس نے بتایا کہ وہ بھی کراچی کا رہنے والا ہے۔

حیدرآباد کا ویٹنگ روم اس زمانے میں ایک پہاڑی پر تھا اور ریٹائرنگ روم بھی وہیں تھا۔ اس نے ویٹنگ روم میں بستر بچھادیا۔ وہیں میرا بکس بھی رکھ دیا۔ میں کھانا کھا کر سوگیا۔ پنکھا چل رہا تھا نہ معلوم کس وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا...... انجنوں کی شنٹنگ اور گڑگڑاہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ گھڑی

دیکھی تو رات کے 2 بج رہے تھے۔ بہ مشکل دوبارہ آنکھ لگی مگر کچھ دیر بعد اسی احساس کے ساتھ آنکھ کھل گئی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا اور پھر بند کردیا۔ لیمپ کی بتی اونچی کرکے دیکھا بھالا تو کچھ بھی نہ تھا..... اسی کشمکش میں صبح ہوگئی۔

میں نے دفتر جاکر ڈیوٹی شیڈول لیا۔ اور سب سے سلام دعا کی..... اسی دن پرکاش نے بھی ڈیوٹی جوائن کی وہ لاہور سے آیا تھا..... ہم دونوں ویٹنگ روم میں ساتھ رہتے تھے۔

چند روز بعد ایک رات میں تنہا بیٹھا لیمپ کی روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے کی جالی کے قریب مجھے آہٹ محسوس ہوئی..... دروازے میں کسی کی موجودگی کے احساس نے کتاب سے دھیان ہٹادیا اور میں کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

آخر تنگ آکر لیمپ کی بتی دھیمی کردی اور لیٹ گیا۔ ابھی سوچ بھی نہ سکا تھا کہ دیکھا وہ میرے پاس کھڑی ہے۔

وہ اس طرح دھیمے پاؤں چل کر آئی کہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب وہ بیڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں اس شش و پنج میں گرفتار تھا کہ دروازے کی کنڈی لگی ہوئی ہے یہ اندر کیسے آگئی..... میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ دلفریب انداز میں مجھے دیکھے جارہی تھی۔ میرا دل اس طرح دیکھنے سے دھک دھک کرنے لگا ہمت نہ ہوئی کہ بیڈ سے نیچے قدم رکھ سکوں۔

آخرکار وہ مجھے اس کیفیت میں چھوڑ کر دروازے کی جانب بڑھی اور آہستہ سے پٹ کھول کر غائب ہوگئی..... میں نے لیمپ کی بتی اونچی کی اور اپنی قوتوں کو جمع کیا..... دروازہ جاکر دیکھا تو اس کی کنڈی لگی ہوئی تھی، جیسے میں نے سونے سے پہلے لگائی تھی۔ میں نے تسلی کے لئے ہاتھ لگا کر دیکھا تو واقعی دروازہ اندر سے بند تھا۔ "یاخدا! میں نے خواب دیکھا؟ یہ کیا اسرار تھا؟" کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیمپ کی بتی پھر نیچے کی نیند نہ آئی تو ساری رات کتابیں پڑھ کر گزار دی۔

اگلی صبح جب کمرے کی صفائی کرنے والا آیا تو اسے میں نے سارا واقعہ سنایا..... اس نے قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا اور اسے میرا وہم بتایا..... میں نے مذاق کے ڈر سے دفتر میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

اب تو روزمرہ کا یہ معمول ہوگیا..... میں نے اپنی منگیتر بانو کے لئے جس قدر شعر یاد کئے تھے وہ اکیلے کمرے میں اکثر گنگناتا رہتا تھا..... وہ عموماً سنتی رہتی..... درحقیقت وہ بہت معصوم اور بےضرر معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت ایک مرتبہ ضرور کمرے کا چکر لگاتی..... کہاں سے آتی..... کیسے آتی؟ اب یہ مسئلہ میرے سوچنے کا نہیں تھا..... وہ آتی اور چپکے سے میرے سامنے بیٹھ جاتی..... اور میں اسے شعر اور بعض اوقات اخبار پڑھ کر سناتا رہتا..... وہ سب کچھ بغور سنتی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ہوتی۔ ایسی چمکدار آنکھیں میں نے پہلے کبھی کسی کی نہیں دیکھی تھیں ایک دن بڑے پیار سے اسے ایک شعر سنایا تو وہ مسکرادی۔

پرکاش بےچارہ سیدھا سادہ نوجوان تھا..... اسے شعر و ادب سے دلچسپی تھی نہ دلبرانہ آہو چشم کے رمزو کنایہ سے التفات 8 سے 10 دن میں بھی ایک آدھ بار ہی اس سے ملاقات ہوتی اور وہ دفتر کے بابوؤں کی شکایتوں اور افسروں کے گلے شکوے تک محدود رہتا۔ والدہ صاحبہ کے خط آتے..... جوابی خط نہ لکھنے کی شکایات اور بانو کا سلام بھی لکھا ہوتا مگر اب مجھے فرصت نہ ملتی..... کچھ اس دلفریب کے چکر میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ ڈیوٹی کے بعد جب کمرے میں آتا اور وہ نہ آتی تو دل الجھا الجھا سا رہتا۔ اور جب وہ آتی تو بھی گفتگو ایک طرفہ ہی رہتی۔

ایک سرد رات تھی۔ لاہور کے اسٹیشن سے مال گاڑی حیدرآباد کے لئے آرہی تھی۔ میں گارڈ کے ڈبے میں لیمپ کی دھندلی روشنی میں جلدی جلدی رجسٹروں کی تکمیل میں مصروف تھا۔ بس چند ہی لمحوں میں حیدرآباد اسٹیشن آیا ہی چاہتا تھا انجن کے یکایک بریک لگنے کا احساس ہوا۔ میں نے کیبن سے جھانک کر دیکھا کہ گاڑی گھسیٹتی ہوئی آؤٹر سگنل کے باہر رک گئی۔ خاصی دیر سگنل نہ ہوا تو باہر نکل کر جائزہ لیا مگر وجہ معلوم نہ ہوسکی..... پھر گاڑی کھسکی تو میں کیبن میں واپس آگیا۔ دیکھا تو لکڑی کے سرکاری بکس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دل دھک سے رہ گیا..... کوئی اس وقت مجھے دیکھتا

تو یہی کہتا کہ ایک معمولی سیاہ بلی دیکھ کر ڈر گیا...... بخدا وہ بلی تھی...... سفید سفید لمبے بالوں والی اور گہری نشیلی آنکھوں والی ...... میں نے جیسے ہی "جانور" کہا تو وہ مسکرا دی جیسے کہہ رہی ہو اکیلا کیلے سیر کرتے پھرتے ہو۔

پٹریوں کی کھٹا کھٹ شروع ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر رش ہونے لگا...... جلدی جلدی میں نے رجسٹر بند کئے اور جیسے ہی ان بکس میں رکھنے کے لئے آگے بڑھا وہ ایک انداز دلبرائی سے اٹھی اور کموڈ کے اوپر جا بیٹھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قربت کے باوجود میں اسے نہ پکڑ سکوں گا۔ لہٰذا باتیں کرنے لگا وہ سنتی رہی...... پلیٹ فارم پر گاڑی رکتے ہی وہ اتر کر باہر نکل گئی۔ میری نگاہیں لائنوں اور لیمپوں کے ملگجے اجالوں میں اس کا تعاقب کرتی رہ گئیں۔

پانچویں دن پھر لاہور سے آتے ہوئے بالکل وہی واقعہ پیش آیا۔ سگنل کے باہر گاڑی رکی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی میرے کیبن میں آ گئی۔ اور بے تکلفی سے میرے صندوق پر بیٹھ گئی۔ حسب معمول میں رجسٹروں پر جھکا ہوا کام کر رہا تھا...... نظریں اٹھا کر جو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ...... دراز قد سفید ساڑھی کھلے بال تیکھے نقوش...... بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا...... اس پر اس نے ایک نقرئی قہقہہ لگایا...... دلفریب انداز سے اٹھی اور دروازے تک پہنچ گئی۔ میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور قریب تھا کہ اس کو پکڑ لوں مگر گاڑی یارڈ میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ چلتی گاڑی سے اتر چکی تھی۔

وہ رات قیامت کی تھی...... جسم تو بے شک بیڈ پر تھا...... لیکن دماغ اور دل وہاں نہیں تھے جب میں B.A میں داخلے کے لئے لاہور گیا تو خالہ کے گھر لوہاری گیٹ میں ٹھہرا...... خالو کی وفات کے بعد خالہ کی کل کائنات بانو تھی...... ماں بیٹی دونوں کمر بند بنا بنا کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں...... بانو ایک قبول صورت لڑکی تھی...... میرا ناشتہ کھانا کپڑے دھونا اور رکھنا سب اس کے ذمے تھا۔ سارے گھر کا کام کاج اور باقی ماندہ وقت میں کمر بند بنانا اس کی اضافی ڈیوٹی تھی...... اس خاموش گھر میں میری موجودگی سے گہرا سکوت آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ بانو کے لئے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری والدہ جب خالہ سے ملنے لاہور آئیں تو چپکے سے میرا رشتہ بانو سے پکا کر کے چلی گئیں...... اب بانو مجھ سے پردہ کرنے لگی۔

میری سروس کا سلسلہ چل نکلا تو میں حیدر آباد کی نامانوس مٹی سے مانوس ہونے کی کوششوں میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ جس نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور یہاں میری پراسرار ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ مگر ایک دن اچانک والدہ کے خط نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا...... یہ خط مجھے اسٹیشن ماسٹر کی توسط سے ملا...... تو معلوم ہوا کہ وہ برابر خط لکھتی رہتی ہیں جو مجھے نہ ملتے تھے۔ لہٰذا تنگ آ کر وہ خط اسٹیشن ماسٹر کی معرفت تحریر کیا گیا۔

اس میں لکھا تھا کہ "اب بھی خط کا جواب نہ دیا تو میں وہاں آ جاؤں گی۔" آخر میں یہ بھی تحریر کہ 12 فروری کو تمہاری شادی بانو سے ہو رہی ہے۔ چند روز کی چھٹیاں لے کر آ جاؤ۔"

یہ جنوری کے آخری دن تھے حسب الحکم اگلے دن چھٹی کی درخواست بھجوا دی اور ڈیوٹی پر چلا گیا۔

رات کے وقت جب کمرے میں واپس آیا تو ایک مخصوص مہک اس کے آنے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر آہستگی سے دروازہ کھلا اور سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا...... دروازے کے قریب کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آیا جو مجھے یقین تھا کہ میرے داخل ہوتے وقت وہاں نہیں تھا۔ جلدی سے اٹھا کر لیمپ کی روشنی میں پڑھا۔ عبارت کچھ اس قسم کی تھی۔ "مجھے سب معلوم ہے تم شادی نہ کرنا ورنہ پریشان رہو گے تم یہاں سے مت جانا۔"

3 دن اسی چکر میں گزر گئے...... پرکاش کو میں نے سب باتیں بتا کر مشورہ مانگا تو اس نے کہا۔ "یہ سب وہم ہے تم شادی کر لو...... اور بھابھی کو جب لاؤ تو حیدر آباد میں کوئی مکان لے لینا اور آرام سے رہنا...... یہ کمرہ چھوڑ دینا تاکہ وہ نظر نہ آئے۔"

فروری کے شروع میں، میں لاہور آ گیا اور شادی

ہوگئی۔ 15، 20دن آرام سے رہا..... اسی دوران پرکاش کا خط آیا کہ اس نے 20روپے ماہوار پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا ہے جو حیدرآباد اسٹیشن کے قریب ہے جب تم آؤ گے میں اسٹیشن پر ملوں گا۔

بانو کو لے کر میں حیدرآباد پہنچا تو پرکاش حسب وعدہ مل گیا۔ یہ ایک کمرہ کا مکان تھا۔ اس نے صفائی کرادی تھی۔ میرا بکس، بستر اور ایک بیڈ اور ضروری سامان اس نے گھر میں سیٹ کرادیا میں اور بانو ہنسی خوشی رہنے لگے.....

کچھ دنوں کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا میں دو روز کی ڈیوٹی سے واپس آیا تو کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بانو نے دروازہ کھولا۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی اور چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ بہت تسلی دلاسے کے بعد اس نے بتایا کہ گزشتہ صبح وہ جب باتھ روم سے واپس آئی تو اس کے کمبل میں ایک سفید بلی بیٹھی تھی جو اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی..... بانو طبعاً بہادر تھی اس کو مارنے کے لئے جو آگے بڑھی تو بلی نے اس پر حملہ کردیا۔ تمام قمیض پھاڑ دی بلی نے اس کو بے حال کردیا قسمت سے دودھ والی آ گئی..... اس نے بلی کو بھگایا ورنہ معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ میرا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا مگر میرے پاس سوائے اسے تسلی دینے کے کچھ نہ تھا ڈسپنسری سے مرہم پٹی کرادی اور دوا لادی..... وہ تین دن میں وہ ٹھیک ہوگئی۔

اب جب میں ڈیوٹی پر جاتا تو وہ پڑوسن کی لڑکی کو بلا کر اپنے ساتھ رکھنے لگی۔

ایک رات جب میں گھر آیا تو بانو پر پھر دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی سر کے بال کھلے تھے پڑوسن کی ماں آئی ہوئی تھی وہ بولی..... ”بھائی دو روز سے بانو کا یہی حال ہے کچھ کھایا نہ پیا..... روئے جاتی ہے۔“ میں نے ان کو تو رخصت کردیا اور بانو کی دلجوئی کرنے لگا پھر اسے دودھ پلا کر سلادیا۔

صبح میں نے ناشتہ تیار کیا۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھی بہرحال کچھ طبیعت سنبھلی تو اس نے بتایا کہ پرسوں آپ کے جانے کے بعد بلی پھر آئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہ کتے کے برابر ہوگئی۔

اتفاقاً اسی دن خالہ لاہور سے آگئیں میری جان میں جان آئی۔ میں بانو کو ریلوے اسپتال لے گیا اور دوا وغیرہ دی۔ اس طرح خالہ کی موجودگی میں اسے آرام کا موقع بھی مل گیا۔ لیکن اس کی قوت گویائی ختم ہوچکی تھی اب میں تھا اور ڈاکٹروں ...... حکیموں کے چکر حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر سے علاج کرایا اور حکیموں سے بھی علاج کرایا مگر بے سود بانو سوکھتی چلی گئی اور پھر چلنے پھرنے سے معذور اس قدر ہوئی کہ بمشکل اسے ”حوائج ضروری“ کے لئے جلایا جاتا...... میں خود کو اس کا مجرم سمجھنے لگا۔ 3 مہینے اس مکان میں اس طرح گزر گئے۔

جون کا مہینہ تھا گرم راتوں میں ویسے ہی نیند نہیں آتی...... صحن میں بانو اور خالہ کے بیڈ ڈال دیئے تھے۔

اس دن پرکاش بھی آ گیا ہم دونوں نے دروازے کے باہر اپنے پلنگ ڈال لئے معلوم نہیں کہ کس وقت آنکھ کھلی تو خالہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اندر گیا تو معلوم ہوا کہ بانو بیڈ سے غائب ہے کمرے میں دیکھا دروازہ کھلا تھا جو خالہ نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں دروازے کی طرف بھاگا مکان کے سامنے دور تک کچھ بھی نہ تھا۔ پچھلی جانب ریل کی پٹریاں تھیں میرے ساتھ پرکاش بھی تیز تیز چل رہا تھا۔

چاندنی رات میں صرف پٹری چمک رہی تھی تھوڑے فاصلے پر مجھے کچھ پڑا نظر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ بانو کا مردہ جسم پڑا ہے۔ بانو کے بے جان لاشے کو میں گھر اٹھالایا، دیکھا تو بانو کا جسم جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی خونخوار درندے نے اسے بھنبھوڑ ڈالا ہو۔

پرکاش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔ جیسے وہ سب سمجھ گیا ہو...... خالہ بے حال ہوگئیں قصہ مختصر سب سامان چھوڑ کر میں حیدرآباد سے کراچی چلا آیا۔ بانو کو حیدرآباد سندھ کی مٹی کے حوالے کردیا...... نوکری سے چھٹی پر بیٹھ گیا اور پھر کراچی ٹرانسفر کرالیا۔ ایک عرصہ بعد دوسری شادی کرلی۔ اب پوتے پوتیاں ہیں جب بھی یہ ہولناک سانحہ یاد آتا ہے تو دل بیٹھ سا جاتا ہے...... اور سوچتا ہوں کہ ”وہ کون تھی؟“



خونی انتقام

مہر پرویز احمد دولو۔میاں چنوں

دیکھتے ہی دیکھتے خوبرو حسینہ نے اپنا روپ بدلا اور پھر دیکھنے والے کی نگاہ میں حیرت ناچنے لگی وہ اپنی جگہ مبہوت ہو کر رہ گیا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور پھر جو منظر رونما ہوا تو......

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو پریشان ہی نہیں بلکہ نشان عبرت بنا دیتی ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

آج پھر اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا وجہ یہ تھی کہ اسے پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں دیا گیا تھا، کام سب سے زیادہ وہ کرتی جبکہ کھانا اسے کم دیا جاتا تھا۔

اس دکھ کا اظہار اس نے یوں کیا کہ عین اس وقت جب ٹھیکیدار سر پر موجود تھا اور کام شام تک ہر صورت مکمل کرنا تھا۔ جو زیادہ کام کرتی تھی اسی نے بروقت کام کرنے سے انکار کر دیا اور شیشم کے درخت کے نیچے۔ بچھی چارپائی پر جا کر سو گئی، ماں باپ منت سماجت، پیار، محبت کے ساتھ سختی پر بھی اتر آئے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اٹھنے سے صاف انکار کر دیا تنگ آ کر وہ لوگ گوشت والے سے گوشت لائے، سالن بنا کر اس کے آگے رکھا گیا تو پانچ کلو گوشت کا سالن لمحوں میں ہڑپ کر گئی۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی ٹوکری اٹھائی اور سڑک پر ریت اور بجری کی بارش کر دی پورے دن کا کام جو دس افراد نے مل

کر کرنا تھا اس باپ ایک نے گھنٹے سے بھی کم وقت میں کر دیا۔
کام مکمل ہوتے ہی باپ کو مزدوری کی مد میں دو ہزار ملے ہو وہ تو خوشی سے نہال ہو گیا بیٹی کی بلائیں لینے لگا اس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ہاتھ اور منہ چوم کر اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا۔

☆......☆......☆

بچی کیا پیدا ہوئی تھی دکھوں کے آسمان پر سکھ کا سورج اپنی تمازت سے چمک کر اس گھر میں خوشیوں کی بہاریں لایا۔ دنوں میں مہینوں کی لگتی تھی، تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ قد و قامت بڑھنے لگا سوچ فکر میں تبدیلی آنے لگی اعضاء کی حرکات کے ساتھ چلنے پھرنے کی کوشش کرنے لگی اس عجیب و غریب صورت حال سے والدین سخت حیران تھے شعور کی پگڈنڈی پر قدم رکھنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

بچوں کی ضروریات اور فرمائشیں والدین کو ہلکان کر دیتی ہیں یہ تو لگتا تھا سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی جس چیز کی خواہش کرتی منٹوں میں اس کے سامنے ہوتی ایسے کھلونے اس کے پاس تھے جو غیر ممالک میں رہنے والوں کے بچوں کے پاس بھی نہ تھے۔

والدین کو بھی عید بارات کے موقع پر پیٹ بھر کر کھانا اور پھل وغیرہ ملتے تھے جبکہ یہ لڑکی بے موسم کے پھل کھاتی تھی۔ بچے ہوئے پھل دوسرے بہن بھائیوں کے کام آتے تھے۔

اچھے پھل غذائیت والی خوراک، خوشحالی فکر و پریشانی سے دور رہنے والی ریشماں ایک امیر گھرانے کی شہزادی لگتی تھی چلتے پھرتے حسن کی دیوی لگتی جس کے سامنے دوسری لڑکیوں کا حسن ماند پڑ جاتا۔

مگر غربت سب کچھ دھندلا کر رکھ دیتی۔ امیر ماں باپ کی کالی کلوٹی بیٹی بھی پری چہرہ اور لاکھوں میں ایک ہوتی ہے لیکن غریب کی بیٹی بے شک چاند کا ٹکڑا، کنول کا کیچڑ میں کھلا پھول ہو، لیکن جب پھٹے پرانے کپڑے پہن کر نکلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے چاند کو گرہن لگا ہو۔

☆......☆......☆

اسلم غریب باپ کا بیٹا تھا، باپ کی عمر محنت مزدوری کرتے کرتے گزری ایک دن زیر تعمیر مکان کی دیوار کے سائے میں ستانے کے لئے بیٹھا تھا کہ دھڑام سے دیوار گری اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ ذمہ داری اسلم کے سر پر آن پڑی تو بچپن میں ہی مزدوری میں جت گیا اور جب جوان ہوا تو ماں کو سر پر سہرا سجانے کا شوق چڑھ آیا تو قریبی رشتہ داروں میں مناسب لڑکی دیکھ کر شادی کر دی گئی۔

اولاد کے معاملے میں اسلم کچھ زیادہ ہی خوش نصیب نکلا، یکے بعد دیگرے چار بیٹے، پانچ بیٹیاں ہو گئیں بچوں کی فوج سے گھبرانے کی بجائے خوش ہونے لگا۔ روزی روٹی کا اللہ مالک ہے غریب نے کون سا زمینوں کا بٹوارا کرنا ہوتا ہے جو اسے زیادہ بچوں کی پریشانی ہو۔ محنت مزدوری سے بچوں کی کفالت کرتا، بچوں کی وجہ سے یہ ذمہ داری بڑھ گئی تھی کہ اب اسے روز کام پر جانا پڑتا بیوی بھی ساتھ دیتی، لوگوں کے گھروں میں کام کرتے یوں پرانے کپڑے اور بچا کچا کھانا مل جاتا۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی اس دوران ایک ایسی بچی پیدا ہوئی جس نے پورے خاندان کو حیران کر دیا پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی سمجھدار بچوں کی طرح بولنا اور حرکات کرنا شروع کر دیں۔

بچپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو باپ کی مشکلات کو کم کرنے کے لئے تگ و دو کرنے لگی اسلم مزدور آدمی تھا اولاد کی کثرت سے کچھ تو اسے دن رات محنت کرنا پڑی مگر جوں جوں بچے جوان ہونے لگے اس کے مسائل کم ہوتے گئے سکھ کی ہوا اس کے گھر کے صحن میں گرد و غبار اڑانے لگی۔

اب میاں بیوی بچوں سمیت مزدوری کرتے آٹھ سو ہزار روپے آرام سے دیہاڑی کے مل جاتے۔ سب لوگوں نے مل کر گھر کو دھکیلنے کے لئے محنت مزدوری شروع کر دی۔

شہر سے گاؤں تک پختہ سڑک بننے کا اعلان ہوا تو کتنے ہی غریبوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ اب انہیں مزدوری کے لئے دوسرے گاؤں یا شہر نہ جانا پڑتا اور نہ ہی مزدوری کے لئے کام ڈھونڈنا پڑتا۔

کام شروع ہوا تو مزدوروں کا جم غفیر جمع ہوگیا اسلم بھی وہاں پہنچ گیا ہمراہ فیملی پختہ سڑک پر کام کرنے لگا۔

پہاڑی علاقے سے پتھر لانے والے ٹرک خالی کرنے کے لئے ہزار روپے مزدوری ملتی ایک دن ٹرک والوں کو جلدی تھی انہوں نے دوسرا پھیرا جلدی لانا تھا مزدور نہ مل سکے تو انہوں نے اسلم کی منت کی جس کی مزدور ٹیم میں بارہ افراد ایک ہی گھر کے شامل تھے کہ ٹرک خالی کرو ہم آپ کو تین ہزار روپے دیں گے جبکہ یہی تین ہزار دوسرے کام میں دو دن بعد ملنے تھے۔

اسلم نے دو بیٹوں اور ریشماں کو ساتھ لیا اور ٹرک خالی کرنے لگا۔ تھک کر اسلم نیچے اترا پانی پینے لگا بیٹے پہلے ہی نیچے اتر چکے تھے اوپر صرف ریشماں تھی جب وہ لوگ دوبارہ ٹرک کے پاس آئے تو ریشماں پورا ٹرک پتھر سے خالی کر چکی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی تین ہزار ملتے ہی وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگے۔

سڑک پر مزدوری کرتے کافی دن ہو گئے جس دن ٹرک خالی کر کے پیسے کمائے تھے اس کے بعد انہوں نے سڑک کے کام کا بھی ٹھیکہ لینا شروع کر دیا۔

مخصوص لمبائی تک سڑک پر پتھر اور بجری بچھانے کا ٹھیکہ لے لیتے، یوں جو دیہاڑی ہزار، پندرہ سو روپے بنتی تھی۔ وہی اب دس ہزار میں تبدیل ہوگئی۔

پیسے آنے پر اسلم نے اب کچھ کنجوسی کرنی شروع کر دی، سارا دن کام کرتے شام کو وہی دال روٹی، دن کو بھی گوشت پکتا۔ ریشماں کے حصے میں ایک آدھ بوٹی آتی جبکہ اسی کے کام کے سہارے پر اب وہ لوگ ٹھیکیدار بن کر ہزاروں روپے روز کما رہے تھے۔

☆......☆......☆

آج پھر عین دوپہر کے وقت جب کام زوروں پر تھا ٹھیکیدار سر پر کھڑا تھا سڑک کے اس حصے کو شام تک لازمی پتھر سے پر کرنا تھا۔ کل اس پر تارکول ڈالنی تھی مگر ریشماں نے سر کو پکڑا اور درخت کے نیچے چارپائی پر جا کر سو گئی کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''کام میں سب سے زیادہ کروں اور پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو، کیوں؟''

''مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے، جب تک یہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاؤں گی کام پر نہیں جاؤں گی۔ دھنیا اور ہرے مرچ کی چٹنی اور نمک والی لسی پی کر میں ہرگز کام نہیں کر سکتی۔''

اسلم سخت پریشان تھا۔ اگر ریشماں کام نہ کرتی تو وہ سب مل کر بھی یہ کام شام تک مکمل نہ کر پاتے۔

پہلے تو میاں بیوی نے اس کی منت سماجت کی، پیار، محبت سے سمجھایا۔ جب نہ مانی تو جھڑکا، دھمکی دی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''جب تک پیٹ بھر کر کھانا وہ بھی گوشت کے ساتھ نہیں کھاؤں گی کام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔''

آخر مجبور ہو کر اسلم نے گوشت والے سے پورا پانچ کلو گوشت لیا اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی مشکل سے آدھ کلو کھا سکے گی آج شرمندہ کروں گا مگر جب پانچ کلو گوشت پکا کر اس کے آگے رکھا گیا وہ دونوں ہاتھوں سے کھانے لگی اور پانی اس وقت مانگا جب پانچ کلو گوشت چٹ کر چکی تھی کھانے کے بعد دو چار ڈکاریں لیں اٹھ کھڑی ہوئی سب لوگوں کو کہا۔

''میں نے آج پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اس مہربانی کے بدلے تم سب لوگ یہاں چھاؤں میں بیٹھو میں اکیلی کام کروں گی تم کو ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہیں۔''

ٹوکری اٹھائی اور پتھر ڈھونے میں لگ گئی یوں لگتا تھا ٹوکری کو پہیے لگ گئے ہوں یا ہوا میں اڑ رہی ہو ٹوکری میں پتھر کی بجائے پھولوں کی پتیاں لگتی تھیں جن کو اٹھانے میں اسے زور صرف کرنے کی بجائے خوشبوؤں سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ہو۔

دس بندوں کا کام اس نے اکیلے ہی گھنٹے سے بھی کم وقت میں کر دیا یوں لگتا تھا کہ پتھر خود اڑ اڑ کر سڑک پر گر رہے ہوں۔'' ٹھیکیدار اور دیگر مزدور سب دیکھ کر حیران تھے کام جلدی ختم کرنے کی خوشی میں پانچ سو انعام ملے۔

اب تو اسلم دن رات دونوں ہاتھوں سے پیسے سمیٹنے لگا۔

ان گنت روپوں کے آنے کی دیر تھی کہ اسلم کے تیور بدلنے لگے خود ٹھیکیدار بن گیا بیوی بچوں کو کام پر بھیج دیتا خود نہا دھو کر گاؤں میں مٹر گشت کرتا ہوٹل پر بیٹھ کر چائے پیتا گاؤں کے چوک میں تاش کے پتوں پر جوا کھیلتا آوارہ دوستوں کا حلقہ بڑھنے لگا اب نشہ بھی کرنے لگا۔

کل کا غریب مزدور سارا دن پختہ سڑک پر پتھر ڈھونے والا اوباش لوگوں کا سرغنہ بن گیا اب تو باقاعدہ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو تنگ کرنا شروع کردیا کل پرزے ایسے نکلے کہ اپنی جوان بیٹیوں کا بھی خیال نہ رہا غیرت چھو کر کے گزر گئی باندھے انسان کی مانند ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے فرق کا خیال نہ رہا ہر وقت نشے میں ٹن رہتا۔

”نشہ اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ آدمی ہوش سے بیگانہ ہوجاتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے اور رشتوں کا احساس نہیں رہتا۔“

لیکن افسوس آج کا نوجوان نشہ کرکے فخر سے نمائش کرتا ہے اور بڑھکیں مارتا ہے آوارہ لوگوں کے دوست بھی انہیں کی طرح معاشرے کے ماتھے پر کلنک کی مانند ہوتے ہیں۔ ہر عزت دار آدمی ان کے شر سے بچنے کی کوشش کرتا ہے کوئی بھی معزز آدمی ان کے منہ نہیں لگتا ان کو ماریں تو بھی بے عزتی اور ان سے مار کھائیں تو بھی بے عزتی۔

☆......☆......☆

مرید کا ڈیرہ اور زمینیں گاؤں سے باہر تھیں کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے دن رات ڈیرے پر رہتا جبکہ بیوی کوثر کھانا ڈیرے پر پہنچاتی دودھ وغیرہ گھر لاتی زندگی کی صبح و شام کا پہیا ایسے ہی چل رہا تھا۔

ایک دن کوثر جب ڈیرے پر کھانا لے کر جارہی تھی تو اسلم کے ایک مخبوط الحواس دوست نے اس کا راستہ روک لیا۔ پیار و محبت جتانے لگا دوستی کی صورت میں اس کی تمام تر خواہشات کی تکمیل کی پیشکش کی جبکہ انکار کی صورت میں بیچ چوراہے پر بے عزت اور برہنہ کرنے کی دھمکی دی اتنا سننا تھا کہ کوثر نے دودھ کا کٹورا اور کھانا زمین پر رکھا پاؤں سے جوتا اتارا اور نواز پر تھپڑوں، گالیوں اور جوتوں کی بارش کردی۔

راستے سے گزرنے والے یہ تماشہ دیکھ کر حیران رہ گئے اسلم کا دوست ہونے کی وجہ سے نواز اور اس جیسے دیگر لوگوں کی پہلے بھی کوئی عزت نہ تھی یہاں تو راہ سے گزرنے والوں نے بھی دو چار تھپڑ مارنے ثواب سمجھا غرض خوب مار کھانے کے بعد نواز بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا وہاں سے بچ کر سیدھا اسلم کے پاس آیا اور تمام واقعات اسے سنائے بدلہ لینے کے لئے اس سے مدد مانگی۔

فیصلہ یہ ہوا جب کوثر ڈیرے پر جائے گی راستے میں گھات لگا کر بیٹھیں گے اسے اغواء کرکے دوسرے گاؤں لے جائیں گے۔ سارے دوست اس کی عزت کی دھجیاں اڑائیں گے موبائل سے عریاں تصاویر بنا کر اسے گاؤں میں بے عزت کریں گے۔

دوپہر کے واقعات کا جب کوثر کے گھر والوں کو پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ نواز اسلم کے گھر پر ہے وہ لوگ اکٹھے ہوکر وہاں پہنچ گئے اور اسلم سے کہا۔ ”اسے باہر نکالو، لیکن اسلم نے دوسرے دروازے سے بھگا دیا۔

ان لوگوں نے اسلم سے کہا۔ ”اگر نواز یہاں گاؤں میں دوبارہ نظر آیا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اس کی دوستی چھوڑ دو۔“

یہ دھمکی دے کر سب حضرات واپس گھروں کو لوٹ گئے۔

”شام کو کوثر اس کی والدہ، ساس اور بہن ایک بار پھر اسلم کے گھر گئیں اس کی بیوی اور بیٹیوں کی منت سماجت کی گئی، اسلم کو سمجھاؤ برے لوگوں کے ساتھ مل کر ہمیں بدنام نہ کرے ہم بھی آپ کی طرح اس کی بیٹیاں ہیں جس کی اپنی بیٹیاں ہوں اسے کسی دوسرے کی ماں بہن کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔“

یہ لوگ واپس پلٹے ہی تھے کہ نواز آ گیا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔

بیٹی ریشماں نے دروازہ کھولا تو نواز کو دیکھتے ہی اسے دھتکار دیا گالیوں کی بوچھاڑ کردی اور دروازہ بند کردیا شور سن کر اسلم دروازے پر آ گیا اور پوچھا۔

”کون ہے؟“

ریشماں نے کہا۔ ”نواز ہے۔“

یہ سنتے ہی اسلم نے فوراً دروازہ کھولا اسے اندر بلایا اور بیٹی کو دو تھپڑ مار دیئے کہ دوست کی بے عزتی کیوں کی ہے؟"

ریشماں واپس تو چلی گئی مگر اس کے اندر جوار بھاٹا سر اٹھانے لگا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

نواز کے لئے کھانا تیار کیا گیا کھانے کے بعد صحن کے ایک کونے میں چارپائیوں پر اسلم اور نواز کھسر پھسر کرنے لگے۔

کوثر کو اغوا کرنے کے بارے میں حتمی پلان تیار کرنے لگے۔

اس دوران ریشماں وہاں آ گئی باپ کے پاؤں میں بیٹھ کر دہائیاں دینے لگی۔

"آپ پانچ بیٹیوں کے باپ ہیں عزتوں سے تمہارا گھر بھرا پڑا ہے کوثر بھی ہماری عمر کی ہے اسے بیٹی سمجھیں اور اس کی عزت سے نہ کھیلیں اگر کوئی ہماری عزت سے کھیلے تو آپ کو اچھا لگے گا ویسے بھی اگر اپنی عزت کا تحفظ چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت کی طرح عزیز سمجھو۔"

"ہم جب تک انتقام نہیں لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے، ان لوگوں نے بیچ چوراہے پر میرے دوست کی ہتک کی ہے مارا پیٹا ہے اس کی عزت کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں تم میرے کسی کام میں مداخلت نہ کرو میرا باپ بننے کی کوشش نہ کرو جاؤ سو جاؤ۔" اسلم نے بیٹی کو جواب دیا۔

منصوبہ یہ پاس ہوا کہ کل دوپہر ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے کوثر کو اغوا کر کے دوسرے گاؤں لے جائیں گے۔

اگلے دن اسلم اور نواز راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے جونہی کوثر گزرنے لگی۔ یکدم سامنے آ گئے کوثر کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا گاڑی کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا دونوں نے اٹھایا گاڑی میں ڈالا اور دوسرے گاؤں روانہ ہو گئے۔

وہاں ان جیسے اوباشوں نے کمرے میں بستر لگا رکھا تھا کھانا اور شراب وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔

کوثر کو کمرے میں لائے بستر پر دھکیل دیا خود باہر کھانا وغیرہ کھانے لگے۔

شراب وغیرہ پی اور سب سے پہلے اسلم کو کمرے کے اندر بھیجا گیا کہ "جاؤ! ہوس کی پیاس بجھاؤ اس کی عزت کو تار تار کر دو اس نے ہمارے دوست کی بیچ چوراہے پر بے عزتی کی ہے۔"

اسلم جب اندر داخل ہوا تو کوثر منہ گھٹنوں میں چھپائے زار و قطار رو رہی تھی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوپٹہ سر سے اتار کر دور پھینکا قمیض تار تار کر دیا پھر دونوں ہاتھوں سے منہ اوپر کر کے اپنی طرف کیا تو چہرہ دیکھتے ہی اس کے اٹھائیس طبق روشن ہو گئے۔

وہ کوثر نہیں اس کی اپنی بیٹی ریشماں تھی جو قمیض نہ ہونے کی وجہ سے باپ کے سامنے برہنہ بیٹھی تھی۔

یہ دیکھتے ہی اسلم غش کھا کر گرا اور پھر نہ اٹھا۔

ریشماں کی آنکھوں سے غصے کی وجہ سے شعلے نکلنے لگے۔ جنہوں نے پورے گھر کے درودیوار کو آگ کی طرح لال کر دیا لوہے کی طرح دیواریں تپنے لگیں، ایک بہترین باحیا لباس پہنے باہر نکلی آنکھیں آگ کے انگارے برسا رہی تھیں جدھر نظر جاتی مٹی میں بھی آگ لگ جاتی۔

وہاں پر دیگر لوگ آگ کی تپش کی وجہ سے تلملانے لگے، پاؤں کے نیچے انگارے دہکنے لگے دروازے کی طرف بھاگے تو سامنے انگاروں پر بچھو چل پھر رہے تھے جبکہ دروازے پر ایک بہت بڑا اژدھا منہ کھولے کھڑا تھا۔

واپس پلٹے تو ریشماں کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں نے انہیں جلا کر کوئلوں میں تبدیل کر دیا۔

یہ کوئلے پانی میں تبدیل ہو کر گندی نالی میں بہنے لگے۔

جبکہ ریشماں ایک حور کی طرح خوب صورت لباس پہنے پروں کی مدد سے پرواز کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

جبکہ کوثر دودھ کا مٹکا سر پر رکھے ڈیرے سے گھر کی طرف آ رہی تھی اسے ان واقعات کی دور دور تک خبر نہ تھی۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 139

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

بدحواسی کے عالم میں سرندر باہر نکلا اس پر جیسے کپکپی طاری تھی، وہ بولا لونڈیا نے خود کو گولی مار لی، اوئے کسی کو کانوں کان خبر ہوا سے لے جا کر کہیں گڑھا کھود کر دبا دو، اور گوپی کے بچے اگر تو نے کسی کے سامنے منہ کھولا تو اپنا حشر اپنے گھر والوں اور اپنی جوان بیٹی کا حشر یاد رکھنا، تیرے سامنے جو نہ ہونے والا ہے، وہ ہو جائے گا۔ چل جلدی سے بھاگ جا اور مرتے دم تک اپنی زبان بند رکھنا۔ یہ سنتے ہی گوپی سر پر پاؤں رکھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ اس کے بعد سرندر کے چمچوں نے شلپا کی لاش اٹھا کر ایک طرف کو چل پڑے اور ڈیرہ سے تھوڑی دور پیپل کے درخت کے نیچے ایک گہرا گڑھا کھود کر اس میں دبا دیا۔ دو دن تک سرندر شانت رہا اس کے بعد تیسری رات آئی تو اس نے پھر سے اپنی عیاشی شروع کر دی۔ کمرے میں ایک جوان لڑکی برہنہ پڑی تھی اور وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا کہ اچانک کمرے میں ایک خوفناک سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ سانپ کی پھنکار سے کمرے میں لگے دبیز پردوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سرندر یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا اس کی گھگھی بندھ گئی اور لڑکی تو بدحواس ہو کر بے ہوش ہو گئی اور اس طرح سرندر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس کے بعد یہ تواتر سے ہونے لگا۔ جب بھی سرندر کسی لڑکی کو اپنے کمرے میں لاتا تو وہ سانپ عین وقت پر آ دھمکتا اور سرندر کا پروگرام چوپٹ ہو جاتا۔ ایک روز کسی بھلے آدمی نے سرندر کو بتایا کہ دہلی میں حکیم وقار کے مطب میں چلے جاؤ۔ مطب میں ایک حکیم صاحب جن کا نام حکیم کامل ہے انہیں رولوکا بھی کہتے ہیں وہ تمہارا مسئلہ ٹھیک کر دیں گے۔ سرندر رولوکا سے ملا تو رولوکا نے سرندر کو دوسرے دن بلایا مگر اسی رات شلپا کی آتما رولوکا کے پاس آئی اور پوری کہانی سنائی اور بولی۔ مہاپرش میں نے سرندر کو مار دیا، کل آپ یقیناً مجھ سے اس کی جان چھڑا دیتے اور پھر وہ پاپی اپنے کرتوتوں میں لگ جاتا، اس نے میری عزت لوٹی تھی اور پیپل کے درخت کے نیچے میری لاش کو دبوا دیا تھا۔ آپ کی مہربانی ہوگی کہ آپ میری لاش نکلوا کر میرے لوگوں سے کریا کرم کروا دیں۔ اور اس طرح رولوکا نے شلپا کی آخری خواہش کا احترام کرایا۔ اس کے بعد احسن اپنی بہن انیلا کے مسئلے کے لئے رولوکا کے پاس پہنچا اور خواہش ظاہر کی کہ آپ میری بہن کا حال معلوم کریں کہ اس کا مسئلہ ٹھیک ہو گیا ہے تو رولوکا نے کہا۔ بزرگ نے تمہاری بہن کا مسئلہ ٹھیک کر دیا ہے۔ آئندہ کوئی بدروح آپ کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گی اور احسن رولوکا کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا اور گھر والوں کو بتایا تو گھر والے خوش ہو کر رولوکا کو دعائیں دینے لگے۔

(اب آگے پڑھیں)

میں ایک استاد ہوں، حال ہی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور ایک گورنمنٹ کالج میں استاد کی حیثیت سے طالب علموں کو علم کی روشنی سے ہمکنار کرنے لگا۔ میرا نام سجاد ہے اور میرے دو عدد بہترین اور جگری دوست علی اور محسن ہیں، ہم تینوں نے ڈگری کا امتحان اکٹھے پاس کیا اور پھر قسمت نے ایک بار پھر ہم تینوں کو اکٹھا ہی رکھا یعنی کہ ہم تینوں ہی گورنمنٹ کالج میں استاد ہیں۔ چند ماہ قبل ہماری پوسٹنگ ہمارے شہر سے دور ایک وادی کے گورنمنٹ کالج میں ہو گئی۔ اس کالج کا ہاسٹل ذرا چھوٹا تھا جس کی وجہ سے باہر سے آنے والے پروفیسروں کو رہائش کا انتظام خود ہی کرنا پڑتا تھا، چنانچہ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد آخرکار ہم کالج کے صدر دروازے پر موجود تھے۔ کالج کی صورت حال کا ہمیں پہلے سے علم تھا۔ چنانچہ اپنے آنے کی



اطلاع دینے کے بعد ہم کرائے کے مکان کے بارے میں معلومات لینے لگے۔

کالج سے کافی دور ایک چھوٹا سا گاؤں حسن آباد تھا۔ وہاں کے ایک کسان نے ہمیں دو ہزار روپے ماہوار پر ایک مکان دے دیا۔ اور ہمیں خاص طور پر ہدایات کی کہ گاؤں کے آخر میں ایک قبرستان ہے وہاں مت جانا ورنہ کسی قسم کے نقصان کے ذمے خود خود ہوگے، ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ اس لئے فوراً ہی اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوگئے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد نیند سے بیدار ہوئے اور مکان میں اپنے رہائش کے ساز و سامان کی ترتیب درست کی۔ اس کے وقت تقریباً رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس لئے میں اور محسن بازار جانے کے لئے تیار تھے اور ہمارا پروگرام علی کو گھر ہی پر چھوڑ دینے کا تھا کیونکہ ہم اس علاقے کے بازار میں پہلی دفعہ جا رہے تھے جبکہ علی کو گھومنے کا بڑا شوق تھا۔ اگرچہ وہ ہمارے ساتھ جاتا تو پھر ہم پوری رات بازار میں ادھر ادھر گھومنے میں ہی گزار دیتے لیکن مرتے کیا نہ کرتے آخر کار علی کی ضد کے آگے مجھے اور محسن کو سر جھکانے ہی پڑے۔

بہرحال ہم بازار کی زیادہ چہل پہل میں دور تک نہ گئے۔

رات کے کھانے کے لئے روٹیاں تو ہم نے ایک تندور سے پکی پکائی لے لیں اور ایک کلو مرغی کا گوشت لے کر محسن کے سر منڈھ دیا تاکہ وہ گھر جاکر اچھی طرح روسٹ کرے، تھوڑا بہت ڈرائی فروٹ لیا۔ کیونکہ یہاں پر سردی دن کو ہی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ تو رات کو کیا حال ہوتا ہوگا اس کے بعد ہم لاری اڈے پر گئے اور تقریباً ایک گھنٹے بعد گاؤں کی سر زمین پر دوبارہ قدم رکھ چکے تھے۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ جاتے ہی انگیٹھی جلائی اور گرم لحاف میں گھس گئے، جبکہ محسن مرغی کو روسٹ کرنے میں مصروف تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم تینوں نے گرم گرم تندوری روٹیوں کے ساتھ روسٹ شدہ مرغی نوش فرمائی۔ اس کے بعد دیر تک ہم علی کے موبائل کے ذریعے مختلف قسم کا میوزک سنتے رہے اور گاؤں کے بارے میں خیالی جائزہ لیتے رہے۔

اچانک محسن نے ہم دونوں کو مخاطب کرکے پوچھا، یار وہ بوڑھا کسان کیا اول فول بک رہا تھا کہ قبرستان کے پاس مت جانا، ورنہ کسی بھی قسم کے نقصان کے ذمے دار تم خود ہوگے، بھلا اس جدید دور میں بھی ان بھوت ووت اور روحوں، چڑیلوں کا وجود ہوتا ہے۔

اور ہم دونوں اس کی بات پر قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔

انگیٹھی میں موجود تمام لکڑیاں راکھ میں تبدیل ہوچکی تھیں اور سردی نے مزید زور پکڑ لیا تھا۔ میں نے علی کو مخاطب کرکے کہا۔ یار...... ذرا باہر دیکھ ہوسکتا ہے کہ کسان نے صحن میں کسی جگہ لکڑیاں رکھی ہوں۔

وہ باہر گیا اور مکان کے صدر دروازے کے پاس موجود دیوار کے ساتھ پڑی لکڑیاں اٹھا لایا اور ایک ایک کرکے انگیٹھی میں ڈالنے لگا۔ اب ایک بار پھر سے سردی کی لہر کم ہوگئی تھی۔ رات کافی ہوچکی تھی اس لئے ہم سو گئے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے ہم پر نیند کی دیوی جلد ہی مہربان ہوگئی اور ہم نیند کی وادی میں دور تک نکلتے چلے گئے۔

صبح سب سے پہلے محسن کی آنکھ کھلی اور اس نے ہم دونوں کو بیدار کیا، ہمارے پاس اتنا زیادہ خورد و نوش کا سامان نہ تھا، بہرحال اتنا تھا کہ اس سے ناشتہ کیا پھر کالج کے لئے تینوں دوست ایک دوسرے کی قیادت میں روانہ ہوگئے۔ کالج پہنچنے پر کالج اسٹاف نے ہمارا تہہ دل سے استقبال کیا۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔

تقریباً دوپہر ایک بجے کالج سے چھٹی کی، کالج کے قریب ہی ایک اکیڈمی تھی۔ اکیڈمی کے سربراہ نے ہمیں دعوت نامہ دیا اور ہم نے قبول کرلیا۔ اب ہمارا معمول تھا کہ کالج سے چھٹی کے بعد طالب علموں کو دو بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک ٹیوشن پڑھانا پڑتا، ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگیا۔ ایک ماہ بعد تنخواہ ملی تو ہم تینوں دوستوں نے پیسے ملا کر ایک عدد گاڑی خرید لی تاکہ آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ چھٹی کے دن ہم تینوں

گھومنے بھی جاتے تھے۔ ایک دن ہمیں ایک شارٹ راستہ جو کہ قبرستان کے ساتھ سے گزرتا تھا کا علم ہوا۔

چنانچہ ہم اس راستے سے گھر آنے لگے تو ٹائم کی بھی بچت ہوگئی۔ قبرستان کی حالت ذرا شکستہ تھی اور قبرستان میں خوفناک واقعات ہونے کے سبب قریبی لوگوں نے اپنی رہائش تبدیل کرلی تھی۔ اب قبرستان اور اس کے اردگرد واقع مکان، ہڑپہ اور موہن جوداڑو سے مشابہت رکھتے تھے۔

مگر ہم تینوں نے ان توہم پرست قسم کی گفتگو پر کوئی دھیان دیا اور اس طرح کی باتوں کو سن کر ایک کان میں ڈال کر دوسرے سے نکال دیا۔ ایک رات ہمیں کافی پاؤڈر لینے بازار جانا پڑا، پہلے تو محسن نے ہمیں منع کیا کہ مت جاؤ۔ لیکن علی کے اصرار پر ہم تینوں چل پڑے کہ اب تو گاڑی بھی اپنی ہے کیا فرق پڑتا ہے، جلد ہی واپس آجائیں گے۔ چنانچہ ہم نے بازار میں کافی پاؤڈر خریدا اور گھر جانے کے لئے روانہ ہوگئے۔ ڈرائیونگ علی کررہا تھا اور ہم دونوں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ کر نمکو کھا رہے تھے۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد علی نے ہمیں مخاطب کیا۔

دوستوں میرے خیال سے ہمیں Right والے راستے کے بجائے Left والے راستے سے جانا چاہئے کیونکہ وہ مختصر ہے جبکہ Right والا طویل، رات بھی بہت ہوگئی، ابھی گھر جاکر کافی بھی تو تیار کرنی ہے، اور ہم دونوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملادی۔ اب گاڑی قبرستان والے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ جب ہم عین قبرستان کے ساتھ سے گزرے، گاڑی ایک دم زوردار جھٹکے سے بند ہوگئی۔ ہم تینوں نے کار کا جائزہ لیا۔ لیکن بظاہر ہمیں کوئی خرابی نظر نہ آئی، شدید سردی، ویران مقام اور سامنے خوفناک روایات کا حامل قبرستان، سب خطرات کے باوجود ہم ڈر کو پس پشت ڈال کر سوچنے لگے۔

سخت سردی کی لہر ہمارے جسموں میں سرایت کرگئی۔ علی کار کا جائزہ لے کر ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کہ ہم دونوں ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں ادھر ادھر گھوم کر آگے پیچھے دیکھنے لگے۔ ہمارے سامنے جھاڑیاں اور درخت بکثرت تھے۔ اس قبرستان میں قبریں تقریباً 90,80 سال پرانی تھیں جو کہ بڑی عجیب طرز کی تھیں اور اکثر قبریں بڑی عجیب طرز کی تھیں۔

علی نے مجھے مخاطب کیا۔ ''سجاد ذرا گاڑی اسٹارٹ کر۔'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کی تو پھر گاڑی چند منٹ کھر کھر کی آواز نکالنے کے بعد بند ہوگئی۔

محسن بولا۔ اوئے کیا مصیبت ہے۔ اس کھٹاری گاڑی کو یہاں ہی آکر خراب ہونا تھا۔ تھوڑی آگے بند ہوتی تو ہم پیدل گھر چلے جاتے۔ پر اب یہاں سے ہمارے گھر تک اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ پیدل جانا ممکن نہیں اور اب تو سردی نے بھی شدت اختیار کرلی ہے۔

یکا یک ایک عجیب قسم کی کیفیت نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ پر ہم نے خود کو تسلی دی کہ قبرستان کے بارے میں لوگوں نے جو الٹی سیدھی افواہیں پھیلا رکھی ہیں۔ ہم ان کی وجہ سے خواہ مخواہ دہشت زدہ ہورہے ہیں۔ اچانک ہمیں قبرستان کے وسط سے کسی لڑکی کی چیخ و پکار کی آواز آئی۔ ہم فوراً چونک پڑے، اتنی رات میں ایک لڑکی قبرستان میں اور پھر ہم پر واقعی دہشت طاری ہونے لگی۔

بہرحال ہم تینوں ایک لمحے کے لئے سنبھلے ہی تھے کہ محسن فوراً بولا۔ ''یار سجاد ہمیں لڑکی کی مدد کرنی چاہئے، شاید وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے، علی نے بھی محسن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں بھی بنا سوچے سمجھے ان دونوں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہوگیا۔ اچانک قریبی درخت سے کسی الو کی آواز نے خاموشی کو توڑ ڈالا، ایک لمحے کے لئے تو ہمیں ایسا لگا جیسے یہ قبرستان سچ مچ بھیانک ہے اور یہ قبریں ہم تینوں کو زندہ دبوچ لیں گی، بہرحال ہم نے ایک دوسرے کو حوصلہ دیا، لڑکی کی چیخ و پکار مسلسل آرہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے کہ اسے کوئی اذیت دے رہا ہو، ہم تینوں نے رفتار تیز کردی اور بالآخر ہم قبرستان کے وسط میں پہنچ گئے، جیسے ہی ہم

تینوں نے ادھر نظر گھمائی، ہم دنگ رہ گئے، ہمارے بائیں جانب ایک دوشیزہ جس کا ایک ہاتھ ایک قبر کے اندر تھا اور باقی بازو باہر وہ اپنے بازو کو زور زور سے باہر کی جانب کھینچ رہی تھی۔ جیسے اندر سے اس حسینہ کا ہاتھ کوئی کھینچ رہا ہو۔ ہم تو ایک لمحے کے لئے اس کے حسن میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئے تھے اور اسے ایسے ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ انسان نہیں بلکہ کوئی اور ہی مخلوق ہو۔ مگر اس نے جب زور سے کہا۔

''میری مدد کرو، بچاؤ، مجھے بچا.....لو۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ ہم تینوں اس کی طرف ایسے بھاگ کھڑے ہوئے، جیسے کوئی مالک اپنے کتے کو بلانے کے لئے سیٹی مارتا ہے۔ سب سے آگے محسن تھا۔ محسن نے فوراً اس کا بازو کھینچا ساتھ میں ہم دونوں نے بھی مدد کی۔ ہم تینوں نے جب اس کا بازو چھوا تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے گلیشیر کے کسی برفانی تودے کو پکڑا ہو، اتنا سرد...... جیسے فل ڈگری پر اے سی لگا ہو۔ اور آگے اوپر سے سردی بھی بہت زیادہ تھی۔ بہرحال ہم تینوں اس دوشیزہ کا قبر سے ہاتھ نکالنے میں کامیاب ہوگئے اب وہ اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ تھوڑا زخمی ہو چکا تھا۔ مگر اتنا زیادہ نہیں، بس معمولی خراشیں آئی تھیں۔

میں نے پری چہرے کو مخاطب کرکے پوچھا۔

''آپ اس وقت؟ اس پراسرار قبرستان میں! اتنی رات گئے، اور آپ کا ہاتھ قبر کے اندر کیسے گیا؟ یہ کیا معاملہ ہے۔'' علی نے بھی یہی کہا۔ میڈم یہ کیا ماجرا تھا جبکہ محسن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ پھر بولا۔ ''مس آپ کا نام کیا ہے۔'' ہم تینوں نے ایک دم اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ شاید وہ اسی لئے ہم تینوں کو دیدے پھاڑ، پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ ہمارا خیال تھا مگر ماجرا اس کے برعکس نکلا وہ الٹا ہم تینوں کو دیکھ کر اور ہمارے سوال سن کر ایسے مسکرانے لگی کہ جیسے فلم میں ہیرو، ہیروئن کو ''آئی لو یو'' بولتا ہے تو وہ جھٹ سے شرمانے لگتی ہے۔ مگر اس کا جواب ہماری سوچ کے برعکس تھا، اس نے ہمیں مخاطب کیا اور بولی۔ ''آپ سب کے سوالوں کا جواب ایک ہی ہے۔

غلط نہیں زمانے میں لاجواب ہیں ہم
سمجھ سکا نہ کوئی وہ کتاب ہیں ہم

محسن نے جواباً کہا ارے میڈم تو پھر آپ اپنی زندگی کی کتاب میں سے چند الفاظ ہمارے گوش گزار بھی کردیجئے۔

یکایک اس دوشیزہ کی آنکھوں سے ایک ایسی روشنی نکلی کہ جیسے گھپ اندھیرے میں ہر طرف اچانک فل روشنی ہوجائے تو آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ مگر ہماری آنکھوں کو کچھ نہ ہوا۔ بلکہ ہمارا دماغ گھوم گیا اور ایسا لگا جیسے ہم بے ہوش ہو رہے ہوں۔ ہمارے ذہنوں پر تاریکی چھانے لگی۔ اور آہستہ آہستہ ہم تینوں زمین پر گر پڑے۔

خدا جانے کتنی دیر بے ہوش رہے جب ہوش آیا تو ہم ایک گھنے جنگل میں ایک بڑے برگد کے درخت کے نیچے پڑے تھے۔ برگد کے درخت کے ساتھ ایک عدد چشمہ جاری تھا۔ جنگل کے چاروں طرف خوب صورت دلکش پہاڑ تھے۔ ہم چند منٹوں کے لئے سکتے کے شکار ہوگئے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ ہم یہاں کیسے؟ یہ کون سی جگہ ہے آخر......؟

اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ علی نے ہم دونوں کو مخاطب کیا۔ ''یار مجھے لگتا ہے کہ گاؤں والوں کی باتیں درست تھیں کہ یہ قبرستان آتماؤں کا مرکز ہے اور ہم انہی شیطانی آتماؤں کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔''

بہرحال میں نے علی اور محسن کو مخاطب کیا اور کہا کہ ''ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنے کی راہ تلاش کرنی چاہئے کیوں نا ہم جس جگہ کھڑے ہیں یہاں سے کسی ایک سمت منتخب کریں اور چل پڑیں۔ جو راستہ بھی اختیار کریں گے وہ کہیں نہ کہیں تو جائے گا...... ویسے بھی یہاں ٹھہرنے سے تو بہتر ہے اور ہمارے چاروں سمت گھنا جنگل ہے۔ اگر ہم نے ابھی کچھ نہ کیا تو یہیں پڑے پڑے مر جائیں گے۔ چنانچہ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے ہم نے شمال کی جانب رخ کیا اور چل پڑے، ابھی دو تین قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ مغرب کی

جانب سے غالباً کسی لڑکی کی چیخ و پکار کی آواز آئی۔

محسن فوراً بولا۔ ”یار یہ اسی لڑکی کی آواز ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا، ہم تینوں اسی لڑکی کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔ چلو اس طرف۔“ ہم تینوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً مغرب کی سمت دوڑ لگا دی۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ بہر حال ہم نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل فاصلہ طے کرتے رہے۔ آخر ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم اس لڑکی تک پہنچ گئے۔ اب کی بار وہ لڑکی ایک درخت پر چڑھی ہوئی تھی جبکہ نیچے دو شیر دھاڑ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ۔ ”اے لڑکی ایک بار صرف ایک بار نیچے آ جا پھر دیکھ تماشا“ میں نے کہا۔ یار ہمیں اس لڑکی کی مدد کرنی چاہئے، لیکن محسن نے ہمیں روک لیا۔ ”نہیں سجاد، یہ لڑکی ضرور کوئی چڑیل یا بھٹکی آتما ہے آگے بھی ہم نے اس کی مدد کی تھی اور اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ اگر اس بار مدد کی تو یہ دونوں شیر لڑکی کی جگہ ہمیں کھا جائیں گے۔ یہاں سے چلتے بنو۔“

مگر علی نے کہا۔ محسن ہم یہاں سے اس لڑکی کے بنا نہیں نکل سکتے کیونکہ ہم اس لڑکی کی وجہ سے ہی یہاں آئے ہیں، یہ ضرور کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی اور یہی ہماری مدد کر سکتی ہے۔ چلو اس کی کسی طریقے سے مدد کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہم شیروں سے بنا کسی ہتھیار کے کیسے مقابلہ کریں گے؟“

ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک وہ دونوں شیر زور سے دھاڑے ہم ان کی جانب متوجہ ہوئے لیکن جو کچھ ہم نے دیکھا وہ ہماری آنکھوں کو یقین نہ آیا، وہ دونوں شیر ایک دم سے غائب ہو گئے، اب لڑکی دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگی، ہم تینوں لڑکی کی طرف بھاگے، محسن نے درخت کی سوکھی ہوئی ایک موٹی شاخ زمین سے اٹھائی اور لڑکی کے قریب جا کر بولا۔

”میڈم آپ کا تعلق کون سی دنیا سے ہے، آپ کوئی آتما ہو، کوئی چڑیل ہو یا پھر کچھ اور، ہمیں اتنا تو یقین ہے کہ آپ انسانوں میں سے تو نہیں ہیں، کیونکہ ہم نے آپ کی مدد کی اور الٹا آپ نے ہمیں اس جنگل میں لا کھڑا کیا اگر ابھی اسی وقت آپ نے ہماری مدد نہ کی اور ہمیں جہاں سے اس جگہ لائی ہیں وہاں واپس نہ پہنچایا تو مجھے اپنے دونوں دوستوں کی قسم اس لاٹھی سے مار مار کر آپ کے دماغ کا بھرتا نکال دوں گا۔“

لڑکی نے دھیرے سے ہمیں مخاطب کیا۔ ”دیکھو میں جانتی ہوں کہ تم میری وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو، لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب ملے گا۔ لیکن اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔“ علی نے پوچھا۔ ”کہاں......؟“

”میری ملکہ کے محل میں اسی کے حکم پر میں تمہیں یہاں لائی ہوں۔ اس سے آگے سب کچھ وہ خود ہی بتائیں گی۔“ چنانچہ ہم تینوں اس کی قیادت میں روانہ ہو گئے۔

اور ہم ایک کھنڈر نما حویلی میں پہنچ گئے۔ اچانک کسی بڑھیا کی آواز ابھری۔ ”لڑکو میں ہوں ملکہ ایک بھٹکی آتما جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی، میں شیطان کی پجارن ہوں، وہ میرا آقا ہے اس لئے میں ہر اس شخص کو جو قبرستان یعنی میری حدود کے اندر داخل ہوتا ہے اسے شیطان کے پیروکاروں کے ساتھ ملا دیتی ہوں، اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو شیطان کو اپنا آقا بنا لو۔“

میں مخاطب ہوا اور بولا۔ ”بڑھیا ایک بار ذرا اپنا دیدار تو کرا اور سامنے آ کر بات کر۔“ اصل میں میرا خون کھول اٹھا تھا میں ایک خدا وحدہ لاشریک کا ماننے والا اور شیطان سے نفرت کرنے والا تھا، ہم تینوں سخت غصے میں تھے۔ آہستہ آہستہ کالے رنگ کا دھواں ہمارے سامنے جمع ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک وجود بننے لگا۔ اب ہمارے سامنے انتہائی بھیانک شکل والی ایک بڑھیا کھڑی تھی جس کا جسم ایسے تھا جیسے دیمک کسی لکڑی کو چاٹ جائے تو اس لکڑی کے اندر طرح طرح کے سوراخ اور مٹی جمع ہو جاتی ہے۔

ہم نے فوراً بڑھیا پر حملہ بول دیا، میں نے بڑھیا کی ناک پر پورے زور سے گھونسا مارا، بڑھیا چیخ پڑی اور اس کی ناک سے گاڑھا سرخ مادہ جس میں کالا رنگ بھی

شامل تھا بننے لگا۔ ساتھ ہی محسن نے وہ لاٹھی جو اس نے جنگل سے اٹھائی تھی، زور سے بڑھیا کے سر پر دے ماری، علی نے کک رسید کی اور بڑھیا منہ کے بل نیچے گر پڑی۔ ہم نے بڑھیا کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور لاتوں، گھونسوں اور لاٹی کے پے در پے وار کر ڈالے، بڑھیا کے جسم سے مسلسل فوارے کی طرح خون بہہ رہا تھا مگر ہم ابھی تک ذرا برابر بھی تھکے نہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا کا کچومر بن گیا اب وہاں بڑھیا کی جگہ گندے خون میں لت پت کسی گارے کی مانند بڑھیا کے جسم نے شکل اختیار کر لی تھی مگر جیسے ہی ہم نے بس کی، اس گارے میں حرکت پیدا ہونے لگی اور وہ فوراً کالے دھوئیں میں تبدیل ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں دھواں اسی بڑھیا میں تبدیل ہو گیا، اب کی بار بڑھیا کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔

''ارے بے وقوف لڑکوں میں ایک چڑیل ہوں اور مسلسل گیارہ سال تک شیطان کی عبادت کی اور اس نے مجھے خونی آتما بنا دیا۔ ایسی آتما جسے کوئی نہیں مار سکتا۔ تم نے کیسے سوچ لیا کہ تم تینوں مجھے مارنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، اب تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تو شیطان کو اپنا آقا مان لو یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

علی نے کہا۔ ''نہیں...... ہم نہ ہی شیطان کو اپنا آقا مانیں گے اور نہ ہی موت کے منہ میں جائیں گے۔''

بڑھیا نے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے میں تمہیں قیدی بنا لیتی ہوں پورے 48 گھنٹوں کے لئے اور اس کے بعد بھی تم نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا تو پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جہاں پر ہم کھڑے تھے وہاں ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور ہم نیچے گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔ ہمارے دماغ ماؤف ہو رہے تھے۔ اور ہم کبھی ایک سے تو کبھی دوسرے سے ٹکراتے ہوئے نیچے جا رہے تھے، جانے اب ہم کون سی نئی مصیبت میں مبتلا ہونے والے تھے، جانے اب ہمارا بھی شاید کچومر بننے والا تھا، جیسے ہم نے بڑھیا کا بنایا تھا۔ پر معاملہ اس کے الٹ نکلا، جہاں ہم گرے تھے یہ کوئی گول دائرے کی سی شکل تھی اور اس جگہ کی بناوٹ کچھ ایسی چیزوں سے کی گئی تھی کہ اندر دیواروں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہلکی روشنی ہم پر عجیب قسم کا سحر سا طاری کر رہی تھی۔ ہم ہونقوں کی طرح ادھر ادھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ محسن لاٹھی کے ہمراہ آگے بڑھنے لگا جبکہ ہم دونوں بھی اس کی قیادت میں چلنے لگے۔

اچانک ایک طرف سے ایک بدصورت ڈھانچہ نمودار ہوا، ایک لمحے کے لئے ہم تینوں ڈر گئے اور ہم تینوں کا جسم ساکت ہونے لگا، لیکن ڈھانچے نے فوراً ہم پر حملہ بول دیا۔ یکا یک اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر نمودار ہوا۔ جس سے اس نے محسن پر وار کیا۔ محسن پھرتی سے ایک طرف کو ہٹ گیا۔ آگے میں کھڑا تھا۔ ڈھانچہ لڑکھڑاتا ہوا آیا اور ہاتھ میں پکڑا خنجر سیدھا میرے بازو میں پیوست کر دیا۔ درد سے میں کراہ اٹھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے سنبھل کر دوسرے ہاتھ کا زوردار تھپڑ ڈھانچے کے منہ پر رسید کیا۔ پر یہ کیا، بجائے اس کے کہ وہ نیچے گرتا، الٹا اس کی گردن میرے تھپڑ کی وجہ سے گول گول تیزی سے گھومنے لگی۔ جب اس کی گردن رکی تو وہ مسکرانے لگا۔ علی نے فوراً اپنا مکا اس کے منہ پر رسید کیا اور پیچھے کھڑے محسن نے لاٹھی اس کے سر پر پوری قوت سے ماری جس سے ڈھانچے کا سر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ باقی جسم کی ہڈیاں بھی درہم برہم ہو گئیں اور وہ ایک سرخ رنگ کے دھوئیں میں تبدیل ہو گیا۔

ہم تینوں ڈر گئے کہ شاید یہ بھی بڑھیا کی طرح دوبارہ اپنی حالت میں واپس آ جائے گا مگر دھواں جھٹ سے غائب ہو گیا۔ میرے بازو سے ابھی تک خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میرے دوستوں نے مجھے سہارا دیا، میں نڈھال ہونے لگا تھا، اچانک مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں رومال موجود ہے میں نے وہ رومال اپنے بازو پر باندھ دیا، جس سے درد قدرے کم اور خون آہستہ آہستہ رکنے لگا تھا۔ اب ہم تینوں نے پختہ عہد کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم اس بڑھیا اور اس پراسرار دنیا کا خاتمہ کر کے چھوڑیں گے۔ چاہے اس میں

www.urdusoftbooks.com

ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، لیکن ہم ہار نہیں مانیں گے۔ اس وقت مجھے ایک شعر یاد آرہا تھا کہ......

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اب ہم تینوں کو کسی نہ کسی طرح ان خونی آتماؤں جوکہ شیطان کی پوجا کرتی تھیں اور خدا وحدہ لاشریک کے بندوں کو ورغلاتی تھیں ان کا ہر صورت ابدی خاتمہ کرنا تھا۔

ہم آگے چلنے لگے، اب ہمارے پاس دو قسم کے ہتھیار تھے ایک محسن کے پاس لاٹھی اور دوسرا میرے پاس ڈھائی انچ کا خنجر تھا، تھوڑی دیر بعد ہم اس گول خول نما کمرے سے باہر آچکے تھے۔ لیکن باہر کا منظر دل کو ہلا دینے والا تھا، باہر ہر طرف برف جمی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے قد آور درخت جن کے پتے برف کی وجہ سے سفید ہو چکے تھے، یہ کوئی حسین وادی تھی، لیکن یہاں شدید سردی تھی اور اب ہمیں بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا، ہم ایک لمحے کے لئے خوش ہو گئے شاید ہم اس بڑھیا جوکہ ایک خونی آتما ہے کے جنگل سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر پھر ہم سمجھ گئے کہ یہ بھی ضرور اس کی کوئی چال ہے۔ ہمارے جسموں میں سردی سرایت کر چکی تھی۔ لہو منجمد ہو رہا تھا لیکن پھر بھی ہم زندگی کی تلاش میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک سڑک دور سے نظر آئی، ہم خوش ہو گئے کہ ہم واقعی ہی آزاد ہو گئے ہیں۔ محسن بولا۔ یہاں سے ضرور کوئی گاڑی گزرے گی۔ ہم لفٹ لے لیں گے اور یہاں سے نکل کر اپنے گھر کا راستہ معلوم کریں گے، ہم تینوں پاگلوں کی طرح سڑک کی طرف بھاگنے لگے، مگر سڑک کے قریب پہنچ کر کافی دیر انتظار کیا کوئی گاڑی نہ آئی، نتیجتاً ہم سڑک کے بائیں طرف پیدل چلنے لگے، سڑک بالکل صاف ستھری تھی۔ شاید اس کی گاہے بگاہے صفائی ہوتی رہتی تھی۔ ہمیں سڑک کے کنارے پر تھوڑی دور ایک قلعہ نظر آیا، تو ہم قلعہ کی طرف چلنے لگے کہ شاید قلعہ میں موجود کوئی ذی روح ہماری مدد کر سکے۔

درختوں سے باریک ہلکی ہلکی کھرکھری آوازیں آرہی تھیں، میں نے درختوں کی جانب دیکھا تو درختوں پر موجود گلہریاں کچھ کھانے میں مصروف تھیں اور ساتھ ہمیں قلعہ کی جانب جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ قلعہ کا دروازہ بند تھا، علی نے دروازے پر لگی زنجیر کھینچی، اندر دور کہیں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ علی نے بار بار زنجیر کو ہلانا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں اس کی کوشش رنگ لائی، قلعہ کا بہت بڑا گیٹ کھلنا شروع ہو گیا، ایک بوڑھا آدمی جس نے گرم نفیس لباس زیب تن کر رکھا تھا دروازہ کھول رہا تھا، بوڑھے کا آدھا چہرہ سر پر ٹوپی کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا، ہم اندر داخل ہو گئے، تو بوڑھے نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم بوڑھے کے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے، اندر کا ماحول کافی پرسکون تھا، اندر کمرے میں بنے آتش دان میں لکڑیاں پوری آب و تاب کے ساتھ جل رہی تھیں، جن کی وجہ سے کمرہ گرم تھا، بوڑھے نے کہا۔ ”بیٹھو“ اور ایک طرف پڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بوڑھے کی آواز دہشت زدہ کر دینے والی تھی۔

ہم صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ بوڑھا ایک طرف بنی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ مجھے تو یہ جگہ کافی عجیب سی لگ رہی تھی۔ چند منٹوں میں آگ کی تپش سے ہمارے جسموں کا درجہ حرارت کافی حد تک بہتر ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بوڑھا ایک بڑی ٹرے اٹھائے حاضر ہوا۔ ”آجایئے معزز مہمانوں کچھ کھالو تمہیں بھوک تو لگی ہو گی۔“ بوڑھے نے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

ہمیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ مگر اب بھنے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہم تینوں اٹھے اور میز کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خرگوش کا بھنا ہوا گوشت کھا کر بہت مزہ آیا اور کافی حد تک ہمارے جسموں میں انرجی آچکی تھی۔ تھوڑی دیر میں بوڑھا کافی کے مگ اٹھائے آپہنچا اور ہمارے سامنے پیش کر دیئے، میں نے کافی کی چسکی بھری اور دوستوں کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ”یار پی لو کافی، کوئی پتا نہیں کل ہوں نا ہوں، ویسے بھی ہم اس کافی کی وجہ سے ہی تو یہاں پھنسے ہیں۔ نہ ہم اتنی رات کافی بازار

لینے جاتے اور نہ گاڑی قبرستان والے راستے پر آتی اور نہ ہی ہم ان آتماؤں کی دنیا میں پہنچتے۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا، نہ ہی آپ نے ہم تینوں سے پوچھا کہ ہم کون ہیں۔" علی نے کافی کا مگ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یوں سمجھ لو کہ میں یہاں آنے والوں کا خدمت گار ہوں۔ اور جو بھی یہاں آتا ہے میں اس کے بارے میں نہیں پوچھتا۔ ہمارے آقا اور ان کی نائب ملکہ نے یہی سکھایا ہے ہمیں۔"

"کون ہے تمہارا آقا اور کون ہے تمہاری ملکہ۔" محسن نے کافی کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جس کی کائنات میں تم آگئے ہو۔" بوڑھے نے مبہم سا جواب دیا۔

"تمہارا مطلب خدا سے ہے، ہے ناں۔" میں نے تصدیق چاہی۔ بوڑھے کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ کڑک دار آواز میں بولا۔ "خبردار اب خدا کا نام لیا۔ یہ کائنات میرے آقا کی رضامندی سے ہماری ملکہ نے بنائی ہے۔"

"یہ کیا کفر بول رہے ہو۔" میں نے جواباً کہا۔

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں اور ہماری ملکہ اور ہم سب شیطان کے پجاری ہیں، تم تینوں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔"

مجھے سخت غصہ آگیا، میں نے ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ بوڑھے کے منہ پر دے مارا مگ میں کافی موجود تھی، اور گرم بھی جس سے بوڑھے کا چہرہ جھلسنے لگا اور وہ آہ و بکا کرنے لگا، مگر فوراً ہی بوڑھا سنبھل گیا، دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے کا جسم انتہائی بھیانک ہوگیا، اس وقت وہ محسن کے پیچھے تھا، میں کھڑا ہوگیا اور ساتھ بیٹھا علی بھی، محسن ہمیں دیکھ کر فوراً پیچھے کی طرف مڑا، لیکن بوڑھے نے جلدی سے محسن پر حملہ کردیا اور زور سے ایک طمانچہ محسن کے منہ پر دے مارا، محسن دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا، میں فوراً بوڑھے کی طرف بڑھا اور ہاتھ میں پکڑا خنجر بوڑھے کی طرف پھینکا، ساتھ ہی علی نے بوڑھے پر لک رسید کرنا چاہی مگر ہم دونوں کے وار ناکام گئے اور بوڑھے نے ہم دونوں کو ایسے گھما کر فرش پر پٹخا جیسے ہم روئی کے تکیے ہوں اور فوراً محسن کی طرف لپکا۔ ہمارا جسم زخموں سے چور ہوچکا تھا، مگر پھر بھی اٹھنے کی ناکام ہمت کر رہے تھے۔ ادھر بوڑھا محسن کے سر پر پہنچ گیا، محسن نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر بوڑھے نے موقع ہی نہ دیا، پورے زور سے محسن کے سر پر لات ماری جس سے اس کے سر سے خون بہنے لگا، ہم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو پوری قوت سے اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے محسن کی جانب بڑھے، اب بوڑھا ہماری طرف آرہا تھا لیکن اچانک بوڑھے کو آگ لگ گئی اور وہ اسی آگ میں کہیں غائب ہوگیا۔ محسن میں ابھی چند سانس باقی تھے ہم دونوں نے اسے گلے سے لگالیا، نہیں محسن تمہیں کچھ نہیں ہوگا، ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔"

پر وقت گزر چکا تھا، محسن نے ہمیں مخاطب کرکے کہا۔ "سجاد..... سجاد مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اور علی میری موت کا بدلہ ضرور لو گے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ وعدہ کرو۔"

"ہم دونوں وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے قتل کا بدلہ ضرور لیں گے۔

"اور ہاں ایک اور بات ہوسکتا ہے کہ یہ آتمائیں جو کہ شیطان کی عبادت کرتی ہیں مجھے مار کر یہ سمجھیں کہ شاید انہوں نے مجھے زیر کردیا، پر ایسا نہیں ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس وقت مر رہا ہوں مگر میں اب بھی ان کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا۔"

محسن نے ہمارا ہاتھ چھوڑ دیا، وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا، میں اور علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

پھر مجھے اپنے پیچھے کسی ذی روح کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی لڑکی جو ہمیں قبرستان میں ملی تھی، کھڑی تھی اور اپنی گول گول آنکھوں سے ہمیں دیکھنے میں مصروف تھی، میں نے دکھ اور غصے سے کہا۔

"کیا چاہتی ہو تم، تمہاری وجہ سے ہم اس دنیا میں آئے

اور آج ہمارا دوست بھی ہمیں چھوڑ گیا۔"

تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو، میں مجبور تھی۔ میری چھوٹی بہن کو اس بڑھیا نے اپنے قبضے میں کر لی تھی، جب میں اپنی بہن کو اس کی قید سے آزادی دلوانے آئی تو میں بڑھیا کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی، ہار گئی، بڑھیا نے میرے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ اگر میں اسے تین طاقت ور نوجوان لا کر دوں تو وہ میری بہن کو آزاد کر دے گی۔ چنانچہ اتفاق سے اس رات تم قبرستان کی طرف آ نکلے اور میں تمہیں یہاں لے آئی۔ مگر آج صبح جب میں بڑھیا کے پاس گئی تا کہ وہ میری بہن کو آزاد کرے لیکن پہلے ہی بڑھیا نے میری بہن کو شیطان کو خوش کرنے کی خاطر قربان کر دیا تھا، لاش خون میں لت پت شیطان کے قدموں میں پڑی تھی۔ اب پانچ دنوں بعد بڑھیا مجھے بھی قربان کر دے گی اور پھر تمہاری باری ہے۔ اس سے پہلے اگر تم دونوں چاہو تو بڑھیا کا خاتمہ کر سکتے ہو اور میں تمہیں طریقہ کار بتا سکتی ہوں کیونکہ تم اشرف المخلوقات میں سے ہو، یعنی سب سے افضل مخلوق اور میں قوم آسیب سے ہوں، اس لئے تمہاری اور علی کی عقل ہماری دنیا کے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔"

میں نے لڑکی کو کہا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم پہلے کی طرح پھر ہمیں دھوکہ دے رہی ہو۔ میری اس بات پر علی نے بھی ساتھ دیا اور کہا۔ "سجاد تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ لڑکی پھر سے کسی نئی مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہے۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔" لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔ تم دونوں میری بات کا یقین کرو۔ اچھا اگر یقین نہیں کرتے تو ایک طریقہ کار تو سن لو۔" پھر تمہیں خود ہی یقین آ جائے گا۔" لڑکی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں نے پریشانی اور غصے کے ملے جلے اثرات کے تحت کہا۔ "ٹھیک ہے طریقہ کار بتاؤ۔"

"طریقہ یہ ہے کہ اس بڑھیا نے "فرعون کے محل مصر میں چونکہ فرعون اور اس کی رعایا غرق ہو چکے ہیں اور محل ویران ہے وہاں پر شیطان کی پوجا تقریباً گیارہ سال تک اہرام مصر کے کسی تہہ خانے میں کی اور پھر شیطان نے خوش ہو کر اسے خونی آتما کا روپ دے دیا اور اس کی لاش اس تہہ خانے میں ہے اس لاش پر ایک ایسا طلسم کیا گیا ہے کہ وہاں تک صرف کوئی انسان ہی جا سکتا ہے اگر دوسری قوم میں سے کوئی بھی وہاں پہنچے گا تو تہہ خانے تک پہنچنے سے پہلے ہی فنا ہو جائے گا۔ اگر تم وہ لاش نکال کر اہرام مصر کی ریت پر دن کے وقت رکھ دو تو وہ لاش فوراً آگ کی زد میں آ جائے گی جس سے اس کا ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا، یہ دنیا بھی ختم ہو جائے گی، میں تمہاری اتنی مدد کر سکتی ہوں کہ تمہیں اہرام مصر تک پہنچا سکتی ہوں آگے تہہ خانہ ڈھونڈنا اور لاش کو نکالنا تمہارا کام ہے۔"

لڑکی نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہماری آنکھوں پر دھوپ پڑی تو ہم نے آنکھیں کھول لیں۔ سامنے اہرام مصر تھے ہم حیران رہ گئے، لیکن دوسرے ہی لمحے ہماری نس نس میں ڈر اتر چکا تھا۔ ہمارے قریب کھڑی اس لڑکی کی شکل تبدیل ہونے لگی اور پھر اچانک اسے آگ لگ گئی، آہ بکا کی آوازیں سنسان اہرام مصر میں گونجنے لگیں۔ ہم سمجھ گئے کہ لاش کے طلسم کی وجہ سے یہ ابدی نیند سو گئی۔ "سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا جس کی وجہ سے اہرام کے سنگی در و دیوار ایسے چمک رہے تھے جیسے سونے کے بنے ہوں، ہم آگے بڑھنے لگے اور ان اہرام کے عین وسط میں پہنچ گئے اب ہمارے چاروں طرف مختلف قسم کے مجسمے تھے۔ ان میں ایک پرانا بوسیدہ مگر لمبائی میں سب سے بڑا تھا، میں رک کر مجسمے کا جائزہ لینے لگا، لیکن علی اس پتھر کے قریب جا کر اسے ہاتھ لگا کر دیکھنے لگا۔

علی نے ایسے ہی اپنا پاؤں اس پتھر پر رکھ لیا اور قریب سے مجسمے کو دیکھنے لگا، پاؤں کے وزن کی وجہ سے اچانک مجسمے کے ساتھ ایک طرف سے زمین کانپنے لگی اور سرک گئی، جہاں سے تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو وہ ایک تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانے میں جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو کہ نیچے کی

طرف جارہی تھیں۔

علی نے کہا شاید یہی راستہ تہہ خانہ کا ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا میرے پیچھے علی بھی نیچے اتر رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں طویل تھیں جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تہہ خانہ کافی گہرائی میں ہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم تہہ خانے کی سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔ یہاں روشنی کم کم آرہی تھی۔ مگر جتنی تھی اس سے ہم دیکھ سکتے تھے، ہم تھوڑا آگے بڑھے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ سامنے ایک جگہ کوئی پانچ چھ تابوت پڑے تھے۔ ہم شش وپنج میں پڑ گئے کہ آخر کون سا تابت کھولیں، یہ نہ ہو کہ کوئی غلط تابوت کھول کر اس سے بھی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں، میں اور علی قریب جا کر چھ کے چھ تابوتوں کا معائنہ کرنے لگے۔

علی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''سجاد لگتا ہے کہ ہم غلط تہہ خانے میں آ گئے ہیں، یہاں تو ایک تابوت کی جگہ چھ پڑے ہیں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے باہر نکلنا چاہئے چلو...... یہاں سے'' میں یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو میری نظر چھٹے تابوت پر پڑی، یہ تابوت باقی کے پانچوں تابوتوں سے مختلف تھا۔ میں دوبارہ پلٹا اور چھٹے تابوت کے پاس جا کر رک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ باقی کے پانچ تابوت کے نقش ونگار ایک جیسے تھے جبکہ اس چھٹے تابوت پر کسی قسم کا نقش وغیرہ نہ تھا بلکہ یہ بالکل سیاہ تھا اور اوپر لکھا تھا۔ ''خونی آتما'' میں سمجھ گیا کہ یہی تابوت اس بوڑھی چڑیل کا ہے۔

میں نے اسے چاروں طرف سے دیکھا۔ ایک طرف سے تابوت کھولنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ مگر اس وقت اس سوراخ میں لوہے کی سلاخ ڈال کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں سلاخ باہر نکالنے لگا تو علی نے روک لیا اور بولا یار ہم کیوں نا اس تابوت کو اٹھا کر باہر تپتی دھوپ میں لے جا کر کھول دیں ہوسکتا ہے ہم جیسے ہی کھولیں بوڑھی چڑیل کی آتما کو خبر ہو جائے اور وہ ہمیں مار ڈالے۔ مجھے اس کی تجویز پسند آئی۔

چنانچہ ایک طرف سے تابوت کو میں نے اٹھایا اور دوسری طرف سے علی نے اور باہر کی جانب بنی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔ جیسے ہی ہم باہر آئے اور تابوت کو ریت پر رکھا۔ یکا یک زمین لرزنے لگی اور ایک طرف دھواں سا نمودار ہونے لگا دونوں سمجھ گئے کہ خونی آتما کو علم ہو گیا ہے علی نے کہا۔ یار میں اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس کا دھیان تم پر سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں، تم جلدی کرو اور تابوت کو کھول دو۔

ادھر خونی آتما اپنی حالت میں آچکی تھی۔ علی آگے بڑھا اور پوری قوت سے بڑھیا کے منہ پر مکا رسید کیا مگر یہ کیا بڑھیا اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی جبکہ ایک ٹن ٹن کی آواز آئی اور علی اپنا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے علی کو ایک زوردار لات رسید کی اور وہ ریت میں لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ میں نے تابوت کی سلاخ نکال دی تھی۔ جیسے ہی تابوت کا ڈھکن اٹھانے لگا عین وقت پر کم بخت بڑھیا سر پر آن پہنچی اور ایسا تھپڑ میرے گالوں پر رسید کیا کہ مجھے ایسا لگا جیسے منہ کے اندر دانت ٹوٹ گئے ہوں، میں نے دوبارہ کوشش کی مگر بڑھیا نے مجھے اٹھا کر تپتی ریت پر ایسے پٹخا کہ جیسے میں کوئی خالی بوتل ہوں۔ علی اٹھ چکا تھا بھاگتا ہوا بڑھیا پر جھپٹا مگر بڑھیا نے قریب پڑی ہوئی سلاخ اٹھائی اور علی کے سر پر دے ماری، علی نیچے گرا۔ اب بڑھیا میری طرف بڑھ رہی تھی مگر علی نے بڑھیا کی ٹانگ لیٹے لیٹے پکڑ لی اور مجھے پکارنے لگا۔'' سجاد اٹھ، جلدی کر ٹائم کم ہے۔''

جیسے ہی میرے کانوں میں علی کی آواز گونجی مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں فوراً بھاگا اور موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی پوری قوت جمع کی اور تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا۔ تابوت کے اندر ایک بوسیدہ سا ڈھانچہ تھا۔ پتا نہیں کتنے سال پرانی یہ خونی آتما تھی، سورج کی روشنی پڑتے ہی پورے تابوت کو آگ لگ گئی۔

بڑھیا دھوئیں میں تبدیل ہو گئی اور ہر طرف طوفانی جھکڑ چلنے لگا چاروں طرف ریت ہی ریت تھی

کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمیں اپنے دماغ ماؤف ہوتے لگ رہے تھے۔ ہم بے ہوش ہو گئے۔

جب ہمیں ہوش آیا ہم اسی قبرستان میں تھے۔ علی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے علی کو گاڑی میں بیٹھایا، گاڑی اسٹارٹ کی اور شہر کی طرف دوڑا دی۔ ہر طرف سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، میں نے گھڑی میں دیکھا تو گھڑی دن کے دو بجا رہی تھی۔ بر وقت ٹریٹ منٹ کی وجہ سے علی کی حالت چند دنوں میں بہتر ہوگئی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے کہ ہم نے اس شیطانی دنیا کی خونی آتماؤں کو ختم کرکے اپنے دوست کی موت کا بدلہ لے کر مزید انسانوں کو اس دنیا میں جانے سے روک لیا۔

کیونکہ جب ایک مسلمان اٹل فیصلہ کر لے تو پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

☆......☆......☆

کہنے کو تو ماسٹر شبیر احمد ماسٹر کہلاتے تھے مگر وہ کوئی مدرس نہیں تھے بلکہ اپنے شہر کے ایک معروف درزی تھے۔ اپنی بہترین کارکردگی کی بنا پر وہ ہر خاص و عام میں ماسٹر صاحب کے نام سے ہی پکارے جاتے تھے سیدھے سادھے مگر بااصول اور وضعدار شبیر احمد بجا طور پر ایک اچھے انسان تھے سلائی ان کا موروثی پیشہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا ذاتی انتخاب تھا میٹرک کے بعد جب ان کا تعلیمی سلسلہ موقوف ہوا تو والد نے انہیں اپنے ساتھ کام پر لگانا چاہا تو انہوں نے انکار کردیا انہیں مویشیوں کی افزائش نسل میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کے ایک ہم جماعت کے والد اپنے اہل و عیال کو اسی قصبے میں چھوڑ کر خود کراچی میں ٹیلرنگ کا کام کرتے تھے، وہ اس بھلے زمانے میں کراچی کے طبقہ امراء کے ملبوسات سیتے تھے اور مشرقی مغربی زنانہ مردانہ اور ہر نوع کے کپڑے اور لباس کی سلائی میں مکمل عبور رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ دوسری جگہ پر محض روزگار کے لئے مقیم تھے کہ ان کے فن کے صحیح قدر دان انہیں وہیں میسر تھے۔

شبیر احمد کی ان سے اسی دور میں ملاقات ہوئی جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے قصبہ کا سب سے خوش حال گھرانا انہی کا تھا۔ انہوں نے شبیر احمد کو اپنے بیٹے کا قریبی دوست جان کر یہی کام سیکھنے کا مشورہ دیا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش بھی کردی جسے وہ دل و جان سے مان گئے پھر گھر والوں کی آمادگی نہ ہونے کے باوجود وہ کراچی چلے آئے اور پھر اپنی تمام تر توانائی بھرپور دلچسپی انہوں نے اس کام پر مرکوز کردی اور صرف ساڑھے تین سال کے عرصہ میں اپنے استاد کا تمام علم اور فن، ذہن اور ہاتھوں میں منتقل کر کے واپس آ گئے۔

انہوں نے قصبہ کی سکونت ترک کر کے قریبی شہر میں مقیم ہو گئے اور شہر کے مرکزی بازار میں دکان بنالی جو نیت اچھی ہونے اور بہترین کام کی بدولت خوب چل نکلی۔ دو سال کے بعد والدین نے ان کی شادی کردی نسیم ان کی شریک حیات بن کر زندگی میں آ گئیں نسیم بھی ایک نیک فطرت اور بھلی عورت ثابت ہوئیں اور دونوں نے خوش گوار زندگی بسر کی ان کے پانچ بچے ہوئے پہلے بڑی دو بیٹیاں اس کے بعد دو بیٹے اور آخر میں ایک بچی، رافعہ اور شافعہ بڑی تھیں اور کالج کی تعلیم مکمل کر چکی تھیں جبکہ واجد راشد اور صبیحہ چھوٹے تھے اور ابھی زیر تعلیم تھے دونوں بڑی بیٹیاں شادی کے قابل ہوئیں تو ماسٹر صاحب اور ان کی اہلیہ نے سوچا کہ بچیوں کا فرض ادا کردیا جائے مگر خاندان بھر سے کسی نے ان کے یہاں پتھر نہیں پھینکا جبکہ یہ سارا گھرانہ مرقع شرافت اور سادگی والا تھا۔

نسیم بیگم نے کہا کہ ”ماسٹر صاحب کیوں نا پہلے گھر نئے سرے سے تعمیر کروالیا جائے تاکہ معقول جگہوں سے رشتے کا سلسلہ بنے؟“

ماسٹر صاحب کہنے لگے۔ ”نیک بخت میں جو کماتا ہوں وہ سب آپ کی نذر کردیتا ہوں اب آپ ہی بتائیں کہ اگر پہلے گھر بنالیں تو بعد میں بچیوں کے لئے انتظام ہوجائے گا؟“

نسیم نے جواب دیا۔ ”ماسٹر صاحب یہ گھر جو ہمارے پاس ہے پہلے سے خاصہ وقت گزار چکا ہے

www.urdusoftbooks.com

پھر ہماری شادی سے لے کر جو عرصہ گزرا اس کے بعد یہ اب بالکل خستہ حال ہو چکا ہے اسے پہلے بنوانا ضروری ہے دوسری بات یہ کہ اگر ہم پہلے بچیوں کا فرض ادا کر کے بعد میں تعمیر کرواتے ہیں تو آپ کو رشتے داروں کا بہت اچھے سے علم ہے کہ وہ بلاوجہ شگوفے چھوڑیں گے۔"

ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔ "بیگم گھر کی تعمیر کا بچیوں سے کیا تعلق ہے؟"

اس بات پر نسیم نے جواب دیا۔ "آپ بہت سادہ ہیں ارے بھئی بیٹیوں کو ان کے گھر کا کرنے کے بعد ہم گھر بناتے ہیں تو وہ ہمارے سامنے نا سہی مگر ادھر ادھر کہتے پھریں گے کہ دامادوں کے مال سے بیٹیاں معاشی تعاون حاصل کر رہی ہیں جب ہی تو گھر بھی بنوار ہے ہیں اور یہی باتیں اگر بیٹیوں کے سسرال تک گئی تو بلاوجہ بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔

ماسٹر صاحب بیوی کی دوراندیشی کے قائل ہو گئے کہ بات تو معقول ہے ان کا خاندان حاسد فتنہ پرداز اور منافقانہ رویے کے حامل افراد سے بھرا پڑا تھا وہ ٹھہرے سادہ اور مخلص آدمی خاندان کے اکثریت گھرانے انہیں کم ترین سمجھتے تھے کیونکہ وہ سازشی اور مفسد نا تھے۔

بہر حال گھر کی تعمیر کا آغاز ہوا، نسیم بیگم شادی کے بعد سے لے کر اب تک بہت کفایت شعاری سے گزر اوقات کرتی آ رہی تھیں، مستقبل میں ہونے والے کاموں کا انہیں مکمل ادراک تھا سو بہت گراں قدر سرمایہ انہوں نے محفوظ کر رکھا تھا۔ گھر بہت شاندار بنوایا گیا اور عہد موجود کے تمام تقاضوں کے مطابق بنوایا گیا پہلے والے گھر میں چھت پر کوئی کمرہ نہ تھا جس کی وجہ سے موسم گرما میں رات کو سونے کے لئے چارپائی بستر رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، نئے گھر میں نسیم بیگم نے بطور خاص چھت پر بڑا سا کمرہ بنوایا تا کہ آسانی رہے۔

اتنا بہترین گھر بن جانے کے بعد انہوں نے فوراً بیٹیوں کے رشتوں کے لئے تگ و دو شروع کر دی اگرچہ کہ نئے گھر کو دیکھتے ہوئے چند طامع عزیزوں نے رجوع کیا مگر خود ماسٹر صاحب بددل ہو چکے تھے لہٰذا بات نہ بنی۔ ماسٹر صاحب کی خوش قسمتی کہ مسلسل رشتے دیکھتے رہنے کے بعد انہیں ایک ہی گھر کے دو بیٹوں کا رشتہ مل گیا دونوں بھائی خوش شکل تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھے خاندان مختصر اور یکساں قومیت کا تھا پھر کیا تھا ماسٹر صاحب نے اللہ کا نام لے کر بات طے کر دی اور منگنی کے تین ماہ بعد شادی مقرر کر دی۔

نسیم بیگم نے دونوں بیٹیوں کے لئے تیاری شروع کر دی انہوں نے بہت بہترین جہیز تیا کیا اور شادی کی تقریب بھی شاندار رکھی ایک مدت سے ماسٹر صاحب خاندان کے وہ فرد تھے جنہیں ان کے بیوی بچوں سمیت سب نے فراموش کیے رکھا ان کی سادہ زندگی اور سادہ مزاجی کے سبب بھی قابل خود اعتنا نہ جانا مگر پے درپے امارت کے مظاہروں نے ان کے خاندان کو چونکا دیا انہیں اب ان کی بیٹیاں نہ لینے کا افسوس ہونے لگا خود ان کی بہن جو ہمیشہ بھائی کو رتی بھر اہمیت دینے کی روادار نا تھیں جوان بیٹے ہوتے ہوئے بھی بھتیجیاں آنکھوں سے اوجھل رہیں اب بات بے بات بھائی کے صدقے وارے ہونے لگیں۔

ماسٹر صاحب تو ان مصنوعی محبتوں سے بہلنے لگے مگر نسیم بیگم سب سمجھتی تھیں زبان سے کچھ نا کہتیں مگر رویہ بہت محتاط رکھا۔

بہر حال دونوں بیٹیاں خیروخوبی سے اپنے گھر کی ہوئیں تو ماسٹر صاحب اور دیگر اہل خانہ معمول کی زندگی پر آ گئے۔ نئے طرز زندگی نے بہت سی آسانیاں پیدا کر دیں واجد کی تعلیم میں دلچسپی اتنی زیادہ نہ تھی سو انٹر کے بعد ماسٹر صاحب نے اسے قائل کر کے اپنی دکان پر بیٹھا لیا، راشد نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا، راشد تعلیم کے معاملے میں بہت ذہین اور پرعزم تھا اور صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی مگر وہ گھر بھر کی لاڈلی خصوصاً والدین کی نور نظر تھی بہت ہی خوب صورت مگر حساس صبیحہ ماں کا دم چھلہ تھی ہر وقت ان کے ساتھ ساتھ رہتی زندگی بہت سبک اور رواں تھی۔

نصیب کی خوشیاں قطار در قطار چلی آ رہی تھیں رافعہ اور شافعہ سسرال میں جاتے ہی چراغ خانہ بن گئیں ساس نے گھر کے تمام معاملات ان کی سمجھ داری اور سلیقہ کو دیکھتے ہوئے ان کے سپرد کر دیا، شادی کے ایک سال بعد وہ آگے پیچھے آنے والے بیٹے جو دونوں بہنوں کا مان مزید بڑھا بڑھا گئے۔

شبیر احمد اور نسیم بیگم کو بھی پے در پے نواسوں کی آمد نہال کر گئی وہ بے بہا تحائف لے کر بیٹیوں کے گھر گئے اور ڈھیروں خوشی منائی۔

متوسط اور نچلے طبقے میں ہمارے ہاں حسد اور عناد وافر پایا جاتا ہے۔ ہمارے اخلاقی طور پر زوال پذیر معاشرے کا دستور بن چکا ہے کہ جب کوئی فرد یا گھرانہ زبوں حال رہتا ہے تو رشتہ دار انہیں اہمیت نہیں دیتے اور اگر کوئی معاشی طور پر مضبوط اور خاص طور پر عنایات الٰہی پانے لگے تو اسے در پردہ حسد اور بغض کا نشانہ بنالیا جاتا ہے۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہونے جا رہا تھا انہیں اول اللہ کا فضل اور اس کے بعد ان کی کڑی محنت اور نیک نیتی کے سبب یہ خوشیاں نصیب ہو رہی تھیں مگر خاندان کے لوگ اندر ہی اندر آتش حسد میں سوکھی لکڑی کی طرح جل کر راکھ ہو رہے تھے ان میں سر فہرست شبیر احمد کی بڑی بہن تھیں جنہوں نے تمام عمر بھائی اور بھاوج کو ذاتی زندگی سے دور رکھا کبھی کوئی مشورہ لیا نہ کبھی بھائی کی حیثیت سے انہیں خوشیوں میں شامل کیا اب جو بھائی کو ترقی کرتے دیکھا تو پیچ و تاب کھانے لگی بھائی کی ہر چیز پر اپنا حق سمجھنے لگی۔

وہ شاید ماسٹر صاحب کو مصنوعی محبت سے بے وقوف بنا ہی لیتی مگر نسیم کے سرد رویے کے باعث انہیں پنجے گاڑنے کا موقع نہیں مل رہا تھا نسیم بیگم اپنے اس رویے کے لئے حق بجانب تھیں۔

آنے والے دو سالوں میں واجد نے دکان پوری طرح سنبھال لی اور دل جمعی سے والد کے کام کو وسعت دینے لگ گیا، رافعہ کے شوہر کو امریکہ جانے کا موقع مل گیا اور جاتے ہی کسی پریشانی کے بغیر کام بھی مل گیا۔

راشد ایف ایس سی مکمل کر کے انجینئرنگ میں آ گیا اور چھوٹی صبیحہ میٹرک میں آ گئی ادھر ماسٹر صاحب کی بہن سکینہ نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد عملی کوششیں شروع کر دیں اپنے بیٹے کو تیار کیا کہ وہ واجد سے دوستی بنائے اور گھر بھی لایا کرے۔

اس نے آگے کی حکمت عملی سوچ رکھی تھی ایک بیٹی تو عرصہ ہوا بیاہ کر اپنے گھر کی ہو چکی تھی دوسری بیٹی بھی شادی کے قابل تھی مگر اس نے دانستہ اس کی شادی نہ کی تا کہ اس کے ذریعے اپنے بھائی کے گھر تک رسائی حاصل کرے اس کی بیٹی حمیرا قبول صورت سی لڑکی تھی واجد سے عمر میں بڑی مگر اداؤں اور مردوں کو پھانسنے کے گنوں سے مالا مال۔

اکبر نے ماں کے کہنے پر واجد سے بے تکلف بڑھانے کی کوشش شروع کر دی ویسے بھی سکینہ کی اولاد سکینہ کے ہی اوصاف کی مالک تھی اکبر نے کزن کے رشتے سے واجد کو کبھی کبھار گھر آنے پر بھی مجبور کرنا شروع کر دیا۔

واجد دکان پر بہت مصروف رہتا اس کے پاس وقت کم ہی ہوتا کہ وہ ادھر ادھر جا سکے مگر جب بھی ذرا فرصت ہوتی اکبر اسے گھیر لیتا وہ جب بھی پھوپھی کے یہاں جاتا وہ اسے دیکھتے ہی نثار ہونے لگتی آگے بڑھ کر بلائیں لیتی اور اس کی خاطر مدارت یوں ہوتی کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔

حمیرا اس کے آنے پر خوب سنگھار کر کے اس کے مقابل بیٹھ جاتی اور اداؤں کے تیر چلاتی سیدھا سادھا واجد اس پذیرائی پر بہت مرعوب ہو جاتا، پھوپھی کے منع کرنے کے باوجود ایک روز نسیم کے سامنے اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ وہ سکینہ کے گھر آتا جاتا ہے۔

نسیم بیگم کے کان کھڑے ہو گئے انہوں نے بہت سلیقے سے بیٹے سے تمام باتیں اگلوا لیں انہیں نند کی

جانب سے کئے گئے وار کا بخوبی علم ہوگیا، انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے بھانجی منتخب کر رکھی تھی اب وقت آ گیا تھا کہ وہ باقاعدہ کوئی رسم کر کے واجد کو پابند کر دیتیں۔ انہوں نے واجد سے اپنی بھانجی سدرہ کے بارے میں رائے لی۔ سدرہ بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی واجدا سے پسند بھی کرتا تھا والدہ کے پوچھنے پر اس نے نہ صرف ہاں کر دی بلکہ گرم جوشی سے ماں کے گلے لگ کر اپنی خوشی کا اظہار بھی کر دیا۔

پھر کیا تھا شام کو ماسٹر صاحب کو ساتھ لے جا کر منگنی کر دی سارے معاملات بہن سے پہلے ہی طے تھے بس انگوٹھی پہنائی اور اگلے روز سارے خاندان میں مٹھائی بٹوا دی۔

جب سکینہ کے گھر واجد کی منگنی کی خبر کے ساتھ مٹھائی گئی تو وہ دونوں ماں بیٹی حیران رہ گئیں انہیں نسیم سے اتنی پھرتی کی قطعی امید نہیں تھی اس خبر نے انہیں سرتا پا شعلوں میں کھڑا کر دیا انہیں معلوم ہو گیا کہ نسیم کے ہوتے ہوئے ان کی دال نہیں گل سکتی، نسیم کو راہ سے ہٹائے بغیر ان کے مذموم مقاصد پورے نہیں ہو سکتے سو انہوں نے گھی نکالنے کے لئے انگلی ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کر لیا یہ فیصلہ بہت خطرناک تھا۔

مشہور معقولہ ہے کہ اولاد آدمی کے نصیب سے آتی ہے اور دولت عورت کے نصیب سے، رافعہ اور شافعہ اس کی عملی تفسیر ثابت ہوئیں رافعہ کے شوہر کا امریکہ جا کر ایک مقامی بیوہ عورت نے پسندیدگی کا سلسلہ ہو گیا اس نے رافعہ سے اجازت مانگی کیونکہ اس کا مطمع نظر امریکی شہریت کا حصول تھا۔

مگر رافعہ ایک بہت مختلف لڑکی ثابت ہوئی اس نے شوہر کو اس شرط پر نکاح کی اجازت دی کہ وہ محض مطلب براری کے لئے نہیں بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ شادی کرے ورنہ رہنے دے کیونکہ دوسری صورت میں اخلاقاً غلط عمل ہوگا۔

رافعہ کے شوہر نے یہ تمام بات اس نصرانی عورت کے سامنے رکھ دی کہ میری بیوی کی سوچ یہ ہے اس عورت کو رافعہ کی یہ بات اس قدر اچھی لگی کہ اس نے انصار کو رافعہ اور بیٹے سمیت قبول کر لیا اور ان کا نکاح ہو گیا۔

نکاح کے ساتھ آٹھ ماہ بعد انصار نے کوشش کر کے اپنے بھائی کو بھی بلوا لیا اس طرح دونوں بھائی امریکہ میں سیٹ ہو گئے ساتھ ہی مالی آسودگی بھی حاصل ہوتی گئی دونوں بھائی اپنی کامیابیوں کو اپنی بیویوں کا نصیب سمجھتے۔

ادھر واجد اپنی منگنی پر بہت مسرور تھا اسے والدین کے فیصلے سے دلی خوشی ہوئی اس نے ماں کے سمجھانے پر پھوپھی کے گھر کا رخ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔

ماسٹر صاحب اور نسیم بیگم اپنے دامادوں کی ترقی پر بہت شاداں تھے رافعہ شافعہ کو نہ صرف محبت کرنے والے شوہر ملے بلکہ اب تو گھر میں دولت کا دریا بھی بہہ رہا تھا دونوں بہنوں کا معیار زندگی اب بالکل امراء جیسا تھا آنے والے ایک دو سالوں میں متوقع تھا کہ وہ بھی بچوں سمیت وہاں منتقل ہو جاتیں۔

نسیم بیگم نے اپنے طور پر بیٹیوں کو شوہر کے ساتھ دیانت داری سے رہنے کی تربیت دی تھی اور ان کے اصرار پر بھی وہ بیٹیوں سے ایک پیسہ نہ لیتے مگر دونوں داماد وقتاً فوقتاً موقع بے موقع اپنے ساس سسر کو بہت زیادہ مالی تعاون کرتے، ماسٹر صاحب کے منع کرنے کے باوجود براہ راست وہاں سے رقوم بھیجتے رہتے۔

غرض یہ کہ نسیم بیگم سارے معاملات خود دیکھتیں اور مناسب انداز میں خرچ کرنے کے بعد تمام آمدن بچوں کے مستقبل کے لئے پس انداز کرتیں بینک میں ماسٹر کے نام پر بھاری سرمایہ جمع تھا ان دونوں نے ارادہ کیا کہ واجد کی شادی کر کے وہ حج بیت اللہ کے لئے جائیں گے۔

دوسری جانب سکینہ کے دن رات کا چین غارت ہو چکا تھا واجد کو پھانسنے کا منصوبہ دھرا رہ گیا، اور پھر آئے دن بھائی کے گھر سے متعلق آنے والی خبریں جلتی پر تیل کا کام کرتیں کہ اب انہوں نے گاڑی لے لی اب واجد کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے اب وہ شادی کے بعد حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بھتیجیوں کی امارت کے قصے۔

اس عورت کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اس نے نسیم کی جان لینے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ ایک ایسے سفلی کے عامل سے واقف تھی جو سیاہ عملیات کا ماہر تھا، بھاری رقوم کے بدلے ہر طرح کے منفی کام کردیا کرتا تھا وہ اس کے پاس گئی اور ساری صورتحال اس کے سامنے رکھ کر نسیم کی جان کا سودہ کرلیا۔ اس بے دین ابلیس پرست نے کچھ ضروری معلومات لے کر کام کرنے کی حامی بھرلی، بدلے میں سکینہ نے پینتیس ہزار کی رقم ایک ہی بار اس کے ہاتھ پر رکھ دی وہ جانتی تھی کہ ایک بار حمیرا اس کے بھائی کے گھر بہو بن کر پہنچ جائے پھر یہ رقم کئی گنا سود کے ساتھ آجائے گی بلکہ سب ان کا ہی ہوگا۔ وہ دنیا دار عورت چند دنیاوی چیزوں کے حصول کی خاطر اپنے ہی بھائی کا گھر اجاڑنے اور اس کے بچوں کو مسکین کرنے جارہی تھی۔

اس حسد کی آگ کا برا ہو جس کے سبب وہ دائرہ ایمان سے خود بھی خارج ہوئی اور ساتھ بیٹی کا ایمان بھی غارت کیا ساتھ ہی ایک معصوم جان کا قتل بھی ذمہ لیا محض اپنی رزیل خواہشات کے لئے، مگر کیا کیجیے کہ اس دور موجود کا انسان نا مسلمان رہا ہے اور نا انسان صرف حرص و ہوس میں ڈوبا دولت پرست منہ زور جانور۔

اپنی بھاوج کی موت کا فیصلہ کرکے وہ یوں شاداں فرحاں گھر آئی جیسے کوئی ریاست فتح کرلی ہو۔ ادھر نسیم دل و جان سے بہو لانے کی تیاری کررہی تھی سدرہ کے لئے بیس اعلیٰ ترین جوڑے پندرہ تولہ زیور اور بے شمار دیگر سامان وہ خلاف معمول تاریخ طے کرنے سے قبل ہی تمام تیاری کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ مختصر سی مدت کی تاریخ رکھ کر گھر کی آرائش کروائے گی یہ بھاگ دوڑ والا کام مکمل ہوچکا ہوگا بعد میں اطمینان سے شادی کی رسومات ہوتی رہیں گی رافعہ اور شافعہ بھی ماں کے ساتھ ساتھ ہر کام میں پیش پیش تھیں واجد کے دل کی دنیا سدرہ کے تصورات سے آباد تھی اور ماسٹر صاحب نے واجد کی بدولت دکان سے تھوڑی سی فراغت پالی یہ وقت وہ عبادات میں صرف کرنے لگے رب تعالیٰ کی لطف وعنایات کا شکر بجالانے کے لئے۔

سکینہ اور حمیرا ایک روز شام کے وقت ان کے ہاں وارد ہوئیں اور خوب مٹھار مٹھار کر بھائی بھاوج سے باتیں کرتی رہی ساتھ ہی شادی کے سلسلہ میں اپنی خدمات بھی پیش کیں کہ ان کے لائق کام ہوں تو وہ دونوں حاضر ہیں نسیم نے بہت خوبی سے پہلو بچا لیا اور انہیں کھلا پلا کر شکریہ کے ساتھ رخصت کردیا۔

وہ دونوں درحقیقت جس غرض سے آئی تھیں وہ انہوں نے کام کردیا ان کے جانے کے بعد اگلا دن معمول کے مطابق تھا مگر نسیم کی طبیعت بہت بوجھل اور گری گری سی رہی، رات ہوتے ہی اس کی بے چینی بڑھ گئی مگر وہ ضبط کرکے جیسے تیسے رات گزارلی مگر آنے والا دن بہت اذیت ناک تھا، نسیم بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی وہ سینے پر ہاتھ رکھے کرب و اذیت سے دہری ہوئی جارہی تھی سب ہی پریشان ہوگئے واجد فوراً ماں کو گاڑی میں ڈال کر ایک معروف ڈاکٹر کے پاس لے گیا صبیحہ ماں کے وجود سے جڑی ہوئی تھی ماں کی حالت پر خود بھی تڑپ گئی دونوں بہنوں کو فون کرکے بلوالیا وہ پہلے گھر آئیں اور پھر ماں کی حالت کی خبر لینے وہ بھی کلینک چل دیں، نسیم کو ڈاکٹر نے داخل کرلیا کیونکہ اس کی حالت بہت خراب تھی اس کے ٹیسٹ لئے جارہے تھے اور فوری طبی امداد بھی دی جارہی تھی مگر ڈاکٹر کے علاج سے اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آرہی تھی۔

رافعہ اور شافعہ اپنے والد کے ہمراہ، ماں کے قریب موجود تھیں نسیم بالکل تندرست اور ہر طرح کی بیماری سے دور تھی مگر اچانک ان کی حالت خراب ہوجانے کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سہ پہر کے وقت نسیم کی حالت میں کچھ بہتری آئی تو انہوں نے ماسٹر صاحب کو قریب بلایا اور اپنی نحیف آواز میں ان سے کچھ کہنا چاہا وہ بمشکل بول پارہی تھی۔

ماسٹر صاحب اپنا کان ان کے قریب لائے تو نسیم بیگم نے کہا۔ ''مجھے اپنا بچنا محال نظر آتا ہے میں نے دو روز قبل ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کہ

آپ کی بہن مجھے مارنا چاہتی ہے وہ میرا سینہ چاک کرکے میرا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے اس وقت میں اسے محض خواب سمجھا مگر یہ سچ تھا میرا کلیجہ کٹا جارہا ہے میرے مرنے کے بعد میرے گھر اور بچوں کو اس عورت سے دور رکھیے گا۔" وہ بہت مشکل سے اٹک اٹک کر اتنا ہی کہہ پائی اور پھر سے حالت دگرگوں ہوگئی۔

مگر ماسٹر صاحب یہ سب سن کر ڈھے گے اور صدمے سے نڈھال ہوگئے واجد اور بیٹیاں فوراً والد کو سنبھالنے کو لپکے مگر وہ رفیقہ حیات کی باتوں سے ریت کا ڈھیر ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر مسلسل نسیم بیگم کا علاج کر رہا تھا مگر بیماری سامنے نہیں آرہی تھی اور وہ اب ختم ہوتی جارہی تھی مغرب کی اذان سے قبل انہیں خون کی قے ہوئیں جس میں جگر کے ٹکڑے آئے اور ٹھیک اذان کے وقت پران کا انتقال ہوگیا۔

تمام قریبی عزیز کو ان کی بیماری کی خبر ہو چکی تھی نسیم کی والدہ بہنیں اور بھائی بھاوج انتقال کے وقت وہاں موجود تھے اس کی موت بہت ہی غیر متوقع تھی سب کے سب غم کے پہاڑ تلے آگئے ماسٹر بے ہوش ہوگئے اور آہوں سسکیوں کا طوفان کھڑا ہوگیا انہیں گھر لایا گیا تمام رشتہ دار جمع ہوگئے سب سے خراب حالت ننھی سولہ سالہ صبیحہ کی تھی اسے ماں کی موت کا یقین نہ آتا تھا وہ پتھر کی طرح ساکت ہوگئی۔ ایسی بچی جس نے ہوش سنبھالتے ہی ہر وقت ماں کا آنچل تھامے رکھا ہو وہ بھلا اس کمسنی میں اس حادثے کو کیسے قبول کرپاتی اس کی تو تمام تر دنیا ماں ہی تھی اور موت بھی ایسی ناگہانی کہ برادری بھر کے لوگ یقین نہیں کر پارہے تھے کہ نسیم بیگم اب اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھیں۔

رافعہ اور شافعہ صدمے سے بے حال تھیں ہی ماسٹر صاحب تو بیوی کو کندھا بھی نہ دے پائے اور خود پلنگ کو جا لگے ان کے دونوں سالے انہیں اسپتال لے گئے اس موقع پر سکینہ اور اس کی بیٹی حمیرا منتظم بن کر سامنے آگئی گھر والوں کو سنبھالنا دلاسہ دینا تجہیز و تدفین کے انتظامات کرنا اور کھانا دینا کا کام پکڑ لیا اور پورے گھر پر چھا گئیں بیٹیاں اور بیٹے تو صدمے سے نڈھال تھے انہیں گردوپیش کا ہوش نہیں تھا ماسٹر صاحب خود اسپتال میں پڑے تھے ایسے میں کون انہیں روکتا، نسیم کے میکے والوں کو موقع دیئے بغیر وہ خود ہر طرف چھا گئیں۔

یہ مکار سکینہ کا ایک دانستہ قدم تھا وہ بھری برادری کے سامنے خود کو اپنے بھائی سے قریبی تعلقات کا مظاہرہ کررہی تھی۔

بہرحال گھڑیاں غم کی ہوں یا خوشی کی بیت ہی جاتی ہیں یہ سانحہ بھی بیت ہی گیا مگر سکینہ اپنا وار کرگئی نسیم کی زندگی میں اسے یہ موقع تو نہ مل سکا مگر وہ سفلی عملیات سے واجد کے ذہن کو حمیرا کی طرف موڑ لیتی مگر اس موقع پر وہ ہمدرد بن کر سب گھر والوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کھانے اور پانی کے ذریعے واجد کو تعویذات دیئے گئے تاکہ وہ سدرہ کو بھول کر حمیرا کی جانب مائل ہوجائے، سوئم سے قبل ماسٹر صاحب اسپتال سے گھر آگئے مگر رفیقہ حیات کی جدائی کا داغ ان کے سینے پر لگ چکا تھا۔ گھر آکر دیکھا تو ان کی قاتل بہن ان کے گھر پر ایک فرد کی طرح موجود تھی، انہوں نے اس پر بہت ناگواری کا اظہار کیا تو اس نے وہاں سے کھسکنا بہتر سمجھا۔

صبیحہ بے چاری دو روز سے بھوکی پیاسی اپنے کمرے میں ماں کا غم منارہی تھی ماسٹر صاحب نے آخر خبر لی بیٹی کو سینے سے لگایا تو سارے بند ٹوٹ گئے وہ دونوں روئے تو تمام گھر والے ایک بار پھر آنسوؤں میں بہہ گئے۔

بہرحال گزرتے وقت نے سب کے حواس کچھ بجا کیے تو گھر کی ویرانی نے ایک سوال کھڑا کردیا رافعہ اور شافعہ اپنے گھر والی تھیں نہ صرف گھر والی تھیں بلکہ کچھ دنوں تک اپنے شوہروں کے پاس جانے والی تھیں صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی اسکول جاتی تھی وہ گھر نہیں سنبھال سکتی تھی اب گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے ایک عورت کا ہونا ضروری تھا ماسٹر صاحب نے اس مسئلے کے حل کے لئے بیٹوں سے بیٹھ کر بات کی تو یہ حل نکالا کہ چہلم کے فوراً بعد

سادگی سے سدرہ کو رخصت کر کے لے آیا جائے زیور اور بری نسیم بیگم نے تیار کر رکھی تھی مگر ان کی وفات کا زخم تازہ تھا سو نکاح سادگی سے کرنا ہی مناسب تھا۔

رات کو یہ بات واجد کے آنے کے بعد اس کے سامنے رکھی گئی۔ ماسٹر صاحب اپنی درماندگی کے سبب دکان پر نہیں جاتے تھے ان دنوں واجد مکمل طور پر دکان کی ذمہ داری دیکھ رہا تھا سو صبح کا گیا رات کو ہی آپاتا وہ بات الگ اور سب سے پوشیدہ کہ وہ دکان پر جانے سے قبل پھوپھی کے گھر باقاعدہ جا رہا تھا جہاں وہ سدرہ کو یکسر فراموش کر کے حمیرا سے عہد و پیماں باندھ رہا تھا جو اسے شادی پر زور دے رہی تھی۔

پس پردہ سکینہ عملیات پر اس سارے فتنہ کو چلا رہی تھی خیر جب سدرہ سے نکاح والی تجویز واجد کے سامنے رکھی گئی تو خلاف توقع اس بات پر اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس بات پر سب ہی پریشان ہو گئے کیونکہ یہ ضروری تھا مگر واجد کا انکار سمجھ سے بالاتر تھا۔

بہرحال اس وقت تو اسے ماں کی وفات کا صدمہ سمجھ کر درگزر کیا گیا مگر ہفتہ عشرہ کے بعد واجد نے رافعہ کے سامنے یہ موضوع چھیڑا اور سدرہ کی بجائے حمیرا کا نام لیا، یہ بات رافعہ کو بچھو کے ڈنک کی مانند لگی، اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور رونے لگی مگر واجد کا ردعمل بہت عجیب اور پتھریلا تھا۔

رافعہ نے اسے سمجھایا اس تبدیلی کا سبب پوچھا مگر واجد کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا سوائے ہٹ دھرمی اور حتمی فیصلے کے کہ وہ صرف اور صرف حمیرا سے نکاح کرے گا۔ رافعہ نے فوراً یہ بات دیگر گھر والوں کے سامنے رکھ دی واجد کا فیصلہ ایک قیامت بن کر سب پر ٹوٹا، پہلے تو اس کی اس بے تکی بات کی سمجھ نہ آئی مگر ماسٹر صاحب سمجھ گئے انہوں نے کوئی بحث کی اور نہ وجہ پوچھی بس اتنا ہی کہا کہ ''حمیرا اس گھر میں نہیں آسکتی اگر واجد سدرہ سے شادی نہیں کرے گا تو وہ سدرہ کا نکاح راشد سے کر کے اس گھر میں لے آئیں گے مگر اس کی بات بالکل نہیں مانی جائے گی۔''

ایک طرف تو واجد نے یہ کھٹ راگ پھیلا رکھا تھا دوسری طرف ننھی صبیحہ کی زندگی ماں سے محروم ہو کر اندھیر ہو چکی تھی بہن حتی المقدور اس کا خیال رکھ رہی تھیں راشد بھی روز شام کو آکر اس سے گپ شپ کرتا کبھی گھمانے بھی لے جاتا مگر سب سے عجیب رویہ واجد کا تھا جو آہستہ آہستہ ہر ایک سے لاتعلق ہوتا جا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کے لئے یہ بات سوہان روح تھی کہ ابھی تو اس کی ماں کی قبر کی مٹی نم تھی اور وہ اپنے رویئے سے انہیں بلیک میل کر رہا تھا۔

بہرحال وہ جھکنے والے نہیں تھے واجد کے توسط سے حمیرا کا رشتہ رد کے جانے والی بات سکینہ کے علم میں آچکی تھی وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ نسیم بیگم کو راہ سے ہٹایا تو بھائی راہ میں پتھر بن کر آگیا۔ اس کا تو دل چاہ رہا تھا کہ نسیم کی طرح انہیں بھی منظر سے ہٹا دے مگر یہ قرین مصلحت نہ ہوتا۔ بس اس نے واجد پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر دی۔

ماسٹر صاحب ایک بار پھر بیٹیوں کو لے کر بیٹھے اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگے، شافعہ نے کہا۔ ''ابو حمیرا اس گھر کی بہو بننے کے لائق نہیں دوسری طرف اگر سدرہ سے رشتہ ختم کیا تو ہمارا ننھیال سے رشتہ ختم۔ امی اور آپ نے یہ رشتہ بہت چاؤ سے طے کیا تھا اب اگر واجد منکر ہو گیا ہے تو اس میں سدرہ اور خالہ خالو کا کیا قصور۔''

ماسٹر صاحب جو گہری سوچ میں غرق تھے انہوں نے کہا۔ ''بیٹا میری سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ اگر راشد مان جائے تو ہم تمہارے خالو خالہ سے جا کر بات کرتے ہیں اور واجد کے رویئے کے بارے میں بتا کر معذرت کر لیں گے اور سدرہ کو راشد سے بیاہ کر گھر لے آتے ہیں۔''

دونوں بہنوں نے باپ کی اس رائے پر اتفاق کیا اسی وقت صبیحہ کو بھیج کر راشد کو بلایا راشد جب آکر بیٹھا تو تینوں نے موجودہ صورت حال بتائی اور التجا کی کہ وہ سدرہ کے ساتھ نکاح پر راضی ہو جائے یہ سننا تھا کہ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''باجی پہلی بات کہ میں نے سدرہ کو بھابھی کا درجہ دے رکھا ہے دوسری بات کہ اگر بھائی شادی کے اس

یہاں سے ہٹ رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور، میں تو ابھی انجینئرنگ کے ابتدائی سال میں ہوں میرا ارادہ تعلیم مکمل کرکے اپنے دوست کے ساتھ آسٹریلیا جانے کا ہے، میرا فی الحال شادی کرکے گھر بسانے کا دور تک کوئی ارادہ نہیں، مجھے ایک اعلیٰ مستقبل بنانا ہے تاکہ شوہر بن کر گھر گرہستی کے جھنجھٹ میں پڑنا ہے آپ سب مجھے معاف رکھیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

شبیر احمد بیٹے کی بات سے ٹوٹ سے گئے سدرہ ان کے لئے مثالی بہو اور نسیم کا نعم البدل تھی وہ اسے کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور حمیرا کو لا نہیں سکتے تھے وہ آشیانہ جو نسیم بیگم نے تنکا، تنکا جمع کرکے بنایا تھا اسے صرف سدرہ ہی سمیٹ سکتی تھی ان کے چہرے پر اتری زردی دیکھ کر شافعہ نے کہا۔ "ابوجی آپ یہ بات دل کو نا لگالیں راشد کو پہلی بار میں قائل نہیں کیا جاسکتا مگر مسلسل کوشش کرتے رہے تو وہ یقیناً حالات کو سمجھ لے گا پھر اسکی عمر ہی کیا ہے محض بیس سال اس کا انکار بے جا نہیں مگر ان مجبوریوں سے سمجھوتہ بھی اسی کو کرنا ہوگا۔"

شبیر احمد کی کچھ امید بندھی اور انہوں نے اللہ سے بہتری کی دعا کی۔

سکینہ کو واجد سے ملنے والی خبریں بے چین کررہی تھیں اتنا آگے آکر ناکام ہونا اس کے لئے قابل برداشت نہیں تھا۔ وہ بھی جانتی تھی اگر حمیرا کی بات بروقت نا بنی تو پھر کبھی نہ بن پائے گی واجد جو سدرہ کو دل سے پسند کرتا تھا پھوپھی کے پلائے سفلی تعویزات کی وجہ سے اب حمیرا کی جانب مائل تھا مگر یہ وہ مصنوعی کیفیت تھی جو خود ساختہ تھی اگر اس کے گھر والے سمجھ لیتے اور اس کا روحانی تدارک کرواتے تو مسئلہ ختم ہوجاتا مگر شبیر احمد خود اور ان کا گھرانہ ان خرافات سے کوسوں دور تھے وہ جان ہی نہ پائے کہ درحقیقت معاملہ کیا ہے۔

ادھر چہلم کے دن قریب آرہے تھے رافعہ کے ہمراہ جاکر ماسٹر صاحب نے سارا معاملہ اپنے سارھو اور سالی کے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر التجا کی اگر وہ راشد کو منا لیتے ہیں تو وہ براہ کرم سدرہ کو رخصت کردیں وہ دونوں بھی حالات سے بخوبی واقف تھے اور ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے، انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق عمل کریں گے، ادھر سے اطمینان ہونے کے بعد اب وہ راشد کو دوبارہ سمجھانے کا سوچنے لگے بیٹیوں کو انہوں نے سختی سے تاکید کردی کہ ابھی اس فیصلے کو منظر عام پر نہ لائیں حتیٰ کہ واجد سے بھی پوشیدہ رکھیں۔

دوسری جانب سکینہ نے نئی حکمت عملی سوچی راشد چھوٹا تھا اور اس کا مطمع نظر صرف اس کی تعلیم ہے رافعہ شافعہ عنقریب امریکہ جانے والی تھیں، نسیم کو وہ ٹھکانے لگا چکی تھی، بھائی اس کا بہت سیدھا اور بھولا تھا اگر یہ لوگ باقاعدہ رشتہ لاکر حمیرا کو بہو بنانے کو تیار نہ تھے تو نہ سہی اگر حمیرا اور واجد کا نکاح ہوگیا تو انہیں اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کیونکہ گھر اور دکان کی تمام تر ذمہ داری اب واجد پر تھی وہ محض حمیرا کو ناپسند کرنے کی وجہ سے اپنا بازو کاٹ نہیں سکتے تھے، اس نے چہلم کے فوراً بعد حمیرا اور واجد کے نکاح کی اسکیم سوچ لی، یہ نکاح وہ خود نہیں کروانے والی تھی بلکہ حمیرا اور واجد خود عدالت جاکر نکاح کرتے اور وہ خاندان کے سامنے سارا الزام واجد پر ڈال کر بری الذمہ ہوجاتی، حمیرا ابھی ماموں کے گھر کی امارت اور آشائبات کی بلاشرکت غیرے مالک بننے کے لئے ہر اقدام پر تیار تھی۔

کلام مجید میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان زمین پر رہ کر اپنی چالیں چلتا ہے تاکہ اپنی تقدیر خود بنا سکے مگر وہ اپنی چالیں چلتا ہے کہ اس کی چال انسان پر بھاری ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی ہونے جارہا تھا اس نے بے گناہ نسیم کی جان لی تاکہ بھائی کی ہر شے پر قبضہ جما سکے مگر اللہ کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا ہے۔

ادھر راشد کسی صورت سدرہ سے شادی پر تیار نہ تھا جبکہ گھر والوں کا دباؤ اس پر مسلسل جاری تھا، چہلم سے ایک روز قبل اس نے سوچا کہ وہ خود بھائی سے تنہائی میں بات کرے تاکہ اسے راہ راست پر لاسکے، وہ اپنے پھوپھی اور اس کی بیٹی سے سخت نفرت کرتا تھا، جانتا تھا کہ حمیرا کے اس گھر میں آنے کا مطلب گھر کی تباہی

ہے، واجد دن بھر چہلم کے انتظامات میں لگا رہا پھر عصر کے بعد دکان پر چلا گیا، وہاں بھی کام کی زیادتی کے باعث رات دیر سے ہی آسکا۔

تمام لوگ کھانا کھا چکے تھے صبیحہ نے اسے کھانا دیا وہ کھانے سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں چلا گیا، راشد اسی وقت کے انتظار میں تھا اس نے کتابیں سمیٹیں اور بات کرنے کی غرض سے بھائی کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے دروازے کے قریب آکر وہ دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے آتی آواز نے اسے سہا دیا وہ غیر ارادی طور پر خاموشی سے بھائی کی آواز سننے لگا۔

واجد اپنے سیل فون پر حمیرا سے بات کر رہا تھا وہ غالباً دوسری جانب جھوٹ موٹ رو رہی تھی اور واجد اسے بار بار خاموش ہونے کی التجا کر رہا تھا۔ ''سنو حمیرا پلیز! چپ ہوجاؤ، رومت میں قسم کھاتا ہوں کہ چہلم کے فوراً بعد تم سے نکاح کرلوں گا چاہے ابو مانیں یا نہ مانیں، تم اس گھر میں آؤ گی امی نے سدرہ کے لئے جو کچھ بھی تیار کر رکھا ہے وہ سب تمہارا ہوگا۔''

پھر رک کر دوسری جانب وہ بات سننے لگا اس کی بات سننے کے بعد وہ بولا۔ ''تم بھی حمیرا حد کرتی ہو سدرہ اس گھر میں کیسے آسکتی ہے راشد تو اس سے شادی پر راضی ہی نہیں، ویسے بھی یہ سب ایک بہو کے لئے ڈرامہ ہو رہا ہے جب ہم تم کورٹ میرج کرلیں گے تو ابو اور بہنیں لامحالہ تمہیں قبول کرلیں گے پھر کیسی فکر بس تم بے فکر ہوکر سوجاؤ اور آنے والے جمعہ کے روز ہم کورٹ میں نکاح کرکے سیدھا گھر آئیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

ادھر راشد کے قدموں تلے سے زمین سرک چکی تھی وہ بات کئے بغیر وہیں سے پلٹ آیا اسے اپنے بھائی سے ایسی بے حسی اور بے غیرتی کی امید نہ تھی وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ واجد سے بات کرکے اسے قائل کرلے گا مگر یہاں تو نقشہ ہی پلٹ چکا تھا وہ بے چینی اور پریشانی کے باعث رات بھر سو نہ پایا مگر تمام رات کے رت جگے نے اسے ایک فیصلے تک بہر حال پہنچا دیا۔

اللہ کی حکمت کا آغاز ہو چکا تھا اگلے روز چہلم ہوا شبیر احمد اور ان کے بچے ایک بار پھر جانے والی کے دکھ میں ڈوب گئے، تمام انتظامات نسیم کے میکے والوں نے سنبھال رکھے تھے، آہوں سسکیوں میں یہ رسم انجام پائی۔ سدرہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی کھانے کے بعد راشد اسے خاموشی سے بلا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ماں کو یاد کرکے رونے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی تھیں اس نے سدرہ کو مخاطب کیا۔ ''سدرہ میں تمہیں یہاں بہت اہم بات کرنے کی غرض سے لایا ہوں بات یہ ہے کہ تمہیں بھی علم ہوگا کہ ابو اور بہنیں بھائی کے انکار کے بعد مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ میں تم سے شادی کرلوں جبکہ میں نے اس نظریئے سے کبھی سوچا ہے اور نہ تم نے، میں تو بھائی کو مجبور کرکے اس طرف لانے کا سوچا مگر کل رات میں نے اتفاقاً انہیں بات کرتے سن لیا کہ وہ عنقریب حمیرا سے کورٹ میرج کرنے والے ہیں اور یہ ان کا حتمی فیصلہ ہے۔''

یہ سنتے ہی سدرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا اور دو آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے چند لمحوں کے توقف کے بعد راشد نے کہا۔ ''یہ بات میں نے کسی کو ابھی نہیں بتائی صرف تمہیں بتا رہا ہوں اب تم بتاؤ کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے جو بھی فیصلہ ہو وہ ہم دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا کہ آئندہ کے لئے مشکلات نہ کھڑی ہوں۔''

سدرہ نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ خالو اور رافعہ باجی پچھلے ہفتے امی ابو سے ملے تھے اور تم سے نکاح کی بات طے کرلی تھی دل تو میرا ابھی نہیں مان رہا تھا مگر امی نے مجھے سمجھایا کہ نسیم خالہ نے برسوں لگا کر یہ آشیانہ بنایا ہے جس کو برباد کرنے کے لئے آپ کی پھوپھی درپے ہے، خالو کا بڑھاپا صبیحہ کی دیکھ بھال اور گھر کا انتظام اس سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے اگر میں انکار کردوں گی تو سب خراب ہوجائے گا للہذا مجھے اپنے لئے نہیں بلکہ تم سب کے لئے یہ کرنا ہوگا مگر میں تم پر

www.urdusoftbooks.com

زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہتی، میں شادی کئے بغیر بھی یہ سب کرنے کو تیار ہوں مگر واجد حمیرا کو بیاہ کرلے آیا تو میری اس گھر میں حیثیت ختم ہوجائے گی۔"

راشد نے کہا۔" میں نے بھی اس موضوع پر بہت زیادہ سوچا ہے، میں بھی اپنی ماں اور اس گھر کے لئے تم سے نکاح پر تیار ہوں لیکن کیا تم میری تعلیمی مصروفیات اور بعد میں آسٹریلیا جانے پر اعتراض تو نہیں کرو گی۔"

سدرہ نے کہا۔" راشد میں اور تم کوئی محبت کی شادی نہیں کررہے بلکہ اس گھر کو محفوظ بنانے کے لئے قربانی دے رہے ہیں سو تم جو بھی کرو میں دخل نہیں دوں گی مجھے بھی تمہیں قبول کرنے میں وقت لگے گا جیسے تم مجھے قبول کرنے میں وقت لو گے۔"

راشد نے سدرہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے لے کر باہر آگیا۔ شام کو تمام مہمان رخصت ہوگئے، صرف ماسٹر صاحب کی خوش دامن یعنی کہ صبیحہ کی نانی رک گئیں، رات کو کھانے کے بعد راشد نے شافعہ کے کان میں کہا کہ وہ سب واجد کے علم میں لائے بغیر ابو کے کمرے میں جمع ہوجائیں میں نے آپ سب سے اہم بات کرنی ہے" شافعہ سمجھ گئی۔

رات ساڑھے دس بجے کے بعد جب واجد کے سوجانے کا اطمینان ہوگیا تو راشد نے اپنے والد کے کمرے میں آگیا، نانی سمیت وہاں سبھی موجود تھے۔ راشد نے دروازہ اچھی طرح سے بند کرکے سب سے پہلے تو نکاح کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ اس پر سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی شبیر احمد نے بیٹے کو گلے لگا کر دعائیں دیں، بہنوں نے خوشی کے آنسو بہائے مگر اس کی اگلی بات پر سبھی کو سانپ سونگھ گیا جب اس نے یہ بتایا کہ۔" واجد مخفی طور پر حمیرا سے عدالتی نکاح کرنے والا ہے۔" راشد نے کہا۔" ابو میں سدرہ سے اسی صورت شادی کروں گا جب تک آپ یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ حمیرا کو قبول نہ کیا جائے کیونکہ میں اسے اس گھر میں سدرہ کے مقابل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

ماسٹر صاحب نے کہا۔" بیٹا اطمینان رکھو تم میں سے کوئی واجد سے بات نہ کرے بلکہ وہ جو کرنے جارہا ہے کرنے دو اس کا شافی علاج میرے پاس ہے بس تم سب خاموشی سے راشد کی بارات لے جانے کی تیاری کرو، ہم سادگی سے ہی سہی مگر اس خوشی کو اچھے انداز سے منائیں گے، تم نے بیٹا جن دوستوں کو مدعو کرنا ہو کرلینا اور بہنوں کے ساتھ مل کر دیگر معاملات بھی دیکھ لو، غم اور خوشی انسان کے ساتھ ساتھ ہیں واجد سے مجھے اس بات کی توقع بالکل نہیں تھی مگر اب وہ اپنی سطح سے نیچے آ ہی گیا ہے تو اس کا حل بھی میرے پاس ہے۔" نانی نے بھی راشد کے اس ایثار پر اسے بہت سی دعائیں دیں۔

راشد بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا ماں کے بے وقت چلے جانے کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ بھائی کی خود غرضی کا تاوان بھی اسے بھرنا پڑ گیا لیکن سدرہ کا جذبہ ایثار دیکھ کر اس کی پریشانی کم ہوگئی تھی شبیر احمد کا گھرانہ موتیوں کی ایسی مالا تھا جسے ان کی لالچی بہن توڑ کر بکھیرنا چاہتی تھی مگر اللہ جس کی حفاظت کرے وہ اور مضبوط ہوجاتے ہیں مگر سکینہ سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کیسے ہوتی۔

ادھر واجد تمام تر تیاری کے ساتھ حمیرا کو اپنانے جارہا تھا بالکل اسی طرح رافعہ اور شافعہ واجد سے پوشیدہ شادی کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ ٹھیک جمعہ کے روز واجد گھر سے دکان کا کہہ کر نکلا تو اس کے فوراً بعد ماسٹر صاحب بھی بیٹے کی بارات لے گئے، واجد ابھی پھوپھی کے گھر تھا کہ اس کے کزن نے اسے سیل پر اطلاع دی کہ وہ بارات کے ساتھ کیوں نہیں آیا جبکہ سب آچکے ہیں، اس نے حیران ہوکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کے علم میں لائے بغیر اس کے گھر والے سدرہ کو رخصت کرانے کے لئے باقاعدہ بارات لے کر اس کی خالہ کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ واجد کے دل پر گھونسا لگا یہ بات معمولی نہیں تھی مگر اب کیا ہوسکتا تھا اس نے ساری بات پھوپھی کو بتائی تو اس کا دماغ گھوم گیا یہ اس کی پہلی

شکست تھی مگر وہ اب بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی جبکہ واجد کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب چھوڑ کر نکل جائے۔

حمیرا یہ سب جاننے کے بعد بھی بضد تھی مجبوراً وہ اسے لے کر عدالت آ گیا اور نہایت بجھے دل کے ساتھ نکاح کر لیا مگر گھر جانے کی بجائے واپس پھوپھی کی طرف آ گیا۔

شام کو ماسٹر صاحب کا گھرانہ بہو رخصت کروا کر واپس آ گئے۔راشد دلہا بن کر باپ اور بہنوں کی آنکھوں میں چاند کی طرح جگمگا رہا تھا، سدرہ کا خوب صورت باطن بھی اب اس کے چہرے کا نور بنا ہوا تھا۔خاندان بھر کے لئے یہ تبدیلی حیران کن تھی کہ واجد کی بجائے راشد دلہا بنا ہوا ہے مگر ماسٹر صاحب نے سب کے سوالوں کا جواب دیا اور واجد کی غیر حاضری کی وجہ بھی بتائی۔

بہرحال یہ شادی خیروخوبی سے انجام پائی اور ولیمہ دو روز کے بعد رکھا گیا، رات گئے مہمان رخصت ہونے کے بعد واجد بھی حمیرا کو لے کر باپ کے سامنے پیش ہو گیا، سکینہ نے بھتیجے کو ذہنی طور پر تیار کیا تھا کہ اس کے گھر والے جی بھر کے لعن طعن کریں گے برا بھلا کہا جائے گا مگر آخر میں سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا سو وہ بھی سوچ کر گھر والوں کی عدالت میں آ گیا۔

بنی ٹھنی حمیرا اس غرور کے ساتھ آئی کہ وہ آئندہ اس گھر کی بڑی بہو کہلائے گی مگر جب شبیر احمد نے بیٹے کو بھانجی کے ساتھ دیکھا تو خاموشی سے اس کی بات سنی ،،بہنوں کے دل بھی بھائی کی اس حرکت پر سلگ رہے تھے خلاف توقع وہ نہ گرجے اور نہ برسے بس اتنا کہا ۔’’واجد تم نے جو کیا سو کیا اب میں تمہیں اس گھر، دکان اور تمام جائیداد سے عاق کرتا ہوں، تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ، آئندہ نہ گھر پر آنا اور نہ ہی دکان پر، تمہارا ہمارا ناطہ ختم ، میں تمہاری ماں کے قاتلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔‘‘

واجد یہ سن کر چکرا گیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔حمیرا کا منہ فق ہو گیا دونوں مجرموں کی طرح چہرہ لٹکا کر نکل گئے۔مگر تو شبیر احمد کی کوئی کمی مگر وہ اپنے اصولوں سے ہٹ نہیں سکتے تھے انکا فیصلہ سو سنار کی اور ایک لوہار کے مصداق تھا یہی ٹھیک فیصلہ تھا۔

اگلی صبح راشد کالج چلا گیا رافعہ اور شافعہ بھی خوش تھیں کہ گھر سنبھالنے والی آ گئی ہے ماسٹر صاحب نے گھر کے تمام معاملات سدرہ کے سپرد کر دیئے ،صبیحہ جو ماں کے انتقال سے لے کر اب تک سوگوار تھی وہ بھی سدرہ کو دیکھ کر خوش تھی۔

ادھر سکینہ کے گھر میں ماتم جیسا ماحول تھا جن امیدوں کو لے کر اس نے یہ سب کیا تھا وہ خاک میں مل گئیں، ہاتھ بھی کچھ نا آیا اور جگ ہنسائی بھی اسی کی ہو رہی تھی ،اوپر سے ایک عزیزہ یہ پیغام اس کے بھائی کی طرف سے لے کر آئی کہ ’’سکینہ اور اس کے گھر کے تمام افراد بھول کر بھی ماسٹر صاحب کے گھر کا رخ نہ کریں یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔‘‘

بھائی نے بہن سے جینا مرنا اور ہر تعلق ختم کر دیا تھا وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی وہ بھائی کے مال پر عیش کیا کرتی الٹا بھتیجا بیروزگار ہو کر اس کے در پر آ پڑا تھا۔ اس کے سارے وار اسی پر پڑے تھے۔ سر پکڑے وہ واجد کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی حمیرا جو اس سے قبل واجد پر ہر لمحہ نثار ہوئی جاتی تھی اس وقت اس کے وجود سے قطعاً بے نیاز اپنے آپ کمرے کو بند کر کے اندر پڑی تھی، واجد جو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پھوپھی کے سہارے مستقبل کے لئے سوچ بچار کرے گا حمیرا کے ہمراہ نئے سر سے زندگی کی ابتداء کرے گا اب دونوں کی بیگانگی پر از حد رنجیدہ تھا گھر کاروبار اور اہل خانہ کو اسے چھوڑنا پڑا لیکن ان دونوں کی سوگوار کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی اب تک دونوں کے رویئے سے اس نے خود کو پھوپھی کی آنکھ کا تارہ اور حمیرا کا محبوب سمجھا تھا۔

بہت جلد اس کی سمجھ میں یہ بات آنے والی تھی کہ ان دونوں کی منزل اس کے گھر کی امارت اور آسائیشات تھیں وہ تو محض راستہ تھا منزل تک جانے کا۔

دو روز کے بعد راشد کا ولیمہ ہوا جس میں اس

کے حقیقی بھائی اور پھوپھی کے علاوہ ڈھیروں افراد مدعو تھے واجد کو اپنوں سے دور ہونے کا دکھ ہو رہا تھا شبیر احمد کی زندگی میں جو طوفان آنا تھا آ چکا لیکن آنے والی صبحیں اور شامیں پھر سے حسین ہونے والی تھیں۔

ایک ہفتہ کے بعد رافعہ اور شافعہ امریکہ سدھار گئیں سدرہ نے بھی دلہن پنا ترک کر کے گھر کی تمام ذمہداریاں سنبھال لیں صبیحہ پر بھرپور توجہ دینی شروع کردی کیونکہ نسیم بیگم کی وفات سے سب سے زیادہ متاثر وہی تھی زندگی قرینے سے رواں ہوگئی۔

مگر ادھر واجد کے برے دنوں کا آغاز ہوگیا نکاح سے لے کر اب تک اسے ایک بار بھی حمیرا کے قریب جانے کا موقع نہ ملا، وہ ہر وقت اسے دھتکارتی رہتی اوپر سے مردے پہ سو درے سکینہ اسے کوستی رہتی، بات بے بات بوجھ ہونے کا طعنہ دیتی اب تو اکبر بھی کنی کترانے لگا تھا کیونکہ بہنوئی سے ملنے والا مہنگا موبائل اور ہیوی بائیک کا وعدہ اب کبھی بھی وفا ہونے والا نہ تھا۔

اس گھر میں واجد پر اس کی زندگی تنگ ہو چکی تھی وہ بچپن سے شائستہ ماحول میں رہا تھا اس کے اپنے گھر کی فضا ان تمام برائیوں سے پاک تھی جو اسے اب واضح ہو رہی تھیں یہ سب وہ بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ ہی جھیل سکا اور یہاں سے الگ ہوگیا۔

سیدھا ننھیال والوں کی طرف گیا اور سب سے باری باری معافی کا طلب گار ہوا نانی تو نانی تھی اس کو معاف کیا تو سب نے معاف کردیا پھر اس نے ماموں ممانی اور نانی سے کہا۔ ''وہ اس کے ساتھ چلیں اور اسے باپ اور بھائی سے بھی صلح کروا دیں۔'' یہ تمام لوگ واجد کے ہمراہ ماسٹر صاحب کے ہاں آئے، واجد نے والد اور بھائی سے رو رو کر معافی مانگی اور اپنی غلطیوں پر شرمسار ہوا، راشد نے تو بھائی کو فوراً ہی گلے لگا لیا مگر ماسٹر صاحب نے حمیرا کو طلاق دینے کی شرط رکھی، ساتھ ہی سکینہ سے کبھی کوئی خفیہ تعلق نہ رکھنے کا عہد لیا کیونکہ بہت زیادہ امکان تھا کہ اس کی گھر واپسی کا جان کر وہ لوگ دوبارہ کوئی سازش کر سکتے تھے مگر خود واجد کو جو سبق مل چکا تھا اس کے بعد اسے پھوپھی اور اس کے اہل خانہ کے ناموں سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔

واجد نے باپ کی تمام شرائط مانیں حالات معمول پر آ گئے۔ سکینہ کو واجد کے گھر واپسی کی خبر اور حمیرا کی طلاق ایک ساتھ موصول ہوئیں اور اس کے زخموں کو مزید ہرا کر گئیں۔

واجد نے ایک بار پھر دکان پر جانا شروع کردیا گھر پر اسے کھانا اور لباس تمام ضروریات بخوبی پوری ہو رہی تھیں بس سدرہ اس کا سامنا کم کرتی اور وہ خود بھی اس سے شرمندہ شرمندہ رہتا۔ راشد اور سدرہ کے مابین بھرپور تعلق دیکھ کر اسے محرومی کا احساس بھی ہوتا اسے حمیرا کے ساتھ گزرے ذلت بھرے دن یاد آ جاتے آخر کو اس نے خود ہی اپنا کمرہ تبدیل کرنے کا سوچ لیا۔

وہ چھت پر بنے ہوئے کمرے میں منتقل ہوگیا تاکہ وہ شرمندگی کے احساس سے بچ سکے۔

کچھ عرصہ کے بعد خبر ملی کہ سکینہ کو فالج ہوگیا ہے اس لاچاری کی بیماری میں اس کی اولاد اس کی خبر گیری کرنے کی بجائے اپنے مشاغل میں مصروف رہتی اکبر اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کی وجہ سے پولیس کی حراست میں تھا اور حمیرا نے بہت سے لڑکوں سے شناسائی بنا رکھی تھی اور بڑی بیٹیاں اپنے گھروں میں مصروف تھیں انہیں ماں سے کچھ خاص محبت نہ تھی۔

سکینہ کسمپرسی سے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ اس نے درحقیقت جادو کا سہارا لے کر ایک بے گناہ جان لی، ساتھ ہی اللہ کے احکام کی صریح روگردانی کی جس کا بدلہ وہ کچھ دنیا میں پا رہی تھی اور سزا قبر میں ملنے والی تھی۔

جادو شیطان کا وہ خوشنما اور پر فریب جال ہے جس کے ذریعہ وہ اولاد آدم کو اللہ کے خلاف لے جانے کے لئے استعمال کرتا ہے، اب یہ انسان پر ہے کہ وہ چند لمحوں کی خوشی چاہے یا اللہ کی رضا میں راضی ہو کر دائمی فلاح پا لے۔

(جاری ہے)



جادوگر

ملک این اے کاوش۔ سلانوالی سرگودھا

اچانک قبرستان میں گولی چلنے کی آواز گونجی تو قبرستان کی سکوت زدہ فضا میں تھلکہ برپا ہوگیا اور ایک بھیانک چہرے والا شخص سہم گیا اور پھر اس کے ہاتھ سے لاش پھسل کر نیچے گری تو……

کہتے ہیں کہ کالا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور اس حقیقت کا پتہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا

قبرستان کے گھپ اندھیرے میں کوئی بھی چیز واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ باوجود اس کے اس کی گول گول آنکھیں ڈیلوں کے اندر ادھر ادھر سرعت سے حرکت کررہی تھیں۔ اس کی متلاشی آنکھیں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں تب ہی اس کی متلاشی نگاہیں ایک جگہ تھم گئیں وہ ایک تازہ قبر تھی، جس کی مٹی نرم و گداز مٹی سے ابھی تک بساندا اٹھ رہی تھی اس قبر کی مٹی پر پھول کی پتیاں ابھی تک بکھری پڑی تھیں گلاب کی پتیاں ابھی تک مرجھائی تو نہیں تھیں لیکن سوکھنا شروع ہوگئی تھیں۔

اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ جلوہ گر ہوچکی تھی اس کی سیب کی سی گول آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہوچکی تھیں دیئے کی مانند دہکتی وہ آنکھیں مزید چمکنے لگیں۔

اس کے پیچھے کی طرف مڑے ہوئے پیر اس قبر کی طرف بڑھنے لگے۔ جلد ہی وہ اس قبر کے پاس پہنچ گیا عین اسی

وقت جب وہ قبر کے بالکل قریب پہنچا دور فلک پر بادلوں کی اوٹ سے چندہ ماموں نے سر نکالا اور جیسے ہر طرف نور ہی نور پھیل گیا چاند کی چاندنی اس کے چہرے پر پڑی تو اس کے بھیانک نین نقش دکھائی دیئے۔اس کے بالوں میں صدیوں کی میل کچیل مجتمع تھیں اس کے چہرے کا گوشت لڑھکا ہوا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے گل سڑ کر لٹکا ہوا ہو۔اس کے چہرے پر ان گنت آبلے بلبلے ہوئے تھے یہی نہیں اس کے ہاتھوں کا حال بھی کچھ کم نہ تھا۔اس نے گہرے سرمئی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا لیکن اس کی دگرگوں حالت اس بات کا اعلان کررہی تھی کہ اس کا ہاتھ جھلسایا گیا ہے یا پھر کسی موذی بیماری نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

اس نے ایک حیوانہ نگاہ ایک شریر بادل کی اوٹ میں ہوتے چاند پر ڈالی اور مسکرایا مسکراہٹ کیا تھی ایک اور بھیانک منظر تھا اس نے پیلے زنگ آلود دانت چاند کی روشنی میں چمکے اور پھر چاند کی چاندنی یک لخت غائب ہوگئی۔دوسرے ہی لمحے اس نے دونوں ہاتھوں سے قبر کی مٹی کو ہٹانا شروع کردیا جلد ہی نرم مٹی ادھر ادھر بکھر گئی اور اس کے سامنے تختے آگئے۔

ایک بار پھر چاند نے بادل کی اوٹ سے سر نکال کر جھانکا۔اس بدہیبت شخص نے ایک ساتھ دو تختے ہٹائے۔پھر سجدے کی حالت میں لیٹ کر اس نے اپنا داہنا ہاتھ قبر کے اندر ڈالا اور ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔جلد ہی اس کے ہاتھوں کی حرکت رکی اور دوسرے ہی لمحے اس نے قبر کے اندر رکھی لاش کو باہر نکالا،لاش کو اس نے کفن کے درمیان سے جکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے ہاتھوں میں پنڈولم کی مانند جھولنے لگی وہ ایک ناقابل یقین وناقابل فراموش منظر تھا۔

اس نے زور سے قبر کی مٹی پر لاش کو پھینکا پھر جھک کر اس نے دونوں ہاتھوں سے کفن کو پرزے پرزے کردیا جلد ہی کفن میں لپٹی ہوئی لاش اس کے سامنے تھی وہ لاش ایک نوجوان دوشیزہ کی تھی جس کے چہرے پر موت کا کوئی خوف نہ تھا۔نہ ہی موت کی اذیت کے باعث اس کی پیشانی پر سلوٹیں عیاں تھیں اس دوشیزہ کا انگ انگ نکھرا ہوا تھا اس کے شریر کے نشیب وفراز حتیٰ کہ ایک ایک عضو اس کے سامنے تھا اس نے اس دوشیزہ کے کفن کی قید سے آزاد جسم کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔

عین اس وقت جب وہ اس کا لاشہ اٹھا کر چلنے لگا تھا تو فضا میں گولی چلنے کی ساعت شکن آواز گونجی جس نے قبرستان کی سکوت زدہ فضاء میں تہلکہ برپا کردیا۔وہ بھیانک چہرے والا شخص سہم سا گیا لاش اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر جا گری۔اس نے خود کو سنبھالا اور مڑ کر اس طرف دیکھا جس طرف سے گولی چلی تھی۔

"خبردار۔" ایک مردانہ آواز نے اس کی ساعت پر دستک دی۔"ہلنے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا ڈالوں گا۔"

☆......☆......☆

ایس ایچ او منگل پانڈے کو شروع سے ہی برائی سے کافی کدورت تھی۔تھا تو وہ ہندو مذہب کا مگر مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر تھا۔جس علاقے میں اس کی پوسٹنگ ہوتی اس علاقے کے لوگ سکھ کا سانس لیتے۔منگل پانڈے امن وسکون کا متمنی تھا۔کتنی ہی ہندو شرپسند تنظیموں کو اس نے ناکوں چنے چبانے پر مجبور کیا تھا۔

ایس ایچ او منگل پانڈے کا اس علاقے میں ٹرانسفر ہوئے دو ماہ ہوگئے تھے ان دو ماہ کے اندر سات نوجوان لڑکیوں کا اغوا ہو چکا تھا منگل پانڈے کی زندگی میں اس سے قبل کوئی ایسا موقع نہ آیا تھا کہ جب کوئی معاملہ اتنی طول پکڑ سکے اس کے گیارہ سالہ کیریئر کا یہ پہلا کیس تھا جس نے الٹا اسے ناکوں چنے چبانے پر مجبور کردیا تھا۔

ایس ایچ او منگل پانڈے نے ہر حربہ آزما کر دیکھا تھا لیکن مجرم اتنا شاطر تھا کہ کوئی سراغ تک نہ چھوڑتا تھا منگل پانڈے کی راتوں کی نیند اور دن کا چین غارت ہو کر رہ گیا تھا۔رات کے سوا گیارہ بجے کا وقت ہوگا ایس ایچ او منگل پانڈے اپنے ڈرائیور اور دو مسلح جوانوں کے ساتھ گشت کرتا ہوا قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ گاڑی ہچکولے لے کر یکدم بند ہوگئی عین اس وقت جب

ڈرائیور دوبارہ گاڑی کو اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ایس ایچ او منگل پانڈے کی نگاہ قبرستان کے اندر گھومتے ایک سائے پر پڑی۔ اچانک چاند کی چاندنی میں اس انسان کا دکھائی دینے والا ہیولہ اسے کچھ عجیب سا لگا تو اس نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے سے منع کر دیا ایس ایچ او منگل پانڈے سرعت سے گاڑی سے باہر نکلا اس کے نکلنے کی دیر تھی کہ مسلح جوان بھی باہر نکل آئے۔

”گاڑی مت اسٹارٹ کرنا۔“ ایس ایچ او منگل پانڈے کے تحکمانہ لہجے میں ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”نہ ہی اس کی لائٹس آن کرنا تم گاڑی میں ہی بیٹھو اور تم (نوجوان کی طرف رخ کرکے) میرے ساتھ آؤ جلدی۔“

”کیا ہوا سر خیریت تو ہے ناں......؟“ ایک نوجوان نے سرگوشیانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”میں نے ابھی قبرستان کے اندر کسی کو گھومتے دیکھا ہے۔“ ایس ایچ او منگل پانڈے بولا۔ ”نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے یہ مسلمان کا قبرستان ہے اور مجھے اتنا تو معلوم ہے کہ ان کے گورکن یوں ساری قبرستان کے اندر چہل قدمی نہیں کرتے۔ بے شک وہ قبرستان میں رہتے ہوں مگر قبرستان کا پرہول سناٹا بڑے سے بڑے طاقتور انسان کا کلیجہ ہلا کر رکھ دیتا ہے۔“

ڈرائیور کو گاڑی میں بیٹھا کر منگل پانڈے سمیت مسلح جوان دیوار پھلانگ کر قبرستان میں آئے تب ہی انہوں نے اس پرہیبت شکل والے انسان کے ہاتھوں میں کوئی چیز دیکھی بغور دیکھنے پر ان کے حواس باختہ رہ گئے اس شخص کے ہاتھوں میں ایک برہنہ لاش تھی منگل پانڈے نے پستول والا ہاتھ اوپر کرکے ایک خالی فائر کیا کہ اس شخص کے ہاتھوں سے لاش زمین جا گری۔ زمین پر لاش گرنے کی وجہ سے حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ لاش کسی جوان لڑکی کی تھی اس شخص نے جب مڑ کر ان کی طرف دیکھا تو ان سب کی رگوں میں دوڑتا لہو منجمد ہونے لگا۔

”ہلنے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا ڈالوں گا۔“ ایس ایچ او منگل پانڈے نے پسٹل کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے کہا تو مسلح جوانوں نے بھی اس پر گنیں تان لیں۔ ”اپنے ہاتھ اوپر کرلو اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ اگر کسی بھی قسم کی چالاکی دکھانے کی سعی کی تو تیرے شریر میں اتنے چھید کردوں گا کہ تو بھول جائے گا کہ کھانا کہاں سے ہے اور نکالنا کہاں سے ہے؟“

بدشکل انسان جو فائر کی آواز سن کر سہم سا گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے منتشر ہوتے حواس کو قابو میں کیا اور کھا جانے والی آنکھوں سے سب کو گھورا پھر اس نے زمین پر گری برہنہ دوشیزہ کی لاش کو دیکھا ایس ایچ او منگل پانڈے اس وقت سکتے کی حالت میں رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ اس انسان نے اس کی بات کو پس پشت ڈال کر جھک کر اس دوشیزہ کی لاش کو اٹھانا چاہا۔

”ابے او سالے زندگی پیاری نہیں ہے کیا؟“ منگل پانڈے غصے سے پیچ وتاب کھا کر بولا۔

اتنا کہہ کر منگل پانڈے نے اس کی طرف قدم بڑھائے تو اس کی دیکھا دیکھی اس کے مسلح جوان بھی آگے بڑھے۔ تب تک وہ لاش کو ایک بار پھر ہاتھوں کی جھولی میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”لاش کو نیچے رکھ دو ورنہ تیری تکہ بوٹی ایک کرکے رکھ دوں گا آخری بار تجھے سمجھا رہا ہوں اگر حکم کی تعمیل نہ کی تو تیرا برا حشر ہوگا۔“

”باؤلے تو مورکھ ہے۔“ اس شخص نے اپنے بھدے پیلے دانت نکالتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے ان کے درمیان سے یوں غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔

اس منظر نے سب کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے سامنے ایک طرف کھودی گئی قبر اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا تھا اس میں بے یقینی کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ ماورائی مخلوق سے متعلق سنی سنائی کہانیاں آج انہیں حقیقی معلوم پڑ رہی تھیں۔

”سر......“ ایک نوجوان کی خوف کی شدت کے باعث کانپتی ہوئی آواز نے ایس ایچ او منگل پانڈے کی سماعت پر دستک دی تو اس نے سوالیہ آنکھوں سے

اسے دیکھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" ایس ایچ او منگل پانڈے بولا۔ "چلو پتہ تو چلا کہ ان واقعات کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ نہیں۔ بھگوان کی سوگند اس گندی مخلوق کا خاتمہ میں ہی کروں گا۔"

"سر اب کیا کرنا ہے؟" دوسرے نوجوان نے پوچھا۔

"تم میں سے کوئی بھی میڈیا کے سامنے یا کسی کے سامنے بھی اس بارے میں کوئی بات نہ کرے۔" ایس ایچ او نے سب کو تحکمانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بات کا بتنگڑ بن جائے گا اسے ہماری ناکامی تصور کیا جائے گا اس قبر پر مٹی ڈال کر اسے بند کردو۔"

سب جوانوں نے مل کر قبر دوبارہ بند کردی اور اس راز کو وہیں دفنا کر وہ باہر نکلے۔ ڈرائیور کو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے تھے۔

☆......☆......☆

شانتی نگر سے باہر بنی یہ حویلی آسیب زدہ حویلی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ رات تو درکنار دن دیہاڑے بھی کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ شانتی نگر گاؤں کوئی چھوٹا سا گاؤں نہیں تھا بلکہ ایک شہر کی مانند تھا۔ آبادی پھیل چکی تھی اور اب تو دو ہزار سے زیادہ مکان بن چکے تھے۔

شانتی نگر کے باسیوں کا کہنا تھا کہ یہ حویلی ٹھاکر جابر سنگھ کے پتا مہندر سنگھ نے بنوائی تھی۔ ٹھاکر مہندر سنگھ ایک نہایت ہی احساس مند اور مخلص انسان تھا جبکہ اس کا بیٹا ٹھاکر جابر سنگھ اپنے نام کی طرح حد سے زیادہ جابر تھا۔ ٹھاکر مہندر سنگھ اپنے بیٹے کو کافی سمجھاتا کہ وہ سدھر جائے ٹھاکر جابر سنگھ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ باپ کی نصیحتوں سے تنگ آ کر ایک دن ٹھاکر جابر سنگھ نے باپ کو زہر دے کر مار دیا۔ سب کو معلوم ہونے کے باوجود کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ کوئی اس کے خلاف زبان کھولتا۔

انہی دنوں ایک سادھو ٹھاکر جابر سنگھ کا مہمان بنا۔ سادھو کالے علم کا ماہر تھا۔ اس نے کچھ ایسی چیزیں اور کمالات دکھائے کہ ٹھاکر جابر سنگھ نے اس کی منت سماجت کر کے اس کی شاگردی شروع کردی اور کالے علم پر دسترس حاصل کرنا شروع کردی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ مزید خطرناک ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے چند ملازموں کو پیسہ دینا شروع کردیا اور ان کے ذریعے معصوم بچے اغوا کرنا شروع کردیئے۔ حویلی کے تہہ خانے میں سادھو کے کہنے پر ایک دیوقامت بت رکھوایا گیا تھا۔ ان بچوں کو سادھو کے ساتھ مل کر ٹھاکر جابر سنگھ اس بت کے چرنوں میں بلی چڑھا دیتا تھا۔ کسی بھی ملازم کو تہہ خانے میں جانے کی اجازت نہ تھی غریب ملازم اس کے خوف اور پیسے کے لالچ میں آ کر بچے اغوا کر کے لاتے تھے۔

ٹھاکر جابر سنگھ کے ظلم کی انتہا کی خبریں جنگل میں آگ کی طرح پھیل رہی تھیں۔ پھر ایک دن شانتی نگر کے باسیوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ٹھاکر جابر سنگھ کو اس کے ظلم سمیت اس کی حویلی میں جلا دیا جائے ٹھاکر جابر سنگھ اس وقت تہہ خانے میں براجمان آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کئے کوئی منتر الاپ رہا تھا جب شانتی نگر کے باسی چپ چاپ اس کی حویلی کو گھیر چکے تھے ٹھاکر جابر سنگھ کا خاص ملازم موہن لال لوہے کے بڑے وزنی گیٹ میں بنے ایک چھوٹے سے چھید سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

موہن لال گاؤں والوں کی نیت سمجھ چکا تھا اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا ٹھاکر جابر سنگھ کے ہر برے اور ناجائز کام میں وہ اس کا مددومعاون تھا۔ ہر ملازم ٹھاکر جابر سنگھ کو چھوڑ چکا تھا لیکن سوائے موہن لال کے ٹھاکر جابر سنگھ کے پاس کوئی نہ بچا تھا۔ ٹھاکر جابر سنگھ تو انسانی خون و گوشت کا عادی ہو ہی چکا تھا اس نے موہن لال کو بھی عادی بنا دیا تھا جب نیا شکار حویلی میں آتا تو موہن لال تہہ خانے کے دروازے کے پاس چپک کر بیٹھ جاتا اور اس وقت تک نہ ہلتا جب تک اس کا حصہ اس تک نہ پہنچتا۔

موہن لال کو شانتی نگر کے باسیوں کی نیت میں فتور کا پتہ لگ چکا تھا وہ بنا پلکیں جھپکائے انہیں دیکھ رہا تھا اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ شانتی نگر کے باسی

چھوٹے بڑے ڈرموں کو گدھا گاڑیوں پر لاد کر حویلی کے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ موہن لال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے حویلی کی چار دیواری کی اونچائی کم وبیش تیس، چالیس فٹ تھی اس کی موٹائی زمین سے پانچ فٹ سے شروع ہوئی تھی اور اوپر آخر تک ایک فٹ تک جاتی تھی۔ حویلی کا کل احاطہ چار کنال تھا۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ شانتی نگر والے کسی طور بھی حویلی کے اندر نہیں گھس سکتے تھے موہن لال گاؤں والوں کے اگلے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری طرف گاؤں والوں نے غلیل ٹائپ ڈھانچے بنا کر انہیں گدھا گاڑیوں پر فٹ کیا تھا بڑے ٹینکوں سے پیٹرول چھوٹے چھوٹے ٹینکوں میں بھر کران چھوٹے ٹینکوں کے منہ کھلے چھوڑ کر انہیں ان بڑی غلیلوں کے ذریعے حویلی کے اندر پھینکا جانے لگا۔ چھوٹے ٹینک قلابازیاں کھاتے ہوئے حویلی کے مختلف حصوں میں گرنے لگے جیسے جیسے قلابازیاں کھاتے ویسے ویسے پیٹرول ادھر ادھر نکل کر گرنے لگتا۔ حویلی کے اندر ہر طرف سے پیٹرول کی بساند آنے لگی۔

ادھر موہن لال کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ سرپٹ تہہ خانے کی طرف دوڑا جہاں ٹھاکر جابر سنگھ دنیا ومافیا سے بے خبر دیوقامت بت کے سامنے دوزانوں براجمان پوجاپاٹ میں لگا ہوا تھا تہہ خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ موہن لال نے دروازہ زور مور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ ٹھاکر جابر سنگھ اپنی شولہ اگلتی آنکھوں کو کھولا اور اور دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا چانس تھا جب اس کے عمل میں دخل اندازی ہوئی تھی ملازموں میں سے کسی کو تہہ خانے کی طرف بھٹکنے کی اجازت تک نہ تھی اور اب ویسے بھی اکیلا موہن اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

”غضب ہوگیا ٹھاکر صاحب۔“ اچانک موہن لال کی خوف میں ڈوبی تھرتھراتی آواز نے اس کی سماعت پر دستک دی۔

”ٹھاکر صاحب بھگوان کے لئے دروازہ کھولئے گاؤں والوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ پوری حویلی کو پیٹرول میں نہلا دیا گیا ہے کسی بھی وقت وہ حویلی کو نذر آتش کر سکتے ہیں۔“

موہن لال کی بات سن کر ٹھاکر جابر سنگھ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے اٹک کر رہ گیا۔ اسے گاؤں والوں سے اس سب کی کسی طور امید نہ تھی۔ وہ یہی سمجھتا کہ گاؤں والے اس کے خوف سے ڈرتے ہیں لیکن اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ ٹھاکر جابر سنگھ نے ترحم آمیز نگاہوں سے بت کی طرف دیکھا۔

دوسری طرف موہن لال نے ایک بار پھر باہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی تاکہ حالات وواقعات کا جائزہ لے سکے۔ حویلی کے اندر جیسے پیٹرول کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ پیٹرول راہداریوں سے کمروں تک بہہ آیا تھا گاؤں والوں نے ایک موٹے ڈنڈے پر اچھی طرح کپڑا لپیٹ کر اسے نذر آتش کیا۔ جب آگ خوب بھڑک اٹھی تو اسے بھی حویلی میں پھینک دیا گیا اس کپڑے لگے ڈنڈے کے اندر گرنے کی دیر تھی کہ پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آگئی آگ کے شعلے آسمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ موہن لال جو حویلی کا جائزہ لینے کے لئے آیا تھا آگ نے اسے فوراً جکڑ لیا۔

موہن لال کی سماعت شکن چیخوں سے حویلی گونج اٹھی۔ موہن لال کی چیخیں سن کر گاؤں والوں نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے نعرے لگانے شروع کر دیئے فضا میں جہاں چارسو پیٹرول کی بساند پھیلی ہوئی تھی وہیں گوشت کے سڑنے کی بدبو بھی شامل ہوگئی ٹھاکر جابر سنگھ سرعت سے آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں میں تھاما کپڑا موہن لال پر ڈال دیا آگ بجھنے کی بجائے مزید بھڑک اٹھی اور خود ٹھاکر جابر سنگھ بھی بری طرح سے جھلس گیا۔ ٹھاکر جابر سنگھ منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھ کر پھونک ماری تو حویلی کے اندر لگی آگ یک لخت بجھ گئی آگ تو بجھ گئی لیکن وہ اپنا باقیات چھوڑ گئی پوری حویلی کالے رنگ میں بدل گئی آگ کے شعلوں کی جگہ اب دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے تھے۔ موہن لال زندگی اور موت کے

درمیان پنڈولم کی طرح لٹک کر رہ گیا تھا۔

"ٹھاکر صاحب......گاؤں والوں نے۔" موہن لال نے بمشکل اتنا ہی کہا تو ٹھاکر جابر سنگھ نے اسے ٹوکا۔

"چنتا مت کرو موہن لال یہ گاؤں والے نہیں جانتے کہ انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن انہوں نے آج ہر حد پار کردی ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا تم میرے وفادار ملازم ہو تمہیں موت بھی نہیں چھو پائے گی۔"

اتنا کہہ کر ٹھاکر موہن لال نے منہ ہی منہ میں اوٹ پٹانگ پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو موہن لال پہلے کی طرح چنگا بھلا ہوگیا۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ یہ سب حقیقت ہے وہ ٹھاکر جابر سنگھ کے قدموں میں گر گیا۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں چکتا کر پاؤں گا۔" ٹھاکر جابر سنگھ کے قدموں میں گر کر موہن لال بولا۔

گاؤں والوں نے اتنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ سب نے مل کر وزنی لکڑیوں کے وار کرکے گیٹ کو کھولنا شروع کردیا۔ ٹھاکر جابر سنگھ موہن لال دونوں نے حیرت سے گیٹ کی طرف دیکھا ٹھاکر جابر سنگھ غصے سے لال پیلا ہوگیا اس نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور گیٹ کی طرف پھونک ماری اور دوسری طرف گاؤں والے تقریباً دوڑتے ہوئے گیٹ کی طرف لپک رہے تھے عین اسی وقت ایک لخت گیٹ کس گیا اور دہکتی آگ کا ایک بڑا گولہ آنے والے دیہاتیوں کی طرف بڑھ گئی پھر چند دیہاتی ادھر ادھر دوڑے جبکہ آدھے سے زیادہ پلک جھپکتے میں جل کر بھسم ہوگئے اور گیٹ ایک بار پھر بند ہوگیا۔

یوں شانتی نگر کے باسیوں کے کان کھڑے ہوگئے اور دوبارہ کسی نے حویلی کا رخ نہ کیا۔ گاؤں والوں کی نظروں میں ٹھاکر جابر سنگھ اور موہن لال دونوں جل کر خاکستر ہوگئے تھے حویلی کو آتماؤں کی آماجگاہ قرار دے دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

موہن لال اس وقت حویلی کے کشادہ صحن میں پڑا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا جب ٹھاکر جابر سنگھ ایک برہنہ لڑکی کو ہاتھوں میں اٹھائے حاضر ہوا۔ ٹھاکر جابر سنگھ نے دائیں پاؤں کی زوردار ٹھوکر اوندھے منہ لیٹے موہن لال کی پسلیوں میں رسید کی تو وہ کلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ ٹھاکر جابر سنگھ کے ہاتھوں میں لاش دیکھ کر موہن لال کی بھی رال ٹپکنے پڑی تھی۔

"آج اسی پر گزارہ کرنا پڑے گا۔" ٹھاکر جابر سنگھ نے لاش موہن لال کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

"حالات خراب ہوتے جارہے ہیں چل اٹھ اور اسے ٹرے میں سجا کر لا تب تک میں شراب پیتا ہوں۔"

حکم دیتا ٹھاکر جابر سنگھ اندر چلا گیا جبکہ موہن لال لاش کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے کچن کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

ایس ایچ او منگل پانڈے کا سوچ سوچ کر دماغ گھوم رہا تھا کہ وہ اس خطرناک مجرم کا کیسے قلع قمع کرے۔ اسے ابھی تک یقین نہیں ہورہا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوگا۔ آدھی سے زیادہ شراب کی بوتل وہ پی چکا تھا تاکہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرکے وہ اس مسئلے کا کوئی اوپائے نکالے مگر بے سود تھی اس کے ذہن میں رحیم کا نام گونجا۔

رحیم اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ بے شک ان دونوں کے درمیان مذاہب کا تضاد تھا لیکن یہ تضاد کبھی ان کی دوستی کے آڑے نہ آیا تھا۔ رحیم ایک نیک سیرت اور خوش اخلاق لڑکا تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے ایس ایچ او منگل پانڈے نے رحیم کا نمبر ملایا رحیم ممبئی میں اپنا بزنس کرتا تھا منگل پانڈے کی رات کے پچھلے پہر کال دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

"السلام وعلیکم۔" رحیم نے کال ریس کرکے کہا۔

"سوچ رہا ہوگا کہ اتنے دنوں بعد میں نے تجھے رات کے اس پہر فون کیوں کیا ہے؟" منگل پانڈے نے سلام کا جواب دیئے بغیر کہا اور پھر ساری صورت حال سے اسے آگاہ کردیا رحیم نے اسے دوسرے دن ملنے کو کہا۔

منگل پانڈے خود رحیم سے ملنے گیا رحیم اسے لے کر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دربار پر لے گیا اور اس کی ملاقات منتظم اعلیٰ سے کروائی۔ ان کا نام عبداللہ تھا۔ صوفی انسان تھے۔ سفید ریش نے ان کے چہرے کے نور کو مزید اجاگر کر رکھا تھا۔ منگل پانڈے ان سے کافی متاثر ہوا اور انہیں اول تا آخر ساری روداد سنائی جسے سننے کے بعد وہ بولے۔

"اس سے قبل وہ غیر مسلموں کو اپنا شکار بناتا رہا ہے۔ لیکن آج اس نے ایک مسلمان عورت کی میت کی بے حرمتی کی ہے تم فکر مت کرو میرے ساتھ چلو اور اسے ہتھکڑی لگالو۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے وہ بہت شکتی شالی ہے؟" ایس ایچ او منگل پانڈے حیرت سے بولا۔

"سب سے زیادہ طاقتور خالق کائنات ہے اور اس کے پاک کلام کے سامنے ہر چیز بے بس ہے۔" بزرگ عبداللہ بولے۔

"اب تم دونوں آنکھیں بند کرلو کیونکہ ہمیں ان دو خبیثوں کا خاتمہ کرنا ہے۔"

بزرگ عبداللہ کے کہنے پر منگل پانڈے اور رحیم نے آنکھیں بند کیں۔ انہیں یوں لگا جیسے انہیں زبردست جھٹکا لگا اور پھر انہیں لگا کہ جیسے ان کے جسم فضاء میں اڑ رہے ہیں تب ہی انہیں دوبارہ بزرگ عبداللہ کی دوبارہ آواز آئی اور انہوں نے ان دونوں کو آنکھیں کھولنے کا حکم دیا آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ ان کے سامنے ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلی اونچی چاردیواری تھی جس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے کسی دور میں نذر آتش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

بزرگ عبداللہ نے ان دونوں کو وہیں رکنے کا حکم دیا اور خود حویلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے منہ ہی منہ میں قرآنی آیت پڑھ کر پھونک ماری تو عرصہ دراز سے بند وزنی گیٹ پرزہ پرزہ ہو کر زمین پر جا گرا۔ موہن لال اور ٹھاکر جابر سنگھ اس سب سے بے خبر گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ موہن لال ٹھاکر جابر سنگھ کے کمرہ خاص کے باہر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا کمرے کا دروازہ بند تھا مگر چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی بزرگ عبداللہ موہن لال کو نفرت سے دیکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھے اور ایک زوردار لات مار کر انہوں نے دروازے کے پٹ کھولے۔

اس افتاد پر موہن لال سمیت ٹھاکر جابر سنگھ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دونوں نورانی چہرے والے باریش بزرگ کو دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ طن ہو کر رہ گئے دونوں حیرت سے بزرگ عبداللہ کو تک رہے تھے کہ وہ اندر کیسے آ گیا تھا۔

"تمہارا وقت اجل آن پہنچا ہے۔" بزرگ عبداللہ نے ٹھاکر جابر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف دوڑتا ہے۔" ٹھاکر جابر سنگھ بولا۔ "وقت اجل میرا نہیں تمہارا آیا ہے تمہیں موت یہاں کھینچ کے لائی ہے اچھا ہی ہوا آج بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔"

اتنا کہہ کر ٹھاکر جابر سنگھ نے منہ ہی منہ میں اوٹ پٹانگ پڑھ کر بزرگ عبداللہ کی طرف پھونک ماری تو ایک ساتھ درجنوں سانپ اڑتے ہوئے بزرگ عبداللہ کی طرف بڑھے۔ بزرگ عبداللہ نے اونچی آواز میں سورۃ یٰسین پڑھنی شروع کردی۔ ٹھاکر جابر سنگھ نے ایک ساتھ کتنے ہی وار کیے مگر اس کا کوئی بھی وار بزرگ عبداللہ کا بال تک بیکا نہ کر پایا۔ جیسے جیسے سورۃ یٰسین مکمل ہورہی تھی ٹھاکر جابر سنگھ کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہوگئے حتیٰ کہ ٹھاکر جابر سنگھ کی حالت دیدنی ہوگئی اس کی ترحم آمیز حالت دیکھ کر موہن لال کے ہاتھوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

سورۃ یٰسین مکمل پڑھ کر بزرگ عبداللہ نے ٹھاکر جابر سنگھ کی طرف منہ کر کے تسبیح پر پھونک ماری اور تسبیح اس کی طرف اچھال دی۔ تسبیح سیدھی جا کر ٹھاکر جابر سنگھ کے گلے میں پھندے کی طرح پھنس گئی ٹھاکر جابر سنگھ کی فلک شگاف چیخوں سے حویلی گونج اٹھی۔

کتنی ہی دیر تک چیخنے کے بعد ٹھاکر جابر سنگھ گر کر بے ہوش ہوگیا بزرگ عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس

کے گلے سے تسبیح نکالی اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا موہن لال خوف کی شدت کے باعث بری طرح سے کانپ رہا تھا۔

''اسے گھسیٹ کر باہر لاؤ۔'' بزرگ عبداللہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو موہن لال نے جھٹ سے بے ہوش ٹھاکر جابر سنگھ کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔

ایس ایچ او منگل پانڈے اور رحیم دونوں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''اس کی شیطانی طاقتیں ختم ہوگئی ہیں۔'' بزرگ عبداللہ نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''یہ دونوں اب صرف آدم خور ہیں انہیں کسی طور بھی رہائی مت دلوانا۔''

ایس ایچ او منگل پانڈے نے تشکر آمیز نگاہوں سے بزرگ عبداللہ کو دیکھا۔ پھر بزرگ عبداللہ کے حکم پر دونوں نے آنکھیں بند کیں دوبارہ حکم پر آنکھیں کھولیں تو ایس ایچ او پانڈے نے خود کو اپنے تھانے میں پایا ٹھاکر جابر سنگھ اور موہن لال دونوں بے ہوشی کے عالم میں اس کے سامنے بے ہوش پڑے تھے۔

ایس ایچ او منگل پانڈے نے کھا جانے والی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں ایک پولیس کانسٹیبل کو بلایا دوسرے ہی لمحے کانسٹیبل اس کے سامنے موجود تھا۔ ایس ایچ او منگل پانڈے کے حکم پر ٹھاکر جابر سنگھ اور موہن لال کو گاڑی میں بے ہوشی کی حالت میں ڈال دیا گیا ایس ایچ او منگل پانڈے سمیت سب ایک ویران جگہ جا پہنچے کوئی کچھ نہیں جانتا تھا بس لکیر کے فقیر کی مانند سب حکم کے پابند تھے۔

ٹھاکر جابر سنگھ اور موہن لال کو ویرانے میں اتارا گیا۔ ان کے ہاتھ پیچھے کی طرف کرکے پیروں سے اس طرح کس کے باندھ دیئے گئے کہ وہ حرکت بھی نہ کرسکیں۔ اردگرد سے چھوٹی موٹی لکڑیاں اکٹھی کرکے ان کا ایک انبار لگا دیا گیا۔

ٹھاکر جابر سنگھ اور موہن لال کی سماعت شکن چیخیں ویرانے میں گونج رہی تھیں دونوں ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکار رہے تھے لیکن آج دونوں کی حالت ایک جیسی تھی دور بہت دور ایس ایچ او منگل پانڈے خود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا لے کے جارہا تھا آخری بار اس نے سائیڈ مرر میں دیکھا تھا کہ جابر سنگھ اور موہن لال پوری طرح سے آگ کی زد میں تھے رسیوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے آگ نے ان دونوں کا کام تمام کردیا تھا۔

ایس ایچ او منگل پانڈے نے جیب سے موبائل فون نکالا اور رحیم کا نمبر ملایا۔

''السلام علیکم۔'' دوسری طرف سے رحیم نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' زندگی میں پہلی بار منگل پانڈے نے رحیم کے سلام کا جواب دیا۔ ''کہاں ہو رحیم؟''

''میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں کیا ہوا؟'' رحیم نے پوچھا۔

''کیا بزرگ عبداللہ صاحب سے میری ملاقات کرواسکتے ہو، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔'' منگل پانڈے بولا تو رحیم سمیت اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ڈرائیور نے حیرت سے اسے گھورا۔

''کیا تم مذاق تو نہیں کررہے؟'' رحیم نے پوچھا۔

''تم تیار ہوجاؤ، میں آدھے گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچنے والا ہوں۔'' منگل پانڈے بولا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

''مسلمانوں کا رب اور اس کا کلام سب سے طاقتور ہیں۔'' منگل پانڈے نے ڈرائیور کی حیرت میں اضافہ کیا۔

''جو کام برسوں سے کوئی نہیں کرپایا تھا ایک مسلمان نے پلک جھپکتے میں کردیا۔ ایک شکتی شالی انسان کو پچھاڑ کر رکھ دیا اگر اس وقت تم بھی ہوتے تو تمہارا بھی فیصلہ یہی ہوتا۔''

اتنا کہہ کر منگل پانڈے نے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی، گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔



حافظ آباد

محمد وارث آصف۔واں بھچراں

اچانک زیر زمین چھپے ہوئے شخص کی درد ناک اور کربناک آواز سنائی دی جس نے وہاں موجود لوگوں کے رونگٹے کھڑے کردیئے مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی زیر زمین شخص کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

ایک خود غرض اور مطلب پرست کا شاخسانہ جو کہ کہانی پڑھنے والوں کو دہلا کر رکھ دے گا

قارئین کرام......! آپ لوگوں نے لاتعداد دہشت ناک کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ آج آپ کی خدمت میں، میں ایک سچا واقعہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ ایک ایسا واقعہ جسے سن کر آپ اپنے اندر ایک نئے مسلمان کو ابھرتا ہوا محسوس کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ایک بار تو ضرور اپنے رب سے گناہوں کی معافی طلب کریں گے۔

مجھے پاکستان آرمی جوائن کیے ہوئے پانچ سال ہوگئے ہیں۔ پچھلے دنوں میں گلگت گیا تھا کورس کے لئے تو وہاں میرے ایک دوست ارسلان کے رنز مطلب بٹ مین کے دادا سے ملاقات ہوگئی کافی اچھے انسان تھے اور صوم صلوٰۃ کے پابند۔ ان کی گفتگو نہایت شیریں اور کمال شفقت تھی ان میں۔ یقین مانئے میں نے اپنی 23 سالہ زندگی میں اتنا شفیق انسان نہیں دیکھا۔ میں ان

سے بے حد متاثر ہوا وہ مقامی رہائشی تھے اور اکثر اپنے پوتے سے ملنے آتے تھے کیپٹن ارسلان نے میری ان سے ملاقات کروائی اور پھر میری کوشش ہوتی تھی کہ میں بس ان کے ساتھ ہی رہوں۔ میرے والدین حیات نہیں اور کوئی بھائی بھی نہیں بس ایک بہن ہے میں اکثر ان سے ملنے جاتا تو باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے اپنا دیندار ہونے کا راز بتلایا۔ مذکورہ واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا جو اسلام کی تبلیغ کرنے گئے تھے۔

اس واقعہ نے جیسے ان سب کی ساری زندگی بدل ڈالی تھی وہ بتایا کرتے تھے کہ وہ اس واقعہ کے بعد سچے اور کھرے مسلمان بن گئے تھے، انہی کی زبانی سنیے۔

"میں تبلیغی جماعت کے ہمراہ اس دورافتادہ گاؤں میں گیا تھا گھر سے نکلے ہوئے ایک ماہ گزر گیا تھا اور ایک ہفتہ بعد ہماری واپسی کا ارادہ تھا۔ وہ ہمارے دورے کا آخری گاؤں تھا جو ایک اونچی سی جگہ پر واقع تھا اس گاؤں کا نام تھا حافظ آباد۔ مجھے یہ نام بھلا لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس گاؤں کا نام "حافظ آباد" رکھنے کی شاید کوئی معقول وجہ بھی ہوگی۔ ہم نے حسب معمول گاؤں کی مسجد میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں امام مسجد سے ملاقات ہوگئی انہوں نے ہمارے جذبے کی قدر کی ہماری خوب آؤ بھگت اور تواضع کی وہ ہمارے آنے کا مطلب جان گئے کہ ہم دین کی تبلیغ اور لوگوں کو نماز کی ترغیب دینے آئے ہیں اس سے پہلے کہ ہم ان سے گھر گھر جا کر لوگوں کو نماز کے لئے بلانے کی اجازت چاہتے۔

امام صاحب خود ہی ہم سے کہنے لگے۔" آپ یہ زحمت نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ اس گاؤں کا ہر گھر کا ایک ایک فرد نمازی ہے قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس گاؤں کے ہر گھر میں ایک نہ ایک بندہ حافظ قرآن ہے اس لئے اس گاؤں کو حافظ آباد کہتے ہیں۔"

ہمارے لئے یہ بات خاصی حیران کن تھی۔ ہماری حیرت دیکھ کر امام صاحب فرمانے لگے۔" میں سچ کہہ رہا ہوں ابھی ظہر کی اذان کے بعد آپ لوگ خود دیکھ لینا کہ مسجد کیسے نمازیوں سے بھرتی ہے۔" اور پھر ایسا ہوا مسجد نمازیوں سے بھر گئی کیا بوڑھے...... کیا جوان اور کیا بچے حتیٰ کہ معذور افراد بھی نماز کے لئے موجود تھے۔ سب کے چہرے پر داڑھی تھی۔ سر پر عمامہ تھا۔ سب لوگ ہم سے بے حد خلوص سے ملے ہماری بھرپور تواضع کی۔ ہم سب حیران تھے۔ ان لوگوں کا جذبہ ایمانی قابل دید تھا۔

ہم نے سینکڑوں دیہاتوں میں جا کر لوگوں کو نماز کی ترغیب دی تھی۔ ان لوگوں کو اکثر تو نماز کا پتا بھی نہیں ہوتا تھا۔ اکثر مسجدوں میں ہم نے جانور بندھے دیکھے تھے۔ مسجدیں ویران دیکھیں تھیں مگر شاید یہ واحد گاؤں تھا جہاں کے لوگ مسلمان تھے صحیح معنوں میں۔ نماز کے بعد ایک دس سالہ حافظ قرآن نے ایک پارہ کی تلاوت کی تو اس کی پیاری آواز نے سماں باندھ دیا۔ ہم عش عش کر اٹھے۔ اتنا پیارا اس نے قرآن پاک پڑھا کہ دل خوش ہوگیا ایمان تازہ ہوگیا۔

سب لوگ جب چلے گئے تو ہم نے سوچا کہ امام صاحب سے اس بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ سب آخر ہوا کیسے؟ لازمی طور پر ایسا ضرور کچھ ہوا ہوگا کہ جس کی وجہ سے اس گاؤں میں لوگوں کا ایسا جذبہ ہے۔

"یہ واقعہ ایک انقلاب تھا یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی کتاب کا کرشمہ ہے۔" امام صاحب فرمانے لگے۔" حافظ آباد گاؤں کے تقریباً سبھی لوگ آپس میں رشتہ دار ہیں۔ ہم ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج سے دس سال پہلے ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ تو ہم نمازی تھے۔ نہ حافظ قرآن اور نہ یہ گاؤں آباد تھا۔

دس سال پہلے ہمارا کوئی وطن نہ تھا نہ گھر اور نہ شناخت تھی۔ ہم ہمیشہ سفر میں رہتے تھے۔ مردہ جانوروں کی ہڈیاں چننا پھر ان کو کارخانوں میں جا کر فروخت کرنا دراصل ہمارا پیشہ تھا۔ ہمارا کام بس کمانا اور کھانا تھا۔ لوگ ہمیں چنگڑ کہتے تھے کیونکہ ہمارا کوئی بھی کام طریقے اور سلیقے سے نہیں ہوتا تھا جب ہڈیاں نہ ملتیں تو ہم بھیک مانگنا شروع کر دیتے۔ ہماری عورتیں اور نوجوان لڑکیاں لوگوں کے گھروں میں جا کر آٹا مانگتی تھیں حقہ بیڑی اور سگریٹ پینا ہمارا کام تھا ہم ہر وقت رات کو نشے میں دھت ہوتے

اور اپنی بیویوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتے تھے۔ صفائی تو کبھی ہمارے قریب بھی نہیں آتی تھی ہمیشہ گندے اور میلے کچیلے کپڑوں میں رہتے تھے ہمیں نہ پتا تھا کہ غسل کیا ہوتا ہے اور نیک اولاد کیسے حاصل کی جاتی ہے بس موج مستی۔

ایک جوڑا کپڑے کا تب تک نہ اتارتے جب تک کہ اس کا ایک انچ بھی ہمیں لگتا کہ سلامت ہے۔ ہم نہ خدا کو مانتے تھے نہ اسلام کا کچھ پتا تھا۔ اور مذہب ہم لوگ تھے۔ کھانا پینا اور عورتوں پر تشدد ہماری زندگی تھی ہمارے قبیلہ کے لوگ اب بھی اس وطن میں ہیں اور ہماری جیسی زندگی گزار رہے ہیں دس سال پہلے ہم لوگ انہی کی طرح خانہ بدوش تھے۔ چلتے چلتے ہم اس علاقے میں آ گئے۔ اس وقت یہ گاؤں ویران تھا مگر پہاڑوں کی وجہ سے سبزہ بہت تھا اور اردگرد کی زمین زرخیز تھی۔ ہم نے اس جگہ پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کیا کیونکہ سامنے والے گاؤں اقبال شاہ کے محمد عالم شاہ کے بارے میں ہم نے سنا کہ وہ بہت ہی شریف اور غریبوں کی مدد کرنے والا ہے۔

اکثر یہ ہوتا تھا کہ ہم جس علاقے میں پڑاؤ ڈالتے تو وہاں کا بااثر آدمی ہمیں رہنے کے بدلے ہماری عورتوں کی فرمائش کرتا تھا اور ہماری برادری کی جو بھی حسین عورت ہوتی کچھ دن اس کی خلوت میں رہتی تھی اور بدلے میں ہمیں کچھ عرصہ رہنے کو زمین ملتی تھی۔ یہ حال تھا ہمارا۔

عالم شاہ کوئی سو ایکڑ زمین کا مالک تھا انگریز سے نہ دوستی تھی نہ دشمنی۔ بس ہر سال پابندی سے ان کو ٹیکس ادا کرتا تھا اور انگریز نے کبھی اسے چھیڑا نہیں کیونکہ وہ اللہ لوگ تھے اور انگریز جانتے تھے کہ وہ مجاہدوں کی کبھی مدد نہیں کرے گا حالانکہ وہ حتیٰ المقدور ان کی بھرپور مدد کرتا تھا چٹا ان پڑھ تھا مگر پکا نمازی اور پرہیز گار۔ کبھی اس نے کسی کو دکھ نہ دیا۔ لوگ اس کی شرافت سے فائدہ اٹھا کر اسے اکثر دھوکا دیتے مگر اس نے کبھی اف نہ کی۔

ہم نے اردگرد کے کئی گاؤں کے وڈیروں سے التجا کی تھی کہ ہمیں کچھ عرصہ کے لئے زمین دے دیں تاکہ ہم رہیں مگر وہ بدلہ میں ہم سے ہماری کنواری اور کم سن جوان لڑکیاں مانگتے تھے مگر ہم ان معصوموں پر ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ جوان لڑکیوں کو تو ہم خیر پہلے بھی عیاشی کے لئے ان کے حوالے کر دیتے تھے مگر کم سنوں کو نہیں۔ سو ہم وہاں سے آتے آتے ادھر آ گئے۔

آخر ہم نے عالم شاہ سے اپنا دکھڑا سنا کر کچھ عرصہ رہنے کی درخواست کی۔ ہم لوگ چرب زبان تو تھے ہی تو وہ ہماری چرب زبانی سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کے پاس جو دو ایکڑ اس پہاڑی والا علاقہ خالی پڑا تھا۔ اس پر کوئی فصل نہ تھی اس لئے عالم شاہ نے ہمیں یہ علاقہ دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم دکھی لوگ ہو تم عارضی طور پر اس علاقے میں رہ سکتے ہو۔''

''اور سرکار بدلے میں آپ ہم سے بھی کم سن لڑکیاں تو نہیں لیں گے۔'' ہم میں سے ایک آدمی بولا تو عالم شاہ کا چہرہ غصے سے آگ بن گیا۔ اس نے اتنی بے عزتی کی کہ میں بتا نہیں سکتا ہم لوگ عالم شاہ کے بے حد ممنون ہوئے اسے لاکھوں دعائیں دیں اور پھر ہم نے ادھر جھونپڑیاں بنالیں۔

سرسبز علاقہ تھا سو جانوروں کو کھلا چھوڑ دیا دن گزرنے لگے جانور موٹے تازے ہو گئے اور کرتے کرتے چار سال ہو گئے ہم اس علاقہ کے لوگوں سے گھل مل گئے چار سال بعد ہم سوچنے لگے تھے کہ عالم شاہ اب ہمیں ادھر سے کوچ کرنے کا بولے گا مگر اس خدا ترس انسان نے کبھی نہ بولا کہ خدا کے بندو ہم تو چند ماہ کے لئے آئے تھے اور کتنے سال ہو گئے اور تم لوگ جانے کا نام نہیں لے رہے ہو۔ عالم شاہ کی اولاد بھی جوان ہو رہی تھی بڑے دو بیٹوں کی اس نے شادیاں کر دیں اور جائیداد بھی سب کو برابر بانٹ دی مگر اس پہاڑی والے علاقے کو اس نے ہماری وجہ سے اپنے پاس رکھا اور بیٹوں کو نہ دیا اس لئے ہمیں فکر نہ تھی۔

یہ گاؤں ہمیں راس آ گیا تھا ہماری گزر بسر اچھی ہونے لگی ہم قصابوں کا کام کرنے لگے اچھا کاروبار چل رہا تھا۔ ہمارے قبیلے کا سربراہ ملنگا تھا ہم اس کی مرضی کے پابند تھے اور وہ اس علاقے سے نہ جانے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا مگر اسے عالم شاہ کی طرف سے فکر کھائے جا رہی تھی

کہ اگر کسی دن اس نے انہیں جانے کا کہہ دیا تب کیا ہوگا اتنا زرخیز علاقہ ان کو پھر نہیں ملے گا۔

ملنگا کے تعلقات اس علاقہ کے چوروں سے بھی بن گئے تھے ان میں کئی ایک نامی گرامی ڈکیت بھی تھے ملنگے نے انہیں اپنی پریشانی کا بتایا تو انہوں نے ملنگے کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ زمین کبھی بھی خالی مت کرنا تم لوگ اتنے عرصے سے اس زمین پر قابض ہو اس لئے اب یہ زمین تمہاری ہے چوہدری عالم شاہ اب قانونی طریقہ سے بھی تم سے یہ زمین خالی نہیں کرواسکتا۔“ ملنگے نے ان ڈکیتوں کی شہ پاکر بھٹہ سے اینٹیں منگوالیں تاکہ وہ ادھر مکانات تعمیر کرواسکے۔ عالم شاہ نے جب اپنی اس زمین پر اینٹوں کے انبار دیکھے تو اسے سخت پریشانی ہوئی کیونکہ جو لوگ آگ مانگنے آئے تھے وہ اب چولہے کے مالک بن بیٹھے تھے۔

اس سے پہلے کہ اس کے بیٹے کوئی ہنگامہ کرتے اس نے انہیں سمجھایا بور بولا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ چنگڑ اس علاقے پر قبضہ کررہے ہیں مگر تم لوگ خبردار کچھ مت کرنا میں خود ان سے بات کروں گا۔“

بیٹے سخت طیش میں تھے مگر باپ کی بات سن کر صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اگلے دن عالم شاہ نے ملنگے سے بات کی۔ ”تم نے تو چند ماہ کے لئے رہائش مانگی تھی مگر لگتا ہے کہ تم لوگ ادھر مستقل قیام کے منصوبے بنارہے ہو۔ مگر یہ زمین میری ہے تم لوگ فوراً یہ علاقہ خالی کردو۔“

عالم شاہ کی بات سن کر ملنگا بڑے رعب سے بولا۔ ”نہیں...... یہ زمین کبھی تمہاری تھی مگر اب ہماری ہے۔ اب ہماری مرضی کہ ہم ادھر سے جائیں یا نہیں۔ اس زمین کی رجسٹری میرے نام ہے۔“

عالم شاہ بولا۔ ”میں نہیں مانتا بس...... اس زمین کو بھول جاؤ اب تو قانونی لحاظ سے بھی یہ زمین میری ہے۔“

”تم کسی وکیل سے جاکر بے شک پوچھ لو کہ جو آدمی اتنے عرصے سے ایک زمین پر قابض ہو کیا وہ اس کی ہے یا نہیں۔“

ملنگا مکارانہ لہجے میں بولا۔

”عالم شاہ نے اسے نرم لہجے میں بہت سمجھایا کہ وہ احسان فراموش نہ بنے۔ پھر بھی کسی موقع پر اسے میری ضرورت پڑسکتی ہے وہ ایک کہاوت ہے کہ ”سو بیل والا بھی ایک دن ایک بیل والے سے بیل مانگنے چلا گیا تھا۔ میں نے تمہیں پردیسی سمجھ کر ادھر کچھ عرصہ رہنے کی اجازت دی تھی مگر تم لوگ اب اس کے مالک تو نہ بنو۔ باز آجاؤ ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ میں تمہیں دو دن دیتا ہوں میری زمین خالی کردو۔ اور یہ بات مت بھولنا کہ جب شریف آدمی بدمعاشی کرنے پر آتا ہے تو اچھے اچھے بدمعاشوں کی ہوا نکل جاتی ہے۔“ عالم شاہ وارننگ دے کر چلا گیا مگر وہ بھلا آدمی تھا اس نے کیا بدمعاشی دکھانا تھی وہ تو کبھی بدمعاشی کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا اس نے کسی سے بھی ذکر نہ کیا۔

ادھر ملنگا نے ہم سب سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ کیا وجہ ہو کہ ہم اس زمین پر قابض رہ سکیں کیونکہ سرسبز علاقہ ہے مال ڈنگر اچھا کھا پی رہے ہیں ہم لوگ کاروبار کررہی ہیں اچھی گزر بسر ہورہی ہے۔ ہمارے ایک دو آدمی تو شاید ڈر رہے تھے کہ کچھ ایسا ویسا نہ ہوجائے سو یہ علاقہ چھوڑ دیں مگر ان دو کے علاوہ کسی بھی کی مرضی نہ تھی کہ یہ علاقہ خالی کیا جائے ملنگا نے اپنے ڈکیت لوگوں سے بھی رائے لی اور سب نے نہ صرف یہ کہ اسے ادھر نہ جانے کا مشورہ دیا بلکہ اس کا ساتھ دینے کا وعدہ بھی کرلیا۔ ”مگر اس پر قابض کیسے رہا جائے۔“ ملنگے نے رائے مانگی سب نے اپنے دماغ سے مکارانہ رائے دی کسی نے کہا چڑھائی کردو۔ کسی نے کہا انگریز کے پاس جاؤ مگر سب سے زیادہ کالے کی رائے تو سب نے بہتر جانا اور اس پر عمل کرنے کا سوچنے لگا۔

حسب معمول دو دن بعد عالم شاہ دوبارہ آیا اور اس نے ملنگے سے کہا کہ۔ ”میں نے تم لوگوں کو دو دن کا ٹائم دیا تھا مگر تم لوگ گئے کیوں نہیں۔“

”میں نے بولا تھا کہ زمین جب ہے میری

تو جائیں کیوں؟"

"ٹھیک ہے اب پنچائیت میں بات ہوگی۔" عالم شاہ یہ کہہ کر چلا گیا مگر اسے جاتے ہوئے کالے نے راستے میں روک لیا اور بولا۔" شاہ جی...... آپ پنچائت کیوں بلاتے ہیں جس قرآن کے آپ پیروکار ہیں اس قرآن کو ثالث بنالیں۔"

"کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں۔"

"ہم تو قرآن کو مانتے نہیں ہیں مگر آپ تو اسے آسمانی کتاب مانتے ہیں نا اور اس کے فیصلوں کی پابندی کرتے ہیں آپ قرآن لے کر آئیں اور ہم قرآن پر اپنا فیصلہ چھوڑتے ہیں اگر قرآن نے ہمیں بول دیا تو ہم زمین خالی کردیں گے مگر اسی قرآن کا فیصلہ اگر آپ کے مخالف ہوا تو آپ کو اس زمین سے دستبردار ہونا پڑے گا۔"

نہایت ہی مکارانہ چال چلی تھی کالے نے مگر عالم شاہ قرآن کی وجہ سے چپ کر کے چلا گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قرآن پاک اس کے حق میں ہی فیصلہ کرے گا۔ اس نے سادگی کی انتہا کردی اور چپ کر گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کی اس کتاب کے لکھے فیصلے بولتے ہیں قرآن انسانوں کی طرح بول نہیں سکتا۔

رات کو بابا کالے کی منشا کے عین مطابق ہم نے ایک خالی جگہ پر قبر نما ایک گڑھا کھودا اور اس پر ایک چھت سی بنا ڈالی اور اس پر مٹی ڈال کر ایک بے ڈھنگی سی ڈھیری بنا ڈالی اور اس کے ایک طرف ایک اتنا سا سوراخ رکھا کہ ایک آدمی اس اس قبر نما ڈھیر میں داخل ہوا اور قرآن کی جگہ بول سکے۔ نہایت ہی کامیاب چال تھی پھر طے یہ ہوا کہ کل جب عالم شاہ قرآن لے کر آئے گا تو ہم اس قرآن کو اس ڈھیری نما قبر کے اوپر رکھ دیں گے۔ اور پھر ہم میں سے کوئی اس قرآن سے سوال کرے گا۔ کہ "اے قرآن مجید! تو جس ڈھیری پر ہے یہ زمین اب جنگڑوں کے پاس ہے تو بتا یہ زمین کس کی ہے اب۔"

ظاہر ہے کہ قرآن جواب نہیں دے مگر ہمارا آدمی جو اس ڈھیری کے اندر ہوگا وہ اس قرآن کی جگہ بولے گا کہ اگر تم نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو انصاف یہ ہے کہ یہ زمین اب جنگڑوں کی ہے عالم شاہ بھی سمجھے گا کہ قرآن بول رہا ہے۔ اگر نہ بھی سمجھے تو وہ مر کر بھی قرآن کا فیصلہ رد نہیں کرے گا اور ہمیں یقین تھا کہ زمین ہماری ہو جائے گی۔

ہم جانتے تھے کہ عالم شاہ نہایت شریف اور دیندار آدمی ہے۔ صبح صبح ہم نے قبر کے اندر روٹی اور پانی وغیرہ رکھ دیا اور بابا کالے نے کہا کہ میں خود ہی قبر کے اندر اترتا ہوں۔ جب وہ قبر میں اتر گیا تھا تو ہم نے اردگرد سے گھاس اور درختوں کی ٹہنیاں توڑ کر اس قبر کو اچھی طرح سے ڈھانپ دیا اور اسے ایسے بنا دیا کہ عالم شاہ کو یہ لگے کہ یہ تو کافی عرصے سے بنی ہوئی ڈھیری ہے۔ قبر کے ایک طرف سانس لینے کے لئے بڑا سا سوراخ بھی چھوڑ دیا تھا اس کے علاوہ وہ سوراخ اس لئے بھی تھا کہ وہ جب بولے تو اس کی آواز باہر کے لوگوں کو بھی سنائی دے۔ یہ تمام منصوبہ بنا کر اور ہر خامی دور کر کے ہم تمام جنگڑا ایک جگہ جمع ہو کر حقے کے کش لینے لگ گئے۔ سب کے چہروں پر خوشی عیاں تھی کیونکہ اب یہ زمین ان کی ملکیت بن جانی تھی اب ہم سب لوگ عالم شاہ کے منتظر تھے کہ وہ کب آتا ہے۔

عالم شاہ نے ان کا انتظار جلد ہی ختم کر دیا وہ اپنے ساتھ میں اقبال شاہ گاؤں کے نمبردار اور مسجد کے امام کو لے کر آ گیا۔ نمبردار اور امام صاحب آ تو گئے مگر انہیں حیرانگی تھی کہ جب ہم لوگ قرآن کو سرے سے مانتے نہیں تو اس کا فیصلہ پھر کیسے مانیں گے۔؟ ہم لوگ اس پر یقین کیسے کریں گے۔ ان لوگوں کے ادھر آتے ہی ملنگے نے پوچھا۔" عالم شاہ...... کیا قرآن مجید بھی ساتھ لائے ہو؟"

"میرے پاس ہے......" امام صاحب نے تیزی سے جواب دیا۔ قرآن مجید کی ضرورت ادھر بالکل نہ تھی کیونکہ نہ صرف یہ کہ ہر کوئی یہ جانتا ہے کہ یہ زمین عالم شاہ کی ہے بلکہ اس کی رجسٹری بھی اسی کے نام ہے تم لوگ اس پر ناجائز قابض ہو۔ میں تمہیں پھر سے کہہ رہا ہوں یہ زمین خالی کر دو قرآن کا فیصلہ تم لوگوں کے حق میں نہیں آئے

گا۔" نمبردار نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اپنی زمین بھلا ہم کیوں چھوڑ دیں۔" ہم میں سے ایک فرد بولا۔

تب ملنگے نے امام صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" آپ فضول میں اپنا اور ہمارا ٹائم ضائع مت کریں جس کام کے لئے آئے ہیں بس وہ کام کریں۔" ملنگے کی بات سن کر نمبردار کو تاؤ تو بڑا آیا مگر عالم شاہ کی وجہ سے وہ خاموش رہا مگر وہ اکیلا اگر ہوتا تو ملنگے کو سبق ضرور سکھاتا۔

"امام صاحب...... آپ ایسا کریں کہ قرآن مجید کو اس ڈھیری کے اوپر رکھ دیں پھر ہم اس سے سوال کریں گے جو جواب قرآن نے دیا وہ ہمیں منظور ہوگا۔"

ملنگے کی بات سن کر عالم شاہ ...... امام صاحب اور نمبردار اچھل پڑے۔ حیرت ان کے چہرے سے عیاں تھی نمبردار بولا۔" او بھولے بادشاہو...... قرآن پاک خود نہیں بولتا اس کے اندر لکھے ہوئے فیصلے بولتے ہیں۔" ہم ترجمے والا قرآن لائے ہیں تم لوگ اس کا ترجمہ بے شک پڑھ لو۔" امام مسجد اور عالم شاہ نے بھی نمبردار کی تائید کی۔

"نہیں نمبردار......" ملنگے نے مکروہ ہنسی سے کہا۔" اگر یہ واقعی آسمانی کتاب ہے اور نبیؐ پر اترا ہے تو آج اس نے اپنا فیصلہ سنانا ہوگا اور ہمیں دکھانا ہوگا تم بس اس کو اس ڈھیری پر رکھ دو۔"

مگر...... اس سے پہلے کہ امام صاحب کچھ بولتے عالم شاہ نے انہیں روک دیا اور بولا۔" نہیں...... میں ان کا سب ڈرامہ جان گیا ہوں حضرت صاحب...... یہ لوگ قرآن کی توہین کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ ان کے ساتھ وہ ہونے والا ہے کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی آپ قرآن کو ادھر رکھ دیں۔"

امام صاحب چپ ہوگئے پھر انہوں نے غلاف سے قرآن پاک نکالا۔ اسے بے حد عقیدت سے چوما اور عالم شاہ کو دے دیا۔ اس نے بھی بے حد احترام سے چوما پھر بہت ادب سے کھول کر اسے ڈھیری پر رکھ دیا جس کے نیچے کالا چنگڑ بیٹھا ہوا تھا۔

لوگوں نے امام صاحب سے کہا کہ۔" وہ اب قرآن سے سوال کریں کہ یہ زمین اب کسی کی ملکیت ہے؟" امام صاحب نے باادب ہو کر آہستہ سے کہنا شروع کیا۔" اے اللہ کی مقدس کتاب...... ہم اپنا مقدمہ تجھ پر چھوڑتے ہیں تو خود انصاف کر اور بتا کہ یہ زمین کس کی ہے۔" امام صاحب نے بات دوسری مرتبہ دہرائی نمبردار عالم شاہ بے یقین اور حیرانگی کے عالم میں قرآن کو دیکھ رہے تھے سب کی نظریں ادھر کو اٹھ گئیں اور کان کھڑے ہوگئے نمبردار اور عالم شاہ اس کشمکش میں تھے کہ قرآن اب بولے گا کیسے اور کیسے اس کا فیصلہ بولے گا؟

لیکن چند لمحوں بعد ہی اس ڈھیری سے کالے کی گونج دار آواز ابھری۔" اے لوگو...... میں نے تمہارا مقدمہ سنا...... کسی کو نقصان دینا یا زیادتی کرنا اللہ کو پسند نہیں اور میں تم لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے نازل کیا گیا ہوں میرا فیصلہ یہ ہے کہ یہ دو ایکڑ زمین جس پر میں اور تم سب لوگ موجود ہو یہ اب چنگڑوں کی ملکیت ہے جو سالوں سے اس پر موجود ہیں۔ اگر میرا فیصلہ منظور ہے تو عالم شاہ تم یہ زمین ان کے حوالے کر کے چلے جاؤ اگر تم نے میرا فیصلہ نہ مانا تو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تم میرے عذاب کے مستحق ہوگے اور میں تیرے خلاف اللہ پاک کے سامنے گواہی دوں گا۔"

نمبردار اور امام صاحب تو تقریباً اچھل پڑے۔ باقی جن کو اصل بات کا علم نہ تھا وہ بھی حیران تھے کہ قرآن آخر کیسے بول سکتا ہے؟ آج انوکھی بات ہوگئی تھی کہ قرآن بول رہا تھا۔" یہ سب ڈرامہ ہے عالم شاہ۔" نمبردار اصل بات بھانپ کر بولا۔ مگر عالم شاہ نے اسے خاموش کرا دیا وہ بھی جان گیا تھا کہ ان لوگوں نے واقعی کھیل کھیلا ہے اور وہ بھی قرآن کے ساتھ اب قرآن اپنا فیصلہ دکھائے گا۔

"نہیں نمبردار...... جو بھی ہے وہ میں جانتا ہوں مگر میں قرآن پاک کے صدقے یہ زمین ان کے حوالے کرتا ہوں۔ اب میں فارغ ہوگیا اب یہ لوگ جانیں اور اللہ کی کتاب جانے...... میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں

مجھے اللہ اور دے گا بس۔" عالم شاہ نے پر یقین لہجے میں کہا تو امام صاحب اور نمبردار خاموش رہ گئے۔ "قرآن پاک اٹھایئے۔"

عالم شاہ نے مولوی صاحب سے کہا اور خود ملنگے سے مخاطب ہوا۔ "ملنگا قرآن کا فیصلہ مجھے منظور ہے اب یہ زمین تیری ہے تو چل کر بس میرے پاس آنا میں رجسٹری تیرے نام کرادوں گا۔ بس تم لوگوں کو مبارک ہو۔" یہ کہہ کر عالم شاہ واپسی کی راہ مڑ گیا۔

امام صاحب نے قرآن پاک اٹھایا اسے عقیدت سے چوما اور غلاف میں لپیٹ کر سینے سے لگالیا۔ وہ تینوں ابھی دو قدم دور ہی گئے تھے کہ چنگڑوں نے نعرے مارنے شروع کردیئے اور ناچنے لگ گئے۔ وہ تینوں بس اللہ کی رضا پر راضی تھے۔ چنگڑ خوشی سے ناچ رہے تھے اور آوازیں کس رہے تھے۔

اچانک ان نعروں میں سے رونے اور چلانے کی آوازیں بھی نمودار ہوئیں بہت بھیانک اور دہشت ناک آوازیں تھیں اور جسے سن کر چنگڑ بھی خوف سے تھرتھر کانپنے لگے۔

عالم شاہ تیزی سے واپس مڑا اور تقریباً بھاگتا ہوا واپس آیا اس جگہ آیا جس جگہ سے وہ آوازیں نمودار ہورہی تھیں اور چنگڑ اس جگہ کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ نمبردار اور امام صاحب بھی تیزی سے واپس مڑے آوازیں اسی ڈھیری سے آرہی تھیں جس پر چند لمحے پہلے تک قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔

رونے کی آوازیں بے حد ہولناک تھیں جسے سن کر وہ لوگ بھی تھرتھر کانپنے لگے۔ عالم شاہ نے غور سے دیکھا آوازیں اسی ڈھیری کے اندر سے نمودار ہورہی تھیں وہ حیران ہوکر اس ڈھیری کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں پھر سے آواز آئی۔ "خدا کے واسطے مجھے باہر نکالو۔ مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے کوئی مجھے ہتھوڑے سے ماررہا ہے۔ مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ...... ہائے...... ہائے میں مرررہا ہوں مجھے باہر نکالو ملنگے...... مجھے باہر نکالو......" یہ کالے کی آوازیں تھیں جو اس قبر میں اتر کر قرآن مجید کی آواز میں بولا تھا

اور ان کو دھوکہ دیا تھا۔

عالم شاہ...... نمبردار اور امام مسجد حیران تھے کہ یہ آوازیں کیسی ہیں کون ہے یہ اور اس کے ساتھ ہوا کیا ہے آخر جو اتنے دردناک انداز میں چلارہا ہے اور مدد کے لئے پکاررہا ہے؟ چنگڑوں کو سب علم تھا مگر وہ اس لمحے حیران تھے کہ بابا کالے کے ساتھ کیا ہوا وہ کیوں ایسی دردناک آوازیں نکال رہا ہے۔؟ قبر میں تو کچھ بھی نہ تھا پھر کیوں وہ چیخ رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کون ہتھوڑے سے ماررہا ہے۔

پھر اچانک جیسے چنگڑوں کو ہوش سا آیا۔ وہ تیزی سے اس ڈھیری پر موجود درختوں کی ٹہنیاں اتار کر دوسری طرف پھینکنے لگے۔ جب قبر ننگی ہوگئی تو سب نے دیکھا کہ اندر برتن وغیرہ تو موجود تھے مگر کالا نہیں تھا تقریباً سب حیران رہ گئے کہ کالا کدھر گیا وہ تو اسی قبر میں تھا۔

نمبردار...... امام مسجد اور عالم شاہ کو ساری کہانی کا پتہ چل گیا کہ اصل میں ماجرا کیا تھا اور ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا تھا۔

اچانک چار گز دور سے پھر کالے کی ہولناک آواز آئی جن میں اب پہلے کی نسبت بہت شدت تھی بہت کرب تھا اور ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کوئی بہت برے انداز میں پیٹ رہا ہے چنگڑ تو اب ایسے ہوگئے تھے کہ ان کو کاٹو تو لہو نہیں، کالا اس ڈھیری سے نکل کر اس زمین میں کیسے آگیا حالانکہ ادھر نہ تو کوئی سوراخ تھا اور نہ ہی گزرگاہ پھر کالا ادھر کیسے آیا اور اتنا ہولناک انداز میں وہ رو کیوں رہا ہے؟ کچھ چنگڑ تو ڈر سے تھرتھر کانپنے لگے تھے اور ادھر سے ادھر بھاگنے کی سوچ رہے تھے کیونکہ اس کی دہشت ناک آوازیں ان کے کان کے پردے پھاڑ رہی تھیں ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

پھر ملنگے نے چیختے ہوئے انہیں اس جگہ کو کھودنے کا اشارہ کیا اور اس کا اشارہ پاکر چند نوجوان ہاتھوں میں کدال لیئے تیزی سے اس جگہ کو کھودنے لگے جس جگہ سے اب کالا رو رہا تھا انہوں نے نہایت تیزی سے اس جگہ کو بھی کھود ڈالا مگر بے سود...... نہ

کالے نے ملنا تھا اور نہ وہ ملا۔ مگر اس کی درد میں ڈوبی آوازیں ابھی بھی آ رہی تھیں آواز جس جگہ سے آتی وہ تیزی سے اسے کھود ڈالتے مگر ادھر کالا نہ ملتا پھر اچانک دوسری جگہ سے اس کی آوازیں ابھرتیں اور پھر وہ اس جگہ کو کھودتے مگر کچھ نہ ملتا پھر اچانک ایک اور جگہ سے آوازیں آنے لگتیں۔

شام ہوگئی تھی اور انہوں نے کئی مرلے زمین کھود ڈالی مگر کالا نہ ملا۔ تمام لوگ تھک ہار کر بیٹھ گئے اندھیرا پھیلنے لگا تھا کہ پھر سے کالے کی آواز گونجی۔ ”عالم شاہ ...... عالم شاہ...... خدا کے لئے مجھے معاف کردو...... میں بہت اذیت میں ہوں۔ میں نے تم سے دھوکہ کیا ہے مجھے بچالو۔ میرے جسم پر سانپ اور بچھو چمٹے ہوئے ہیں وہ میرے جسم کو نوچ رہے ہیں میرے جسم پر ڈنگ مار رہے ہیں ہائے...... ہائے...... میری ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں میرے جسم پر بڑے بڑے پھوڑے نکل رہے ہیں جن میں شدید درد ہو رہا ہے اتنا شدید درد ہے کہ میں برداشت نہیں کرسکتا ہائے......ہائے...... مجھے نکالو...... مجھے نکالو...... خدا کے لئے عالم شاہ کو زمین واپس کردو یہ اسی کی زمین ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ ہم فراڈی ہیں ہم نے قرآن کے ساتھ بھی فراڈ کیا مگر قرآن نے ہمارا فراڈ نہ چلنے دیا اس نے اپنا اصل اور سچا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھ پر قرآن کا عذاب نازل ہوا ہے۔ اے قرآن مجھے معاف کردے...... عالم شاہ مجھے معاف کردے۔ میں مر رہا ہوں خدا کے واسطے مجھے نکالو...... آہ۔“

اچانک کالے نے ایک لمبی سی چیخ ماری اور دردناک آواز میں بولا۔ ”میرے نیچے اب آگ جل اٹھی ہے آہ...... میں اس آگ میں جل رہا ہوں کوئی تو مجھے نکالو...... آہ...... آہ۔“ اچانک پھر اس کی آوازیں ایک دم سے آنا بند ہوگئیں اور ہر سو خاموشی سی چھا گئی پھر کافی دیر تک وہ ادھر رہے مگر کالے کی آواز نہ آئی شاید اسے آگ نے جلا ڈالا تھا یا وہ زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

سارے لوگ اس عالم شاہ کے قدموں میں گر گئے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے ملنگا روتے ہوئے بولا۔ ”عالم شاہ ...... خدا کے لئے اسے اور ہمیں معاف کردو۔ ہم نے دیکھ لیا تمہارے قرآن کا فیصلہ۔ عالم شاہ خدا کے لئے ہمیں معاف کردو۔ ہم آج سے اس گناہوں بھری زندگی سے تائب ہوتے ہیں اور سچے دل سے مسلمان ہونا چاہتے ہیں تو ہماری معافی قبول کرو اور ہمیں معاف کرو۔“

باقی سب لوگوں نے بھی اس کی تائید کی اور پھر سب مردوں اور عورتوں نے امام صاحب کے ہاتھوں کلمہ پڑھا اور سب مسلمان ہوگئے جب سارے لوگ مسلمان ہوگئے تو ملنگے نے عالم شاہ سے اجازت طلب کی اور قبیلے کو کوچ کا حکم دے دیا مگر عالم شاہ نے اسے گلے سے لگایا اور اسے دو کی بجائے دس ایکڑ زمین دے دی اور کہا کہ ”تم اب ہمارے بھائی ہو خبردار جو جانے کا نام لیا تو۔“

تب سے ہم نے تمام بری عادتیں چھوڑ دیں ایک مسجد بنالی اور امام صاحب ہمیں روزانہ اسلام کا درس دیتے ہیں۔ آج پندرہ سال ہوگئے ہم سب نے قرآن پڑھا اور بچوں سے ہم نے حفظ کرایا۔ ادھر کوئی بھی گھرانہ تب تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں ایک حافظ نہ ہو آہستہ آہستہ یہ ایک مثالی گاؤں بن گیا جب بھی کوئی بچہ سمجھدار ہوتا ہے تو اسے دین سے روشناس کرایا جاتا ہے اسلام کے طریقوں پر چلنے کی ہدایت کی جاتی ہے اور اسے حافظ بنا دیا جاتا ہے ہم سب نے قرآن کے لئے خود کو وقف کر رکھا ہے۔

”ملنگے اور دوسرے بڑے لوگ اب نہیں رہے مگر ہم سب اسلام کے پیروکار ہیں یہ سب قرآن کا فیض ہے ورنہ ہم تو جانے کب تک بھٹکتے رہتے۔“

ہم دو دن ادھر رہے پھر ادھر سے واپس آ گئے مگر مجھے آج بھی وہ گاؤں اور اس میں ہونے والا عبرت ناک واقعہ یاد ہے اور اسے میں سب کو سناتا ہوں۔“



آسیبی دلہن

قیصر جمیل پروانہ-ماموں کانجن

اچانک ایک گونجدار کرخت آواز گونجی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک انگارہ برساتی نادیدہ قوت کی چنگھاڑ سنائی دی۔ اور پھر اچانک......

خوف وہراس اور جسم وجاں پر سکتہ طاری کرتی دلہن کی اچھوتی، انوکھی اور ڈراؤنی کہانی

جمال میرا دوست جو گزشتہ تیس سال سے میرا ساتھی تھا، وہ شہر اپنے کسی دوست کے ساتھ گھومنے گیا ہوا تھا۔ اس لئے جاتے ہوئے مجھے بھی چلنے کی دعوت دی۔ مگر میں نے اپنی طبیعت میں گرانی محسوس کرکے اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے بانو کے بارے میں سوچنے لگا اس کا پرخلوص مسکراتا ہوا چہرہ تصور کی دنیا آباد کرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرے سخت گیر اور حریص طبیعت کے مالک ماموں کا چہرہ بھی ابھرا، مرتے وقت جن کی سرپرستی میں دے کر مجھے والدین موت کی بھیانک سرزمین کے باسی بن چکے تھے۔

سخت گیر ماموں بے اولاد ہونے کی وجہ سے میرے والدین کی چھوڑی ہوئی جائیداد اکیلا ہڑپ کرنے کی فکر میں رہتے اور آئے دن طرح طرح کی

سازشیں کرتے رہتے۔ میں ان دنوں بائیس سال کا ہو چکا تھا۔ میرے ماموں نے میرے قتل کی سازش کی جس کی مجھے بروقت خبر ہوگئی۔ میں نے اس سازش سے باخبر ہو کر اپنی اور ماموں کی شخصیت کا موازنہ کیا۔ میرے ماموں جو کہ بوڑھے آدمی تھے اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ان کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ مجبوراً مجھے برداشت کر رہے تھے۔ حالانکہ میں اپنے خاندان کا آخری واحد فرد تھا۔ جو کہ ان کے برے بھلے میں کام آ سکتا تھا۔ مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ ہوس انسان کو تباہی اور بربادی کے راستے پر لے جاتی ہے اور میرا خیال تھا کہ میرے ماموں بھی اپنے آپ کو بڑی تیزی سے تباہی کے راستے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

پھر میں نے سوچ کر اس حویلی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا کہ میرے ماموں مجھے اپنی راہ کا پتھر سمجھ کر مجھے ٹھکانے کے چکر میں حویلی کے ملازموں سے ماموں نے ساز باز کر لی تھی۔ سوائے ایک بوڑھے مالی سلیم بابا کے تمام لوگ میری جان کے دشمن تھے۔ سلیم بابا ستر سال سے اوپر کے تھے۔ ان کی وائف کو گزرے 40 سال گزر چکے تھے۔ انہوں نے میرے والد کو اپنی گود میں کھلایا تھا اور مجھے بھی، صرف وہی ایسے تھے جو میرے سچے ہمدرد تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے میرے قتل کی سازش سے آگاہ کرتے ہوئے مجھے کچھ زیورات لا کر دیئے اور مجھے رانی پور سے چلے جانے کو کہا۔ میں نے ان زیورات کو لیتے ہوئے پوچھا۔ ”سلیم بابا یہ زیورات کس کے ہیں؟ اور اتنے قیمتی زیورات آپ کو کہاں سے ملے؟ میرے سوال کے جواب میں ان کے چہرے پر لاتعداد سائے پھیل گئے۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کہنے لگے۔ یہ میرے پاس گزشتہ 50 سال سے کسی کی امانت پڑے ہیں۔ جنہیں امانتاً رکھنے والا 50 سال کے عرصے میں ایک بار بھی نہیں آیا۔ اتنا طویل عرصہ ان کی حفاظت کے صلے میں مجھے یہ حق پہنچتا ہے۔ انہیں جس طرح چاہوں استعمال کروں اور میں تمہیں اس کا صحیح حقدار سمجھتا ہوں۔ اس لئے انہیں تمہارے سپرد کر رہا ہوں اور ساتھ ہی یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ چاہے تم کتنے ہی بڑے آدمی کیوں نہ بن جاؤ اور خود کو کتنے ہی طاقتور کیوں نہ محسوس کرو اپنی زندگی میں اپنے ماموں سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ ان سے رابطہ نہ کرنے کی صورت میں تم کروڑوں کی جائیداد سے ہاتھ دھولو گے۔

جاؤ میرے بچے کسی دور دراز علاقے میں جا کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو اور ایک بار پھر تاکید کر رہا ہوں۔ کبھی بھول کر بھی اپنے ماموں سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ اسی میں تمہاری زندگی کی بھلائی ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اشکبار آنکھوں سے کہا۔ جاؤ میرے عزیز بچے خدا تم پر ہمیشہ امن اور سلامتی کا سایہ رکھے۔

میں گریجویشن کر چکا تھا۔ باشعور تھا۔ میں بزدل نہیں تھا۔ جو موت کے خوف سے بھاگ کر ساری زندگی کے لئے خود کو جلاوطن کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ مگر میں سلیم بابا کا کہنا نہ ٹال سکا اور خاموشی سے رانی پور سے چلا آیا اور پھر میری ملاقات جمال سے ہوئی۔

پہلی ہی ملاقات میں، میں نے اپنی ذات کے لئے اس میں بے پناہ خلوص محسوس کیا اور بہت جلد ہم گہرے دوست بن گئے۔ جمال ایک خوشحال گھرانے کا آزاد انسان تھا۔ کراچی میں اس کا ایک فور اسٹار ہوٹل تھا۔ اس کی دوستی نے روحانی طور پر مجھے تقویت دی۔ ایسے عالم میں جبکہ میں دنیا میں تنہا تھا۔ جمال کی پرخلوص ذات نے تنہائی کے اس زخم پر دوستی کا مرہم رکھ دیا تھا۔ اور پھر جب اسے پتا چلا کہ میں ایک ہوٹل میں رہائش پذیر ہوں تو وہ زبردست اصرار کے بعد مجھے اپنے گھر لے آیا۔ مجھے رہنے کے لئے ایک کمرہ دے دیا گیا۔ پھر وہیں میری ملاقات بانو سے ہوئی، بانو جمال کی چچازاد بہن تھی اور اس کے اخلاق و حسن کا میں گرویدہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ ہم محبت کا شکار ہو گئے اور پھر جمال کی تجربہ کار نگاہوں سے ہمارے جذبے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ میں یہ جان چکا تھا کہ جمال خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے ہماری محبت کا خیر مقدم کیا اور ہم دونوں ایک چھوٹی سی

تقریب میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک سال پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ میں نے کراچی میں ایک جنرل اسٹور کھول لیا تھا جس سے ہمیں معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ ایک سال بعد خدا نے مجھے ایک پیاری سی بچی کا باپ بنا دیا جس کی آمد سے زندگی کی خوشیوں میں اضافہ کر دیا۔

ایک دن میں اپنے ضروری کاغذات تلاش کر رہا تھا کہ کاغذات کے نیچے زیورات کی تھیلی نظر آئی جسے میں تقریباً بھول چکا تھا اور آج تک اسے کھولنے کی بھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جب میں اسے ہاتھوں سے پکڑے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ اچانک پشت پر میں نے کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز سن کر مڑنا چاہا، دیکھا تو بانو میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اچانک بانو کو سامنے پا کر خیال آیا کہ کیوں نہ زیورات بانو کو گفٹ کر دوں۔ تو اسے خوشی ہو گی کیونکہ زیورات ہمیشہ سے عورت کی کمزوری رہے ہیں۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت میں نے زیورات کی تھیلی میز پر الٹ دی، بانو اچانک ان بیش قیمت زیورات کو دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گئی اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

تم نے یہ زیورات کہاں سے حاصل کئے ہیں یہ تو کسی شاہی خاندان کے لگتے ہیں۔

یہ ہماری خاندانی یادگار ہیں میں نے بات بنائی، بانو ان زیورات کو پا کر بہت خوش تھی۔ چند منٹ وہ انہیں حیرت اور مسرت سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک نیکلس نکال کر گلے میں پہن لیا۔ نیکلس اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا اس نے پوچھا۔ میں کیسی لگ رہی ہوں......؟

نیکلس اس کی صراحی دار گردن میں خوبصورت لگ رہا تھا اور مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ آج تک کیوں میں نے ان زیورات کو بانو کی نظروں سے دور رکھا جبکہ ایک نیکلس کی وجہ سے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

ابھی میں اس نیکلس کو بانو کی خوب صورت گردن میں پہنے ہوئے تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک ملازمہ کی چیختی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی ہم دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے راہداری کی جانب لپکے، جہاں ملازمہ زخمی حالت میں خون میں لت پت بچی کو ہاتھوں میں اٹھائے لڑکھڑاتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔

ہم دونوں ملازمہ کو اس حالت میں دیکھ کر ٹھٹھک گئے، ملازمہ اور بچی دونوں خون میں نہائے ہوئے تھے بانو چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور بے تابی سے اس زخمی بچی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، بچی کے ساکت جسم کو دیکھ کر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ بچی ہم سے بہت دور جا چکی ہے بچی ہاتھ سے نکلتے ہی ملازمہ زمین پر گر پڑی اور بھی آواز نکالے بغیر دنیا کی الجھنوں سے نجات پا گئی۔

میں اس ہولناک منظر کو دیکھ کر سکتے کے عالم میں کھڑا بت بن کر رہ گیا پھر اچانک بانو کی چیخیں سن کر میرا سکتہ ٹوٹا میں ٹھہرے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ بانو کے قریب پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر بچی کی لاش کو لینا چاہا مگر اس نے بڑے وحشیانہ انداز میں مردہ بچی کو سینے سے لگا لیا اور ہذیانی انداز میں چیختی رہی اور چیختے چیختے ملازمہ کی طرح گر کر بے ہوش ہو گئی۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی ایک نیا المناک انکشاف کیا کہ ملازمہ اور بچی کی طرح بانو بھی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوشی کی حالت میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ اتنی دیر میں جمال کو اس سانحہ کی اطلاع دے دی گئی۔ میں دیر تک اس کے شانے پر سر رکھ کر روتا رہا۔

بانو اور بچی کی اچانک موت سے سارا نظام زندگی معطل ہو کر رہ گیا تھا اس سانحے نے میرے جسم سے توانائی چھین لی تھی۔

پولیس کے علاوہ ذاتی طور پر میں نے بھی اس المناک حادثے کی پوری تحقیق کرنے کی کوشش کی مگر کسی طرح بھی اس راز سے پردہ نہ اٹھ سکا کہ میری ملازمہ اور

میری بچی کی موت کے کیا اسباب تھے اور کن حالات میں انہیں موت نے دبوچ لیا، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا اس حادثے کو چار ماہ گزر گئے۔ ایک دن جمال آیا اس کا چہرہ معمول سے زیادہ چمک رہا تھا اس نے انکشاف کیا کہ اس کے دور کے چچا مرتے ہوئے اسے ایک وسیع جائیداد کا مالک بنا گئے ہیں اور اب وہ مجھے لے کر رولڈٹور پر جائے گا۔

تم ابھی سے تیاری شروع کردو یہ کہہ کر اس نے بڑے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی میرے ہاتھوں میں پکڑا دی، میں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

دیکھو اگر قدرت نے تمہیں ایک بڑی جائیداد کا مالک بنادیا ہے تو اسے ضائع نہ کرو۔ میں نے کہا۔

میں اس وقت تم سے تقریر سننے نہیں آیا ہوں۔ اپنا پروگرام بتانے آیا ہوں ہم آج سے 20 دن بعد یہاں سے روانہ ہوجائیں گے اب تمہاری کوئی دلیل نہیں سنوں گا اور نہ مانوں گا۔ اس نے سختی سے کہا۔

خیر دیکھا جائے گا۔ میں نے لاپرواہی سے بات ٹال دی۔ میرے دل میں ابھی تک اس بات کی کرید لگی ہوئی تھی کہ آخر بچی اور ملازمہ کیسے زخمی ہوئی تھیں اور بانو کے بارے میں تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ اچانک بچی کی موت کا صدمہ نہ سہہ سکی اور گزر گئی۔

ایسے پریشان کن حالات سے الجھتے رہنے والا انسان کسی تفریح میں بھلا کیا حصہ لے سکتا ہے۔ جمال بینکاک کے لئے سیٹ بک کراچکا تا۔ اس کے پروگرام کے مطابق ہمارے اس سفر پر روانہ ہونے میں صرف دو دن رہ گئے تھے کہ ایک دن کوریئر کے ذریعے مجھے ایک خط موصول ہوا میں نے تجسس سے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

بیٹے

خدا تمہاری عمر دراز کرے۔

میرا یہ خط جب تم کو موصول ہوگا تو تم اس خط کو پڑھ کر حیران ضرور ہوگے۔ مگر نہیں شاید تمہیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوگا کہ میں تم سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہوا بھی ہمیشہ روحانی طور پر تمہارے قریب رہا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان دنوں تم پریشان اور اداس ہو خدا گواہ ہے اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں پریشانیوں سے بچالیتا مگر بیٹے تمہارے دشمن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اس وقت تم جس حال میں ہو اور جیسے بھی ہو فوراً چلے آؤ تاکہ میں تمہیں اس عظیم خطرے سے آگاہ کرسکوں، جو کہ ان دنوں تمہاری زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈال رہا ہے۔

فقط تمہارا ہمدرد۔

خط ختم ہوگیا تھا۔ خط کے راقم نے اپنا نام نہیں لکھا تھا مگر جس انداز سے اس نے میرے ماضی کے چھپے ہوئے گوشے کی نقاب کشائی کی تھی۔ اس نے مجھے آگاہ کردیا تھا کہ اس کا راقم سلیم بابا کے علاوہ اور کوئی نہیں اس دوران جمال بھی آگیا میں نے اس سے کہا۔

"تم بینکاک کا ٹور کینسل کرکے میرے ساتھ رانی پور چلو۔ بڑی مشکلوں سے وہ رانی پور جانے پر راضی ہوا تھا۔

دوسرے دن ہم دونوں بینکاک جانے کے بجائے رانی پور گئے۔ ایک طویل مدت کے بعد جب میں نے جمال کے ساتھ رانی پور کی زمین پر قدم رکھا تو میرے دل کی عجیب حالت تھی ہم نے ایک قریبی ہوٹل میں اپنا سامان رکھا اور سفر کی تھکان اتارنے کے لئے بستر پر دراز ہوگئے۔

سہ پہر کے تین بج رہے تھے اچانک دروازے پر کسی کی مسلسل تین دستک سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ جمال بدستور گہری نیند سو رہا تھا میں الجھن میں پڑ گیا۔ یہ دستک دینے والا کون ہوسکتا ہے۔

چند لمحوں بعد جب میں نے دروازہ کھولا تو حیرت اور مسرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ سلیم بابا میری آنکھوں کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"سلیم بابا" میں نے حیرت سے چیختے ہوئے کہا اور لپک کر ان کے گلے لگ گیا۔ "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں رانی پور میں پہنچ گیا ہوں"۔

جواباً سلیم بابا کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کہنے لگے۔

"بیٹا شاید! مجھے تمہارے خون کی خوشبو یہاں تک کھینچ لائی ہے میرا جسم بوڑھا ہوگیا ہے مگر اب بھی اتنی

طاقت ضرور رکھتا ہوں کہ اپنے مالک کا استقبال کرسکوں۔ مگر یہ بتاؤ اتنے عرصے تم کیسے رہے، بہت نڈھال نظر آرہے ہو کیا بیمار تھے؟"

یہ ساری گفتگو دروازے میں کھڑے کھڑے جاری تھی کہ میرے عقب میں جمال نے اپنی موجودگی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ان بزرگوار کو اندر آنے کو نہیں کہو گے۔"

"اوہ" میں یکدم چونکا۔

"معاف کرنا بابا اتنے عرصے کے بعد آپ کو سامنے پاکر اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔" اور اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

چند لمحے بعد جب ہم چائے پی رہے تھے اور سلیم بابا کہہ رہے تھے۔

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے آپ کو اپنے سے جدا کرکے زیادتی کی ہے۔ مگر میرے بچے تم نہیں جانتے تمہارا ماموں شیطان کا پیروکار ہے۔ اگر تم یہاں اس کی آنکھوں کے سامنے رہتے تو شاید وہ تمہیں اب تک موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا مگر بیٹے! مجھے یہ بتاؤ کیا وہ زیورات ابھی تک تمہارے پاس محفوظ ہیں؟"

ہاں بابا، میں نے جواب دیا۔ مگر وہ میرے لئے منحوس ثابت ہوئے۔ ان زیورات میں سے ایک نیکلس میری بیوی نے اپنے گلے میں ڈالا۔ میرے گھر میں آناً فاناً تین جانیں ضائع ہوگئیں، میں نے صدمے سے کہا۔

ہاں میرے بچے، سلیم بابا نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ مجھے ان تمام باتوں کا علم ہے ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔

تو کیا آپ کو ان تمام واقعات کا علم پہلے سے تھا جن کی وجہ سے میری بچی بیوی اور ملازمہ کی جانیں ضائع ہوگئیں میں نے صدمے سے کہا۔

بدقسمتی سے مجھے اس کا علم تھا مگر میں اس وقت کو نہیں ٹال سکتا تھا۔ اب اس کو صرف ایک ہی ہستی ختم کرسکتی ہے وہ ہے نواب زادی شمع۔ سلیم بابا نے انکشاف کیا۔

مگر یہ شمع کون ہے اور یہ کیا سلسلہ ہے آپ کھل کر سب کچھ ایک ہی مرتبہ کیوں نہیں بتا دیتے۔ میں نے ناراضگی سے کہا۔

ابھی نہیں میرے بچے، ابھی نہیں مگر وہ وقت اب بہت جلد آرہا ہے جب تم پر کچھ انکشافات ہوں گے کہ تمہاری خاندانی اموات کا کیا سبب ہے ایسا کیوں ہوا وہ پس پردہ شیطانی قوت کون سی ہے جو تمہارے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔

سلیم بابا کی باتیں سن کر میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، سلیم بابا جاچکے تھے مگر میں سوچوں کے بھنور میں ڈوبا ہوا ماضی کی یادوں کو کرید رہا تھا، شام کو میں اور جمال شہر کی طرف نکلے راستے میں جمال کہنے لگا۔

کیا تم اپنی حویلی کی جانب نہیں جاؤ گے دل تو بہت چاہتا ہے کہ پہلے حویلی جاؤں، سلیم بابا کے مطابق حالات بہت سنگین ہیں، وہاں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت ہے، میں نے جواب دیا خیر جیسے تمہاری مرضی، جمال نے کہا مگر کیا یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ میں اکیلے جاکر وہاں کی صورتحال کا اندازہ لگانے کی کوشش کروں ویسے بھی مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔

میرا خیال ہے ایک دو روز رک جاؤ میں بابا سے بغیر مشورہ کئے تمہیں وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

تقریباً دو گھنٹے تک ہم پیدل رانی پور کی گلی کوچوں میں گھومتے رہے، بچپن کی یادیں دل میں بے بسی کے زخموں کو گہرا کرتی رہیں۔ واپسی میں اپنے وجود کو بہت تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ چلتے چلتے ایک جگہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب مجھ سے چند قدم بھی نہیں چلا جائے گا، ہم لوگ بمشکل اپنے کمرے تک پہنچے وہاں پہنچتے ہی میری طبیعت مزید خراب ہوگئی، مجھے اپنے ہاتھ پاؤں حرکت سے محروم ہوتے ہوئے محسوس ہورہے تھے جمال اچانک میری طبیعت خراب دیکھ کر گھبرا گیا اور پوچھنے لگا یہ تمہیں کیا ہوتا جارہا ہے؟

جمال میں نے بمشکل اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں کیوں میری طبیعت خراب ہوتی جارہی

ہے۔ مجھے آرام سے بستر پر لٹادو اور کسی ڈاکٹر کو بلاؤ......؟

جمال نے خاموشی سے مجھے بستر پر لٹادیا اور کاؤنٹر کلرک کی طرف بھاگا تاکہ فون کرکے کسی ڈاکٹر کو بلاسکے مگر ڈاکٹر کے آنے تک مجھ پر گہری بے ہوشی طاری ہوچکی تھی۔ جب میرا شعور بیدار ہوا تو میں خود کو بے حد کمزور پارہا تھا۔

چند لمحے پہلے آنکھیں کھول کر حیران پریشان نظروں سے کمرے کے درودیوار کو تکتا رہا۔ پھر اچانک ادویات کی مانوس خوشبو نے مجھے چونکا دیا اور مجھے یاد آیا یہ وہ کمرہ نہیں ہے، جس میں بے ہوش ہونے سے پہلے میں بستر پر دراز تھا۔ زیرو پاور کے بلب کی ملگجی روشنی میں دیواروں پر خوفناک سائے رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے اور مجھے محسوس ہوا جیسے یہ سائے مجھے اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ میں نے گھبرا کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنا وجود پہلے سے زیادہ کمزور محسوس ہوا، میرا جسم کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے گھلتا جارہا تھا اور دن کا اکثر وقت نقاہت آمیز بے ہوشی میں گزر جاتا۔

ایک طویل وقفے کے بعد ہوش آیا تو میری دھندلائی ہوئی نظروں نے جمال کو اپنے بیڈ کے قریب پایا، اس نے پرخلوص نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا، میں نے کچھ کہنا چاہا مگر یوں لگا جیسے قوت گویائی سلب ہوکر گئی ہے۔ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا، جمال تمہیں میری وجہ سے بہت پریشان ہونا پڑا، میں شاید اپنی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اسے کچھ اور بھی کہتا مگر اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ بولنے سے منع کیا ہے تم اس وقت میرا دل بھر کر شکریہ ادا کردینا جب تم مکمل طور پر صحت مند ہوجاؤ اور ہاں تمہارے لئے ایک گڈنیوز ہے۔

وہ کیا؟ میں نے کمزور آواز میں پوچھا۔

پچھلے ہفتے تمہارے ماموں کا انتقال ہوگیا ہے اور اس قانون کی رو سے تم اس جائیداد کے تنہا مالک ہو۔

اچھا کیا واقعی اور وہ سلیم بابا کہاں ہیں میرے اس سوال کو سن کر جمال خاموشی سے کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا اب تم سے اصل بات چھپانا مشکل ہے۔ تمہارے ماموں کو سلیم بابا ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے مگر وہ خود بھی اتنا زخمی ہوگئے کہ زخموں سے زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے موت کا شکار ہوگئے۔

سلیم بابا کی موت کا سن کر مجھے گہرا صدمہ ہوا وہ خوشگوار احساس جو ایک لمحہ پہلے میری روح میں بیدار ہوا تھا۔ پھر مجھے مایوسی کے گہرے سمندر میں غرق کر گیا۔

چند روز بعد میں مکمل طور پر صحت مند ہوکر ایک طویل عرصے بعد جمال کو اپنے ساتھ لے کر اپنی خاندانی حویلی جا پہنچا۔

تقریباً پندرہ دن تک میں اپنے مزاج کے مطابق حویلی میں مختلف تبدیلیاں کرتا رہا۔ ایک دن جب میں لائبریری میں بیٹھا ہوا مطالعے میں مصروف تھا کہ ملازم نے ایک ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ملازم سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

صاحب اس نے کہا ہے آپ مجھے نہیں جانتے مگر میرا ملنا آپ سے ضروری ہے، ملازم بولا۔

اچھا تم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آرہا ہوں، چند لمحوں بعد میں جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو ادھیڑ عمر کا شریف وضع قطع سا آدمی میرا منتظر تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اٹھا، میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

ادھیڑ عمر اجنبی چند لمحے میری طرف خاموشی سے دیکھتا رہا پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ اس ناچیز کو انور کہتے ہیں، میں آپ سے ملنے کا شائق تھا، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب اچانک کسی نوجوان کو ایک بڑی جائیداد مل جاتی ہے تو اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ پھر میں آپ کا پڑوسی بھی ہوں، یہاں سے قریب ہی میری رہائش گاہ ہے، کسی دن وہاں تشریف لایئے اور غریب خانے کو عزت بخشئے۔

مگر میری چھٹی حس مدد کر یہ کہہ رہی تھی یہ شخص آیا تو

کسی اور مقصد کے لئے ہے مگر اب بات بنانے کے لئے ہے۔ معنی باتوں کا سہارا لے رہا ہے۔ کیا میرے یہاں آنے سے پہلے بھی آپ کا آنا جانا تھا، میں نے اسے کریدا۔

نہیں! میں بہت تنہائی پسند ہوں آج خدا جانے یکا یک کیوں میرا دل چاہا کہ میں آپ سے ملوں اور آپ کے پاس چلا آیا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس ناچیز سے ملنے کی زحمت اٹھائی، میرے گھر کے دروازے دوستوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ میں نے فرخدالی کا اظہار کیا۔

شکریہ، شکریہ اچھا اب اجازت دیں۔ وہ جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔

انور خطرناک ہو یا نہ ہو مگر پراسرار ضرور تھا۔ وہ یونہی اپنا وقت برباد کرنے نہیں آیا ہوگا میں نے سوچا، میں سوچتے سوچتے ایک اضطرابی کیفیت میں اٹھا اور پائیں باغ میں آگیا دیر تک ٹہلتا رہا پھر آکر بستر پر دراز ہوگیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک میں نے اپنے سینے پر کسی نرم شے کا دباؤ محسوس کیا، میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں وہ دباؤ ابھی تک میرے سینے پر موجود تھا مگر یہ کس شے کا دباؤ ہے، میں نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو یوں لگا جیسے میرا جسم حرکت کرنے سے محروم ہو چکا ہے، میرا جسم فالج زدہ ہوگیا تھا مگر ذہن بیدار تھا میں نے اپنی پوری قوت ارادی سے متعدد مرتبہ اپنے اعضا کو حرکت دینا چاہا مگر ہر بار میری کوشش ناکام ہوگئی، سینے پر دباؤ گو کہ اتنا نہ تھا کہ ایک دم ناقابل برداشت ہو جاتا، مگر یہ جسم کے تمام اعضا کا حرکت سے محروم ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ تقریباً 10 منٹ اسی اذیت کی کیفیت میں گزر گئے۔ ذہن میں ہزاروں خدشات جنم لے رہے تھے پھر اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ دباؤ جو دس منٹ پہلے میرے سینے پر تھا اب ہٹ چکا تھا اور رفتہ رفتہ میرے اعضا نارمل کیفیت میں آتے جا رہے ہیں۔

میں اٹھا اس وقت مجھے پیاس لگ رہی تھی، حلق خشک تھا، میں نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس ہونٹوں سے لگالیا اور ایک ہی سانس میں پی گیا مگر ابھی پیاس بجھی نہیں تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے جہنم کی آگ میرے سینے میں جل رہی ہے۔ دوسرا گلاس پینے سے اپنے آپ کو پرسکون محسوس کیا اور سگریٹ سلگا کر دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا اور سوچوں کی لامحدود سمندر میں اترتا چلا گیا۔

اچانک میرے اندر یہ کس بیماری نے جنم لیا ہے جو ایک دم میرے جسم کو فالج زدہ کر دیتی ہے۔ اب پہلی فرصت میں مجھے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑے گا۔ رات بہت

ہیرے جواہرات

ایک مرتبہ ایک بزرگ نے ایک محفل میں اپنی بند ہتھیلی کو سب کی طرف کر کے دریافت فرمایا۔ "میرے ہاتھ میں کیا ہے۔"

کچھ نے جواب دیا۔ "شاید آپ کے ہاتھ میں ہیرے جواہرات ہیں۔"

پھر ایک صاحب نے جواب دیا۔ "شاید سونا ہے۔" اگر ہیرے جواہرات نہیں بھی تو یقیناً چاندی یا کوئی قیمتی چیز ہوگی۔

تب ان بزرگ نے اپنے ہاتھ کو کھولا تو ان کے ہاتھ پر چند کنکریاں تھیں سب حیران رہ گئے۔ ارشاد کیا۔ "عورت کی مثال اس بند مٹھی کی طرح ہے اگر وہ بند ہے۔ (یعنی باپردہ) ہے تو ہیرے جواہرات، سونا، چاندی اور اس کی بیش بہا قیمت ہے لیکن اگر مٹھی کھل جائے یعنی بے پردہ ہو جائے تو وہ بے وقعت کنکریوں کی مانند ہے جس کی کوئی عزت اور قیمت نہیں۔"

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

دیر تک جاگتا رہا تھا صبح دیر سے آنکھ کھلی۔
جمال میرے انتظار میں ناشتے کی میز پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہنے لگا اب تم بڑے آدمیوں کی طرح مجھے ناشتے کی میز پر انتظار کرانے لگے ہو؟ جواباً میرے چہرے پر ایک نڈھال سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جمال اور چڑ گیا اب تم میری باتوں کا جواب دینے کے بجائے صرف منفرد انداز میں مسکرا کر رہ جاتے ہو آخر تمہارے کیا ارادے ہیں؟ اس نے غصے سے کہا۔
میں نے نرمی سے ایک اپنی رات کی کیفیت کے بارے میں بتایا۔ ہم دونوں ایک قابل ڈاکٹر کے پاس گئے اس نے دو گھنٹے تک میرے جسم کے ہر عضو کا گہرا مشاہدہ کیا اور کہا آپ جو کیفیت بیان کرتے ہیں اور جس بات کا خدشہ آپ کے ذہن میں موجود نہیں، اعصاب غیر معمولی متاثر ہیں۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تشویش کے قابل ہو، ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق مجھ میں ایسا کوئی جسمانی نقص نہ تھا جو فالج کی علامت ظاہر کرتا ہو مگر جب رات کے بھاری اور بوجھل دس منٹ مجھے یاد آئے تو میرے ذہن میں نامعلوم سے خدشات سر اٹھانے لگتے۔
زندگی آہستہ آہستہ پراسرار ہوتی جارہی تھی، میں میڈیکل اسٹور سے میڈیسین لے کر نکل رہا تھا کہ دکان پر انور صاحب مل گئے مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہیے صاحب مزاج بخیر ہیں؟ میں ان کے الفاظ سن کر چونک سا گیا اور انہیں حیرت سے دیکھنے لگا ایک دوست کے ساتھ جارہا تھا آپ پر نظر پڑ گئی اور مزاج پرسی کے لئے چلا آیا وہ بولے۔
اس عزت افزائی کا شکریہ، میں نے کہا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔
رات کے تین بجے کلاک کی ٹن ٹن کی آواز کے ساتھ اچانک میری آنکھ کھل گئی میں نے احتیاطاً ملازم کو ہدایت کردی کہ وہ رات کے ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے میرے کمرے میں چکر لگا کر دیکھ لیا کرے، ممکن ہے مجھے ضرورت پڑ جائے، آنکھ کھلتے ہی مجھے ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے میرا وجود آج بھی کل رات کی طرح حرکت سے محروم ہوگیا ہے، مگر کل کی طرح میرا ذہن بیدار تھا اور اس وقت میرا ذہن اور میری آنکھیں ہی زندگی کی سب سے بڑی قوت تھیں، مگر چند لمحوں بعد لگا جیسے میری آنکھیں بھی روشنی سے محروم ہوتی جارہی ہیں، میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں، میرے ذہن کے ساتھ میری سماعت بیدار تھی، میں نے متعدد بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا رہا لیکن دیگر اعضا کی طرح اس کو حرکت دینے سے محروم ہوگیا، میں نے پوری قوت لگا کر بولنے کی کوشش کی مگر آواز نہ نکل پائی۔
اچانک کسی کے قدموں کی مدہم چاپ میری سماعت سے ٹکرائی، اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی خوشبو سے سارہ کمرہ معطر ہوگیا اس تیز خوشبو کو محسوس کرکے مجھے اپنا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا، جب دوبارہ میرا شعور بیدار ہوا تو سورج کی کرنیں میرے کمرے میں جھانک رہی تھیں، آنکھیں کھولتے ہی چند لمحات حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنے کمرے کے در و دیوار کو دیکھتا رہا، پھر میں نے ہاتھوں کو حرکت دی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکتا ہوں، میں بازوؤں کے سہارے اٹھا اور بلند آواز میں ملازم کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد جب ملازم نے کمرے میں جھانکا، میں نے اسے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے ڈانٹا، میں نے تمہیں ہدایت دی تھی کہ رات بھر ہر ایک گھنٹے بعد میرے کمرے میں جھانک کر ضرور دیکھ لینا کیونکہ میری طبیعت خراب ہے ممکن ہے مجھے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔
وہ بولا میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق رات بارہ بجے کے بعد ہر ایک گھنٹے کے بعد آپ کے کمرے میں جھانکتا رہا، رات تین بجے آپ کے کمرے سے ایک عورت نکلی جو دلہن لگ رہی تھی اور پھر پلک جھپکتے ہی راہداری کا ایک موڑ گھوم کر غائب ہوگئی۔
جیسے اس کا وجود ہوا میں بکھر گیا ہو۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں نے آپ کے کمرے میں جھانکا سارا کمرہ اس طرح مہک رہا تھا جیسے کسی نے پرفیوم کا

اسپرے کیا ہو، اور پھر اپنے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ صاحب آپ کو اتنی خوبصورت دلہن پانے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور پھر وہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔ میں حیرت سے اس کی داستان سن رہا تھا جس سوچ میں پڑ گیا اگر میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ اس کمرے میں کسی دلہن کا وجود نہ تھا تو یہ بھی ممکن ہے خوشبوؤں میں نہائی ہوئی اس دلہن کو اور لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا۔

اور پھر میں نے نیند میں ڈوبتے ہوئے کسی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ ایک تیز قسم کی خوشبو کو بھی محسوس کیا تھا۔ جس نے مجھے غفلت کی نیند سو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

چند لمحے خاموش سوچتے رہنے کے بعد میں بولا۔

جاؤ اور جمال کو بلا کر لاؤ۔

میرا ذہن مسلسل الجھنوں کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ اچانک جمال کے قدموں کی مانوس چاپ سن کر میں چونکا وہ آتے ہی بے تکلفی سے میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے تھے۔ کیا بات ہے اس ناچیز کو کیسے یاد کیا؟

میں غصے سے بولا۔ پہلے مجھ پر اپنے طنز کے زہریلے نشتر چلا لو۔ پھر اس کے بعد کچھ کہوں گا۔

ارے یار تم دن بدن کتنے حساس ہوتے جا رہے ہو، معمولی سا مذاق برداشت نہیں کر سکتے، اس نے پرخلوص لہجہ میں گلہ کیا۔

میری بات بہت سنگین ہے اور سنجیدگی سے پوری توجہ چاہتی ہے۔ اگر تم ابھی تک تفریح کے موڈ میں ہو تو جاؤ پھر کسی وقت آنا مجھے اور زیادہ پریشان نہ کرو۔ میں نے کرب سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جمال یکا یک سنجیدہ ہوگیا۔

معاف کرنا شاید میرے مذاق سے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی۔ اب میں پوری طرح سنجیدہ ہوں، تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ دو کیونکہ میں اپنی زندگی میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا۔

اسے سنجیدہ پا کر میں نے سارے حالات سنا دیئے، ان تمام واقعات کو سن کر وہ رحم انگیز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ جیسے اسے میری ذہنی صحت پر کوئی شبہ ہو، تمام واقعات سننے کے بعد کہنے لگا کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔

جمال...... میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ میں اس وقت جو کچھ بھی تم کو بتا رہا ہوں۔ وہ سچ ہے اگر یقین نہیں تو ملازم کو بلا کر پوچھ لو۔

جمال نے ملازم کو بلوایا، ملازم نے آتے ہی رات کا تمام واقعہ اس طرح بیان کر دیا۔ جیسے وہ مجھ سے پہلے بیان کر چکا تھا۔ جمال نے تمام واقعات سن کر کہا۔ وہ اچانک تمہاری نگاہوں کے سامنے غائب ہوگئی تم نے اسے تلاش نہیں کیا۔

میں نے حویلی کا کونا کونا چھان مارا، حویلی کے گیٹ تک گیا۔ مگر پتہ نہ چلا۔ اس نے جواب دیا۔

ملازم کے جانے کے کچھ دیر بعد جمال بولا۔

معاف کرنا یار اس جدید دور میں کسی ایسی قوت کا وجود ماننے کے لئے میرا ذہن ابھی تک تیار نہیں۔

میں دو روز سے اپنی پراسرار بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہوں اور یہ پراسرار دلہن نازل ہوگئی خیر چھوڑو ان باتوں کو میں نے کہا۔

ناشتے کے دوران جمال نے کہا۔ آج سے تم میرے کمرے میں سویا کرو میں بھی تو دیکھوں کہ آخر وہ کیا شے ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں جمال کے ساتھ ڈاکٹر کی جانب روانہ ہوگیا، آج میں نے اپنا ڈاکٹر بدل دیا تھا۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر میری صحیح تشخیص نہ کر سکا، مگر دوسرے ڈاکٹر کا تجزیہ بھی پہلے ڈاکٹر سے مختلف نہ تھا۔ ڈاکٹر کے پاس سے واپسی پر سارا دن ہم دونوں پریشانی سے الجھن کا حل تلاش کرتے رہے۔ ہم دونوں پائیں باغ میں چائے پی رہے تھے کہ اچانک میری قوت شامہ نے پھر کسی تیز خوشبو کو محسوس کیا، میں نے سوالیہ نظروں سے جمال کی طرف دیکھا۔ خوشبو اس قدر تیز تھی کہ مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ جمال بھی اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہا ہوگا۔

شاید تمہاری سنائی ہوئی داستان حقیقت کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ اف میرے خدایا یہ خوشبو کس قدر تیز ہے، جیسے کسی نے باغ میں پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا ہو اور...... پھر وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔

اچانک میری طرح اس کی نظریں بھی کھلتے ہوئے دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ اچانک خوشبوؤں میں نہائی ہوئی دلہن ہماری نظروں کے سامنے کھڑی تھی اس کو دیکھتے ہی میرا ذہن حیرت کی شدت سے سن ہوگیا تھا۔ اس کا دلفریب سراپا میرے حواس پر چھاتا جارہا تھا۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ مجھے پراسرار دھندلکوں کی طرف لے جارہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دو دن پہلے کی طرح اپنے جسم کے تمام اعضا کو حرکت دینے سے محروم ہوچکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنی نظریں اس کے دلفریب سراپا سے ہٹا کر جمال کی جانب دیکھوں تاکہ اس کے حسن کا سحر ٹوٹ جائے، مگر ناکام رہا۔

یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی کہ دونوں میں سے کوئی اس سے دریافت کرسکتا کہ وہ کون ہے؟ باوجود متعدد بار کوشش کرنے کے میں اپنے اعضا کو حرکت نہ دے سکا، خبر نہیں کتنے ہی لمحات یونہی بے حس و حرکت گزر گئے۔

اچانک اس کے اچانک ہونٹوں کو جنبش ہوئی مگر جو کچھ اس نے کہا وہ میری سماعت کی گرفت میں نہ آسکا۔ بے بسی سے ایک ساکت بت کی مانند اسے دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔ پھر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے پردے نیند سے بھاری ہوکر بند ہورہے ہیں۔ چند لمحات بعد مجھ پر غفلت کی نیند طاری ہوگئی۔

جب آنکھیں کھلیں تو اپنے کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ میرے اردگرد ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نیلگی رات کے اس سناٹے میں روشنی ایک عجیب پراسرار ماحول پیدا کررہی تھی۔ چند لمحے آنکھیں کھولے حیران حیران نظروں سے میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ حلق میں کڑواہٹ سی تھی مشکلوں سے اٹھا اور میز پر رکھے پانی کے جگ کو منہ لگانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کسی نے بید کی چھڑی لہرائی اور پانی سے بھرا جگ میرے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گر کر چور چور ہوگیا۔ میں نے غصیلے انداز میں اس چھڑی کو لہرانے والے کی جانب دیکھا تو ایک لمحہ اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا، انور تھا، وہ پراسرار انسان جو پہلے بھی دو مرتبہ میرا وقت ضائع کرچکا تھا۔

تم نے میرے گھر آکر میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا؟

انور کو غصیلی نظروں سے گھورنے والا ہمیشہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہوا ہے۔ اس نے ٹھہرے ہوئے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

یہ بات تم اپنی گرہ میں باندھ لو کہ جب تک تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرو گے دنیا کا ہر سکھ چین تم سے دور رہے گا۔

ذرا اپنے ماضی کو ٹٹولو تو یہ بات تم پر واضح ہوجائے گی کہ کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ ضرور تمہاری زندگی میں رونما ہورہا ہے جس نے تم سے زندگی کا ہر سکھ چین چھین لیا، تمہاری بچی اور بیوی میرے مشن کی سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں جن کو میں اوپر پہنچا چکا ہوں اور تمہاری ملازمہ میرے راستے میں آگئی، لہٰذا اسے بھی ٹھکانے لگانا پڑا اور اسی طرح میں تمہارے جگری دوست جمال کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔ تم اس وقت تک پراسرار بیماری میں مبتلا رہو گے..... اگر وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔

اگر کیا ذرا اس کی بھی وضاحت ہوجائے۔ میں نے کہا۔

اگر تم نے مذہبی عقائد کے مطابق میری بیٹی سے شادی نہ کی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

شادی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں شادی۔ وہ سنجیدہ تھا۔

میری حسین بیٹی شمع سے شادی جو برسوں سے تمہاری راہ تک رہی ہے۔

کہیں تم اس پراسرار دلہن کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے ہو جسے دیکھ کر میری جسمانی قوت سلب ہوجاتی ہے۔

www.urdusoftbooks.com

ہاں وہی۔ جسے تم اور جمال بھی دیکھ چکے ہو۔

میں تذبذب میں پڑ گیا کہ ایسے آدمی کو میں کیا جواب دوں جو اپنی حسین وجمیل بیٹی کی شادی کے لئے خون کے دریا سے بھی گزرنے کو تیار تھا۔

مگر محترم، میں نے جواب دیا۔

آپ کی بیٹی دنیا کی حسین ترین عورت سہی مگر پھر بھی یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ زبردستی اس مقدس رشتے کی توہین کی جائے؟

یہ صرف اس لئے ہے کہ ابھی کچھ باتیں پردۂ راز میں رہیں۔ ایک حسین عورت تمہاری دلہن کہلانا چاہتی ہے اس نے جواب دیا۔

بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ میں نے کہا۔

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ شادی سے پہلے میں تمہاری بیٹی سے ایک ملاقات کرلوں، میرا خیال تھا کہ وہ ملاقات کا موقع دینے کے بجائے اس سے گریز کرے گا۔

میرا خیال ہے بہتر یہی ہے کہ تم میری بات مان لو تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

بیکار اپنے آپ کو ادھر ادھر الجھا رہے ہو۔ یہ بھی میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میری بیٹی تمہاری سفارش کررہی ہے۔ اس کی پرزور سفارش ہے کہ تمہیں زندگی میں کبھی کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے، میں اس لئے آج تم سے کھل کر بات کررہا ہوں۔

میں اس مشورے پر غور کروں گا۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لائیں؟

میں نے لاپرواہی سے کہا۔ میری اس بات کو سن کر اس کے چہرے پر غصے کے آثار پھیل گئے اور وہ غصے کی حالت میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اس کے جاتے ہی مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر اچانک پھر نقاہت نے غلبہ پانا شروع کردیا ہے۔

ایک لمحے کے لئے یوں لگا جیسے میری جسمانی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں گھبرا کر بستر پر لیٹ گیا اس سے پہلے کہ میں جمال کو اپنی اور انور کی پراسرار گفتگو سے آگاہ کرتا میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، ہر طرف سے ایک اتھاہ تاریکیوں کا سمندر مجھے نگلنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔

ایک بار پھر میرے کمرے میں تاریکی جھانک رہی تھی اور باہر سورج دنیا کا سفر ختم کرکے مغرب کے کسی گوشے میں روپوش ہورہا تھا۔

میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ اچانک ایک ملازم نے اندھیرا پا کر میرے کمرے میں لائٹ آن کردی اور چلا گیا۔ اچانک میرے ذہن کے پردوں پر اس شریف صورت بوڑھے کا چہرہ ابھرا جو اپنی بات منوانے کے لئے مجھ پر کوئی سحر طاری کررہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اپنی بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑے گی۔ چلو اس بہانے یہ بھی دیکھ لیں گے کہ ان پراسرار کی تہہ میں کیا ہے اس فیصلے پر پہنچ کر میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ اس فیصلے پر پہنچے ابھی مجھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میرے ملازم نے انور کے آنے کی اطلاع دی۔

اس کے آنے کی اطلاع پا کر مجھے اس کی پراسرار قوتوں کو ماننا پڑے گا۔ خدا جانے یہ عجیب وغریب انسان کون سی قوتیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ آتے ہی کہنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ تم کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہو۔ اس نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

میں تمہاری بیٹی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔

کوئی راستہ نہ پا کر مجھے اپنی رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔

وہ مجھے راضی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تو یہ کام آج ہی ہونا چاہئے وہ بولا۔

اتنی جلدی کیوں؟

شادی بیاہ کوئی گڑیا گڈے کا کھیل تو نہیں ہے میں نے جلدی سے کہا۔

شاہد صاحب یہ بات پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں اور ایک بار پھر کہتا ہوں تمہاری شادی ہمارے رسم ورواج کے مطابق ہوگی۔ اس نے اپنی بات پرزور دیا مگر ابھی تو

مجھے اپنی جسمانی قوت کو بھی بحال کرنا ہے......؟

اس عجیب و غریب بیماری نے مجھے کافی کمزور کردیا ہے۔ میں نے دلیل دی۔

آپ اپنے بارے میں کچھ سوچنے کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں جانتا ہوں؟

تم نے میری بات مان کر ایک صدی کی چھائی ہوئی نحوست کو دور کرنے میں تعاون کیا ہے۔

میں تمہارا دوست ہوں دشمن نہیں، افسوس اس بات کو واضح کرنے سے قاصر ہوں کہ میں ایسا کیوں کررہا ہوں، اس نے اپنی صفائی پیش کی، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو پھر۔

ٹھیک ہے۔ آج رات کو یہ مقدس رسم بھی ادا کردی جائے گی۔ اب تم آرام کرو اور اس بات کا یقین رکھو۔

تم کمزور صرف اس وقت تک ہو جب تک یہ مقدس رسم ادا نہیں ہوجاتی اور جب یہ رسم ادا ہوجائے گی تو تم ایک خوفناک قوت کے مالک بن جاؤ گے جو تمہارے تصور سے بھی بالاتر ہوگی۔

مجھے حیرت اور تشویش کے سمندر میں غرق کرکے انور جاچکا تھا۔ مگر اس کی پراسرار گفتگو میرے کانوں میں گونج رہی تھی اس کے جانے کے بعد میری طبیعت پھر بگڑنے لگی، اچانک میرا جسم پسینے میں نہا گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جاتے ہی میرے سینے میں آگ کا دہکتا ہوا جہنم روشن ہوگیا ہے اور وہ بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی، اس اذیت کی تاب نہ لاکر ایک بار پھر میں بے ہوش ہوگیا۔

بے ہوشی کے عالم میں، میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا، میں نے دیکھا کہ میں کسی قدیم قلعے کے پھاٹک پر کھڑا دستک دے رہا ہوں۔ اچانک ایک بزرگ نے کہیں سے نمودار ہوکر مجھے اس دروازے پر دستک دینے سے منع کیا۔ انہوں نے کہا۔

یاد رکھو؟ یہ قلعہ شیطان کے پجاریوں کا گڑھ ہے؟

یہ قلعہ شیطان کے پجاریوں کا گڑھ ہے، اپنے آپ کو شیطان کے حوالے نہ کرو۔ ورنہ بھٹک جاؤ گے۔

مگر میں ان کا ہاتھ جھٹک کر دوبارہ دستک دینے لگا ہوں۔

تو تم میری بات نہیں مانو گے، خیر جاؤ میں جہاں تک سمجھا سکتا تھا سمجھا چکا ہوں مگر اندر جانے سے پہلے میری ایک نصیحت مان لو انہوں نے اصرار کیا۔

وہ کیا ہے؟ میں انہیں کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ انہوں نے قل شریف میری جیب میں ڈال دی۔

پھر اچانک خبر نہیں کیسے کسی نے میرے سر کی پشت پر کسی وزنی شے سے ایک کاری ضرب لگائی۔ میں آواز نکالے بغیر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں کھلتے ہی اضطرابی حالت میں، میں نے اپنے کمرے کے در و دیوار کو دیکھا پھر اچانک میں نے محسوس کیا جو کمزوری اور نقاہت، میں اپنے وجود میں چند لمحے پہلے محسوس کررہا تھا اب وہ دور ہوچکی ہے۔ میں اٹھا اور باہر جانے کی غرض سے دروازے کی جانب بڑھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک انور مجھے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

تو تم میرے آنے سے پہلے ہی صحت مند ہوگئے اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ خیر چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا، بیکار وقت ضائع نہیں ہوا کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو۔

ہاں؟ میں نے بے بسی سے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

اچھا چلنے سے پہلے ذرا یہ کھالو اس نے ایک پیلے رنگ کی ٹکیا میری طرف بڑھائی۔

مگر کیا ضروری ہے؟ میں ہچکچایا۔

اتنی بے اعتباری ٹھیک نہیں ہے شاید اگر ایک خاص مجبوری نہ ہوتی تو میں بھی تم کو اس بات کے لئے مجبور نہ کرتا۔ اسے کھالو اس کے کھانے سے تمہارے جسم کی رہی سہی کمزوری بھی دور ہوجائے گی۔

اچھا لاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے لے لیا۔

مگر اس کو حلق سے نیچے اترے دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ اچانک مجھے اپنے جسم میں کسی طاقت کے اضافے کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے جسم

سے آگ کی چنگاریاں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں، دفعتاً ایسا لگا جیسے میرا جسم پگھل رہا ہے۔ مگر جلد ہی نارمل ہوگیا۔ چند لمحوں بعد انور نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چلو اب چلتے ہیں۔

میں سحر زدہ پتلے کی مانند خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا وہ حویلی کے صدر دروازے کی طرف جانے کے بجائے حویلی کے پچھواڑے کی جانب چل دیا۔ چلتے چلتے ملازمین کی ایک کوٹھری کے سامنے گیا جو میری معلومات کے مطابق ایک طویل عرصے سے غیر آباد تھی۔

اس نے کواڑوں کو دھکا دیا اور مجھے اندر لے گیا اندر ایک دیوار کے ساتھ نصب کنڈے کو باہر کی جانب کھینچا۔ دیوار میں ایک خلا پیدا ہوگیا اور سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ یہ حویلی صدیوں سے ہمارے خاندان کی ملکیت چلی آرہی ہے اور کسی کو آج تک یہ خبر نہ ہوسکی کہ کوئی تہہ خانہ بھی یہاں ہے۔

وہ چند لمحے کے رہنے کا اشارہ کرکے سیڑھیاں اتر کر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ جب نمودار ہوا تو اس کے ہاتھوں میں دو روشن مشعلیں تھیں ایک میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

آؤ اور سیڑھیاں اترنے لگا، سیڑھیاں کافی گہرائی تک چلی گئی تھیں۔ فرش پر پاؤں رکھتے ہی ایک عجیب و غریب خوشبو کا احساس ہوا۔ جیسے عنبر سلگ رہا ہو، پھر اچانک مجھے یاد آیا وہ بھی اسی طرح کی خوشبو تھی۔ جب ایک خوب صورت عورت دلہن کے روپے میں میرے اور جمال کے سامنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب سا سناٹا مجھے اپنی ہڈیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوا اور انجانا سا خوف روح کے ہر گوشے میں گونجنے لگا۔ تہہ خانہ بہت وسیع معلوم ہورہا تھا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک ہال نما کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں ہر طرف عنبر کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی مگر اس بار یہ خوشبو میرے حواس پر نہ چھا سکی ہمارے رکتے ہی خوشبو اور دھوئیں میں اضافہ ہوگیا ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میں پھر حواس کھو رہا ہوں، مگر میں جلد ہی سنبھل گیا

انور میرا ہاتھ [illegible]

پھر اچانک ایک ہولناک کریہہ المنظر بت ہماری نگاہوں کے سامنے آگیا جس کے پیٹ میں ایک آتش دان دہک رہا تھا۔ مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے انور اس دہکتی آگ میں اتر گیا اور آگ کے دہکتے شعلوں میں کہیں جاکر غائب ہوگیا۔

چند لمحوں بعد جب وہ دوبارہ نمودار ہوا تو خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی ایک سرخ انگارے کی دہکتی ہوئی دلہن آگ کے اس آتش دان سے انور کے ہمراہ اس آگ سے باہر قدم رکھ رہی تھی میں نے حیرت اور خوف کی شدت سے اپنی دونوں آنکھوں کو زور زور سے مسلا، ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر نہیں وہ دونوں واقعی جلتے ہوئے آتش دان سے نکل کر میرے برابر کھڑے تھے، میری نظریں اس دلہن کے چہرے کی جانب اٹھیں۔ جس میں دہکتے ہوئے انگارے کی تپش تھی، انور اسے میرے قریب کھڑا کرکے ایک بار پھر لپک کر آتش دان میں گھس گیا اور دونوں ہاتھوں میں دہکتے ہوئے انگارے اٹھا کر لے آیا، شمع اور تم، اس نے اپنی نظریں میری جانب گاڑتے ہوئے کہا۔

دونوں اس مقدس آگ پر ہاتھ رکھ کر اس بات کا عہد کرو کہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے وفادار ہوگے، شمع نے اپنا ہاتھ بڑھا کر دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیا اور کہا۔

قسم ہے مجھے اس آگ کی جو دل سے روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گی میں اس مقدس آگ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اپنے ساتھی کی ہمیشہ وفادار رہوں گی، اس کے کہتے ہی اچانک میں نے اضطراری طور پر اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور اچانک میرے ہاتھوں میں حمائل شریف آگئی۔

مگر اتنے میں انور میری طرف متوجہ ہوچکا تھا اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی اس آگ پر ہاتھ رکھ کر شمع کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد کروں میں نے اپنا خالی ہاتھ شمع کے ہاتھ پر رکھ دیا جس نے ابھی تک انور کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے انگاروں پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

ابھی میرا ہاتھ شمع کو چھونے کی دیر ہوئی تھی کہ اچانک ایک تیز اور دل دہلا دینے والا دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کے ساتھ ہی دو شعلے اڑ کر فضا کی طرف لپکے اور ساتھ ہی وہ دونوں خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹ گئے مگر اس عرصے میں دونوں کے جسموں کو آگ لگ چکی تھی۔

اور وہ دونوں آگ کی لپیٹ میں آ کر جل رہے تھے۔ اچانک آگ نے شدت پکڑ لی میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

میں خوف سے ایک طرف سہا ہوا اس ہولناک منظر کو دیکھ رہا تا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی لاشیں جل کر کوئلے کی طرح سیاہ ہو گئیں۔

میں اس ہولناک منظر سے گھبرا کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھری میں آ گیا۔ جہاں ایک اور انکشاف میرا منتظر تھا......؟

سڑھیوں کے قریب ایک کونے میں کھڑے سلیم بابا مجھے گھور رہے تھے۔ ''کیا...... کیا آپ...... سلیم بابا ہیں؟'' میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں میں وہی بدنصیب ہوں۔ جو جب تک زندہ رہا ہمیشہ اپنے مالک کی حفاظت کرتا رہا اور بالآ کر حق نمک ادا کرتے ہوئے موت کی سنگین وادیوں میں گم ہو گیا۔'' انہوں نے غم زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ مر چکے ہیں تو پھر زندہ کیسے ہو گئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کائنات کے کچھ راز انسان کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔'' انہوں نے پراسرار انداز میں جواب دیا۔

''خیر چھوڑو۔'' سلیم بابا نے کہا۔

''لاؤ وہ حمائل شریف مجھے واپس لوٹا دو۔ جس کی برکت سے تم نے شیطان کے پجاریوں کو ان کے اصل مقام تک پہنچا دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں نے وہ حمائل شریف اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق تمہیں دی تھی جب تم شیطان کے قلعے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔'' سلیم بابا بولے۔

''مگر وہ تو محض ایک خواب تھا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''نہیں وہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ ایک ٹھوس حقیقت کا ایک ہلکا سا عکس تھا جسے تم نے خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔''

''اگر وہ خواب تھا تو پھر جاگنے پر وہ حمائل شریف جو میں نے تمہیں خواب کی حالت میں دی تھی عالم بیداری میں تمہارے پاس کہاں سے آ ئی۔'' سلیم بابا بولے اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

''اب زیادہ سوچ کر اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو؟ تم یہ سمجھ لو کہ تمہارے لئے یہی فرض تھا جس سے تم سبکدوش ہو گئے۔

یہ اس حمائل شریف کی برکت تھی کہ وہ آتشی مخلوق تمہارے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی جہنم رسید ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک صدی کا وہ شیطانی کھیل بھی ختم ہو گیا جس نے تمہارے خاندان پر اپنی نحوستوں کا سایہ ڈال رکھا تھا۔'' میں نے بے اختیار وہ حمائل شریف سلیم بابا کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

حمائل شریف تھامتے ہی سلیم بابا بولے۔

''جاتے جاتے یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ آج کے بعد؟ تم یہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ کہ تمہاری اس حویلی میں شیطان کے پجاریوں کا کوئی خفیہ مسکن تھا اور اگر تم دوبارہ جا کر اس تہہ خانے کا راستہ تلاش کرو گے تو یہ نشانات مٹ چکے ہوں گے۔''

مجھے حیرت زدہ چھوڑ کر سلیم بابا تہہ خانے میں اتر کر کہیں غائب ہو گئے اور زمین برابر ہو گئی؟

اس کے بعد میں نے اور جمال نے متعدد بار کوششیں کیں مگر ہر دفعہ ناکامی ہمارا مقدر ٹھہری اور ہمیں تہہ خانے کا دروازہ نہ مل سکا۔

☠



خوش اخلاق

احسان سحر۔میانوالی

دنیا میں بڑے بڑے دل والے اور دوسروں کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے والے پڑے ہیں وہ بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ایسے ہی لوگ قلبی سکون پاتے ہیں جس کا اظہار برملا کہانی میں ہے۔

دل کو دل سے راحت ہوتی ہے.....رائٹر کی حقیقی باتوں کا آپ بھی مطالعہ کریں

ایک بار وہ راستے میں مجھ سے ملا، اور بولا۔ ”کیا تو میری کہانی نہیں لکھے گا؟“

میں نے کترا کر گزرنا چاہا لیکن وہ مجھے راستہ ہی نہیں دے رہا تھا اس وقت بھی اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے وہ ایک لحیم شحیم کسرتی بدن کا انسان تھا۔ اگر وہ جھلا کر مجھے مار دیتا تو میں کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کے باوجود میں کبھی اس سے خوف زدہ نہیں ہوا بلکہ میں نے اس کے لئے اپنے دل میں ہمیشہ حقارت ہی محسوس کی ہے۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے پاس اتنی فرصت نہیں ہے۔“

”تو بھی پاگل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جب تجھے اتنا اچھا سبجیکٹ مل رہا ہے تو دور کیوں بھاگتا ہے..... یاد رکھ میری کہانی ہمیشہ لوگوں کو یاد رہے گی۔“ ایک عجیب سی کیفیت

تھی اس کی آنکھوں میں وہ بولتا رہا اور میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے نکل آیا۔ اس کا نام شکیل خان تھا۔ محلے کا غنڈا خطرناک انسان لوگ اس سے خوف کھایا کرتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب محلے کا کوئی نہ کوئی غنڈا یا دادا ہوا کرتا تھا۔ وہ انفرادی غنڈا گردی کا دور تھا۔ جبکہ آج کل گروہ کی صورت میں بدمعاشی کی جاتی ہے۔ کلاشنکوف کی ایجاد نے جسمانی طاقت اور چاقو زنی وغیرہ کا ہنر ختم کردیا تھا۔ کسی بچے کے بھی ہاتھ میں اگر کلاشنکوف دے دی جائے تو وہ شکیل جیسے دس آدمیوں کو سنبھال سکتا ہے۔

میں اس محلے میں کرائے دار کی حیثیت سے گیا تھا اچھا خاصا مکان تھا اور کرایہ بھی خاصا معقول تھا میں ایک اخبار میں ملازمت کرتا تھا اس کے علاوہ کہانیاں اور شاعری وغیرہ کیا کرتا تھا۔ جن سے ٹھیک ٹھاک گزر وغیرہ ہو جاتی۔ شکیل اسی علاقے کا ایک بدنام انسان تھا۔

لوگ اس کے سامنے سے بھی کترایا کرتے۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور تھیں وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ وغیرہ وغیرہ یعنی اس قسم کے لوگوں میں جتنی خامیاں ہو سکتی وہ سب اس میں تھیں نہ جانے اسے کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ میں ایک رائٹر ہوں اس لیے وہ راہ چلتے مجھ سے فرمائش کیا کرتا کہ میں اس کی کہانی لکھوں۔ اور میں اسے طرح دے کر گزر جاتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی کہانی میں اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ وہ کس طرح مجرم بنا۔

زمانے نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور پھر اس نے کیسے جرائم کیے۔ ہر مجرم کی کہانی کچھ اسی انداز کی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔

ایک دن اس نے راستے میں پھر مجھے روکا۔ اس دن وہ ہوش میں معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھیں سرخ نہیں ہو رہی تھیں اور شراب کی بو بھی نہیں آرہی تھی اس کے برعکس وہ سلیقے کا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے رائٹر صاحب۔" اس نے پہلی بار اس انداز سے مجھے مخاطب کیا تھا۔ "تم مجھ سے اتنا دور کیوں بھاگتے ہو۔"

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں ایک مصروف آدمی ہوں اور زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

"کیا تم میری کہانی نہیں لکھو گے؟" اس نے پھر کہا۔ "یقین کرو تم نے اس سے پہلے ایسی کہانی نہ تو پڑھی ہو گی اور نہ ہی سنی ہو گی یہ بہت ہی دلچسپ اور انوکھی کہانی ہے۔" اس کے چہرے پر جوش تھا۔

"تم اپنی کہانی کیوں لکھوانا چاہتے ہو؟"

"اس لئے کہ یہ ایک منفرد کہانی ہے اس کے علاوہ میں خود اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں غلطی پر ہوں یا نہیں۔ یا میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ میری کہانی مار دھاڑ سے بھرپور ہو گی اس میں جرائم کے طریقے ہوں گے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک مختلف کہانی ہے تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ میں یہ کہانی سنا کر اپنے آپ کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے سامنے سے بھی لوگ کترایا کرتے ہیں۔

جو اتنا بڑا غنڈہ ہے کہ جس کی مثالیں دی جاتیں ہیں۔ اس وقت وہ بالکل مختلف انسان تھا جس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے میں تمہاری کہانی سننے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کرو کسی دن میرے گھر آجاؤ۔"

☆......☆......☆

اس کی کہانی واقعی حیرت انگیز اور مختلف تھی۔ وہ بڑی سہولت اور فراغت سے میرے پاس آیا تھا۔ پھر اس نے اپنی جو کہانی سنائی اس نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ اس نے سچا دعویٰ کیا تھا کہ اس کی کہانی بالکل مختلف اور انوکھی ہے۔

"میں برسوں بھٹکتا رہا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "زندگی نے مجھے سوائے تلخیوں اور مایوسیوں کے کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ بچپن میں والدین کا انتقال ہو چکا تھا ایک چچا نے پرورش کی۔ جب جوان ہوا تو انہوں نے اپنے فرض کی تکمیل کے بعد صاف صاف کہہ دیا۔ دیکھو میاں شکیل خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تم اب بڑے ہو چکے ہو تم نے لکھ پڑھ بھی

لیا ہے۔ اپنی زندگی کو اپنے طور پر گزار سکتے ہو۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے جینے کے لئے کوئی اور راہ تلاش کرلو، برا مت ماننا کیونکہ میں نے اپنا فرض پورا کرلیا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے اس لئے میں نے ان کی بات کو برا نہیں مانا اور اپنا بوریا بستر لے کر ان کے گھر سے روانہ ہوگیا۔ میں نے ایک بات نہیں بتائی مجھے بچپن سے ہی عبادت کا شوق تھا، نماز روزہ اور ان کے علاوہ وظائف وغیرہ نہ جانے کیوں میں نے ان باتوں میں اپنے جینے کی راہ تلاش کرلی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے اچھا لگتا تھا میں اپنے آپ کو پرسکون اور مطمئن محسوس کیا کرتا۔ میں نے اپنے دوست کے ہاں قیام کیا۔ وہ دوست ایک شخص کا مرید تھا اور بہت زیادہ معتقد۔ اس نے مجھے اپنے شیخ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں وہ بتایا کرتا کہ وہ اتنے پہنچے ہوئے اور کرامت والے ہیں کہ اپنے وقت کے ولی اللہ بزرگ کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی باتیں سن سن کر میں بھی ان سے ملنے کا شائق ہوگیا اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ میں اپنے دوست کے ہاں رہتا تھا اور اس کی خوشنودی عزیز تھی۔

بہرحال ایک دن وہ مجھے اپنے شیخ صاحب کے پاس لے گیا۔ سب سے پہلے حیرت تو اس بات سے ہوئی تھی کہ ان کا ڈرائنگ روم بالکل جدید انداز سے سجا ہوا تھا ایسا ڈرائنگ روم کسی دین دار شخص کا ہوسکتا تھا ایسے بزرگوں کی بیٹھک تو کسی اور انداز کی ہوا کرتی ہے کچھ دیر بعد وہ بزرگ بھی تشریف لے آئے سبحان اللہ کیا بزرگ تھے۔ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز پرفیوم سے مہکتے ہوئے ماڈرن لباس اور ہاتھ میں جلتی ہوئی سگریٹ، میرا دوست بڑی گرم جوشی اور عقیدت سے ملا اس نے ان بزرگوں کے ہاتھوں کو بوسے بھی دیئے تھے جبکہ میں یہ سب دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔

”کیوں۔“ شیخ صاحب نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ”تم مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہورہے ہو؟“

”وہ...... بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں جو تصور تھا آپ اس سے بالکل مختلف ثابت ہورہے ہیں۔“ میں نے کہہ ہی دیا۔

”ہاں...... بہت سے لوگ مجھے دیکھ کر اسی طرح حیران ہوتے ہیں اور مجھے گالیاں دیتے ہیں برا بھلا کہتے جاتے ہیں لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے جو راہ اختیار کی ہے اس راہ میں یہ سب کچھ ہوا کرتا ہے۔

”کیا مجھے یہ معلوم ہوسکے گا کہ وہ کون سی راہ ہے؟“

”ابھی نہیں۔ تم میرے پاس آتے رہو تو تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ تفریحاً ہی سہی تم دو چار بار آؤ تو۔“ اور ان کے پاس دو چار بار جانے کے بعد بھی میری دنیا بدل گئی۔ کیسی عجیب سی بات ہے مجھے خود یقین نہیں تھا کہ شیخ جمال الدین میں اتنی قوت ہوگی کہ وہ مجھے اپنی طرف راغب کرسکیں گے یا تبدیل کرسکیں گے لیکن انہوں نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔

ان کا فلسفہ بہت مختلف تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ”اللہ والے کئی قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو دنیا سے کنارہ کش ہوکر عبادت اور ریاضت میں اپنا وقت گزار دیں اور دوسرے وہ جو دین اور دنیا دونوں ساتھ لے کر چلیں اور تیسرے وہ جو بظاہر دنیا کے معلوم ہوں لیکن ان کا تعلق دین سے ہو میں ان ہی میں سے ہوں۔ یہ جو کچھ تم کو دکھائی دیتا ہے یہ دراصل ایک پردہ ہے ایک ناٹک ہے جو میں نے دنیا والوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں رکھنے کے لئے رچا رکھا ہے تاکہ وہ بدگمان ہوکر مجھے گالیاں دیں برا بھلا کہیں اور میرے نفس کی موت واقع ہوتی رہے تم اس کو ملامتی بزرگوں کا طریقہ کار کہہ سکتے ہو۔

”تو حضرت آپ جو کچھ نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں بلکہ آپ کی حقیقت کچھ اور ہے۔“

”ہاں...... یہ حقیقت کچھ اور ہے۔“ شیخ نے کہا۔ ”اور یہی اصل ہے میں اپنے پاس آنے والوں کو یہی تلقین کیا کرتا ہوں۔“

اسی طرح میں نے بھی اپنے شیخ کا راستہ اختیار کرلیا۔ میں وہی سب کچھ کرتا رہا جو کسی کو بھی برا سمجھنے کے لئے بہت ہوا کرتا ہے۔ لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں مجھے غنڈا اور بدمعاش سمجھتے ہیں اور میرا نفس مطمئن ہوتا چلا جاتا ہے۔“

”اب سمجھا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تو تم

وہ نہیں ہو جو بظاہر دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں۔" شکیل نے اپنی گردن ہلائی۔ "میں کچھ اور ہوں۔ میں اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا جان لو کہ میں اپنی راتیں عبادتوں میں بسر کرتا ہوں اور میری غنڈا گردی اور شراب نوشی وغیرہ سب جھوٹ ہے۔"

"چلو مان لیا کہ تمہارے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ لیکن اب میرے سامنے حقیقت ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"زندگی تو یوں بھی گزر رہی تھی۔"

"ایک بہت بڑی مجبوری۔" اس نے کہا۔ "جس کو حل کرنے کے لئے میں نے تمہیں اپنا وسیلہ بنایا ہے۔"

"کیسی مجبوری؟"

"عائشہ کی۔" اس نے کہا۔ "شاید اسے تم نہیں جانتے ہو گے۔ وہ اسی محلے کی ایک لڑکی ہے اور میں آج سے نہیں برسوں سے اس کے عشق میں مبتلا ہوں وہ بھی مجھ سے پیار کرتی تھی مجھے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے تھے پھر ہم دونوں کے درمیان خلیج حائل ہوتی چلی گئی۔"

"اور یہ خلیج تمہارے عجیب وغریب فلسفے کی ہوگی۔"

"ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "ہاں وہ مجھے بہت بڑا غنڈہ سمجھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں واقعی ایک بہت بڑا مجرم ہوں۔ ایک خطرناک شخص ہوں۔ اس لئے وہ مجھ سے دور ہو چکی ہے۔ وہ میرا نام تک سننا گوارہ نہیں کرتی۔"

"تو پھر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم ہی اس کے دل سے غلط فہمی دور کر سکتے ہو۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ تمہارے سوا کسی کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ تم ایک سمجھدار انسان ہو۔ تم نے یقیناً یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں کون ہوں اور میرا نظریہ حیات کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ لڑکی تمہارا بہت احترام کرتی ہے۔"

"میرا احترام...... وہ کس سلسلے میں؟" مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔

"اس لئے کہ اس کا تعلق تمہاری برادری سے ہے۔" اس نے بتایا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ بھی لکھنے لکھانے کی بہت شوقین ہے۔ اس کا قلمی نام لالہ رخ ہے۔"

"لالہ رخ۔" اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں بہت اچھی طرح اس سے واقف تھا۔ لالہ رخ واقعی ایک بہت مشہور اور باکمال لکھنے والی تھی۔ اس کی کہانیاں ملک بھر کے بڑے بڑے جرائد میں شائع ہوا کرتیں اور وہ داد حاصل کرتیں۔ میں نے کئی بار اس کا پتا چلانے اور اس سے ملاقات کی کوشش کی لیکن وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اسے کسی سماجی یا ادبی تقریب میں دیکھا گیا تھا۔ اس کی تصویریں تک کبھی شائع نہیں ہوتیں اس لحاظ سے وہ کچھ پراسرار قسم کی تھی اور اب یہ شخص جس نے اپنے بارے میں ایک ناسمجھ میں آنے والی کہانی سنائی تھی۔

لالہ رخ کے بارے میں بتا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ وہ لالہ رخ اس غنڈے سے محبت کرتی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ اتنی مشہور اور سمجھدار رائٹر شکیل خان جیسے شخص کو کس طرح پسند کر سکتی تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ عشق اندھا ہوتا ہے وہ یہ سب نہیں دیکھتا کہ کون کیا ہے؟ اور کس انداز کی زندگی گزار رہا ہے وہ تو اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے تو ہو سکتا ہے شکیل اور لالہ رخ کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

"دیکھو شکیل، میں نے لالہ رخ کو بہت پڑھا ہے۔ اس کے فن کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کسی سے ملنا گوارہ نہیں کرتی۔ پھر اسے سمجھانے کے لئے میں کس طرح اس سے مل سکتا ہوں۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس ملاقات کا بندوبست میں کر دوں گا۔" اس نے کہا۔ "تم سے بس اتنی گزارش ہے کہ اس معاملے میں میرا ساتھ دو۔"

لالہ رخ سے ملنے کے اشتیاق میں، میں نے ہامی بھر لی میں نے شکیل سے کہا کہ وہ جب چاہے لالہ رخ کو میرے پاس لا سکتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ کہانی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ شکیل نے اپنے اور شیخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں کتنی سچائی ہے کیا اس قسم کے لوگوں کا آج بھی وجود ہے؟ کیا واقعی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی

www.urdusoftbooks.com

"نگاہوں میں برے بن کر معرفت کی منزلیں سر کرتے ہیں
اگر یہ سچ تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ شکیل فرشتہ ہے اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ اس کی غنڈہ گردی سب دکھاوا ہے بہرحال یہ الجھا ہوا معاملہ تھا اب دیکھنا یہ تھا کہ لالہ رخ کی ملاقات کیا گل کھلاتی ہے۔

اپنے وعدے کے مطابق شکیل لالہ رخ کو میرے پاس لے آیا اور اسے دیکھ کر پتہ چلا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ کیوں رہتی ہے وہ بہت ہی بدصورت لڑکی تھی موٹی، کالی اور انتہائی پھیکے نقوش والی۔ اس میں متاثر کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کی تحریر جتنی خوب صورت تھی، نام جتنا خوب صورت تھا وہ اس کے برعکس ثابت ہوئی تھی مجھے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی لالہ رخ ہوسکتی ہے لیکن جب اس نے گفتگو شروع کی تو سارے وسوسے دور ہوگئے۔ خدا نے سارا حسن اس کی زبان اور گفتگو کو دے دیا تھا۔ کیا خوب صورت انداز، کیا سلجھی ہوئی باتیں جو ایک رائٹر ہی کرسکتا ہے۔

"میں چلتا ہوں۔" شکیل نے کہا۔ "آپ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کریں۔"

میں نے شکیل کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ چلا گیا تھا پھر ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے رسمی باتیں کرتے رہے تھے۔ تازہ کہانیوں پر گفتگو ہوئی۔ ادب اور معاشرے پر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے لالہ رخ سے دریافت کیا۔ "آپ یہ بتائیں کہ شکیل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" اس نے کہا۔ "میں اس کی طرف سے الجھی ہوئی ہوں اس نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی ہوگی۔ وہ میرا رشتہ دار بھی ہوتا ہے اس لئے میں اور وہ براہ راست ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ آپ مجھے دیکھیں، میں اتنی سچائی کے ساتھ یہ کہہ رہی ہوں کہ کیا میں ایسی ہوں کہ کوئی شخص مجھے قبول کرسکے۔ تحریروں اور ذہن وغیرہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز ہے ظاہری حسن اور وہ مجھ میں سرے سے نہیں ہے۔ میں بھی ایک عورت ہوں اور میری بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی تو ایسا ہو کہ میں جس کو اپنا کہہ سکوں اور اس کے لئے [illegible] کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انسان ہوں، اس لئے یہ سب سوچتی رہتی تھی۔ پھر شکیل میری زندگی میں آ گیا۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا۔

مجھے یہ احساس دلایا کہ میں بھی وہی ہوں جس سے محبت ہوسکتی ہے تو میں بھی اس کی طرف راغب ہوگئی۔

"میں سمجھ گیا۔" میں نے ایک گہری سانس لی، اور واقعی یہ کوئی ان نیچرل بات نہیں ہے۔

"آپ نے وہی کیا جو آپ کی فطرت کا تقاضہ تھا۔"

"لیکن پھر سب کچھ تبدیل ہوگیا۔" اس نے کہا۔

"میں سمجھ رہی تھی کہ میری منزل قریب آ گئی ہے۔ مجھے ایک مضبوط ہاتھ کا سہارا میسر آ گیا ہے لیکن پھر ہوا یہ کہ شکیل نے اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ ایک غنڈہ اور مجرم ہوگیا۔ محلے والے اس سے خوف محسوس کرنے لگے۔ انسان غربت سے تو سمجھوتہ کرسکتا ہے، کم نامی وغیرہ سے سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔

لیکن ایک برے انسان کی رفاقت راس نہیں آ سکتی اس لئے میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ آج بھی میں آپ کا سن کر اس کے ساتھ یہاں چلی آئی ہوں ورنہ اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔"

دونوں نے ایک ہی کہانی سنائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شکیل نے غلط بیانی نہیں کی تھی وہ لالہ کی غلط فہمی دور کرانے میرے پاس لے کر آیا تھا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شکیل ایک مختلف انسان ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ نے اس کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور سنا ہو، وہ سب غلط ہو۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے، اب تو اس کی غنڈہ گردی کی مثالیں دی جارہی ہیں۔ شریف لوگ اس کے سائے سے بھی کترا کر گزرتے ہیں۔"

"لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی بات نہیں ہے اور یہی سمجھانے کے لئے وہ آپ کو میرے پاس لے کر آیا ہے۔"

www.urdusoftbooks.com

"بتائیں کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں آپ......؟"

میں نے تفصیلاً شیخ ہان کے نظریے وغیرہ کے بارے میں لالہ رخ کو بتادیا۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت یہ سب بتاتے ہوئے میں اپنے آپ کو احمق محسوس کررہا تھا اس دور میں ایسی بات کررہا تھا جو یقین کے قابل ہی نہ ہو۔ لالہ رخ اس دوران مسکراتی رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ شکیل نے بھی کہانیاں لکھنی شروع کردی ہیں۔" لالہ رخ نے میرے خاموش ہونے کے بعد کہا۔

"آپ خود سمجھ دار انسان ہیں، بتائیں یہ سب کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر مجھے یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ ایک چالاک انسان ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ میں آپ کی بات مان لوں گی اس نے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ آپ بھی ایک رائٹر اور میں بھی۔ اس نے یہ دیکھ لیا کہ میں اس کے سلسلے میں کسی کی بات سننے کی روادار نہیں ہوں تو اس نے ایک کہانی گھڑی، آپ کو ہموار کیا اور مجھے آپ کے پاس لے آیا۔ تاکہ میں آپ کے احترام میں آخر اس سے اپنا پرانا تعلق بحال کرلوں، اسے اپنالوں۔"

"فرض کریں یہ سب غلط ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے اور کسی بھی قیمت پر آپ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں میں بھی یہ جانتی ہوں۔" لالہ نے اعتراف کیا۔ "میں جانتی ہوں کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ لیکن اس سے محبت کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ میں اسے اپنالوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ وہ جرائم کی راہوں میں بہت آگے نکل گیا ہے۔"

"فرض کریں اس کی کہانی درست ہو تو۔" میں نے پوچھا۔

"اس وقت آپ کا رویہ کیا ہوگا؟" لالہ رخ نے ایک نگاہ مجھ پر ڈال کر اپنی گردن جھکائی۔

"پھر بھی بہت کچھ سوچنا ہوگا، جس دور میں ایک بار تناؤ پیدا ہوجائے وہ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں نہیں آسکتی۔"

لالہ رخ کچھ دیر بعد اجازت لے کر چلی گئی۔ میں اس کی کہانی کا تیسرا کردار بن گیا تھا۔ ابھی تک سب کچھ عجیب تھا۔ یقین نہ آنے والا کیا سچ تھا، اور کیا جھوٹ؟ میں نے تو اپنے طور پر لالہ رخ کو شکیل کے راستے پر لانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔

شکیل سے پھر دو دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ وہ راستے میں ہی ملا تھا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میرے پاس آیا۔

"ہاں......اب بتائیں کیا کہا ہے اس نے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی صاف نظر آرہی تھی۔

"میں نے تو اپنی طرف سے بات ڈال دی ہے۔ تمہاری وکالت کی بھی کوشش کی لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی نہیں ہوگا۔ اسے باقاعدہ سمجھانا ہوگا۔ ہاں ایک بات اور...... تم نے اپنے جن شیخ صاحب کے بارے میں بتایا ہے کیا تم ان سے میری ملاقات کرواسکتے ہو؟"

"کیوں نہیں......لیکن وہ آج کل شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی ان سے ملاقات کروادوں گا اور یقین کریں کہ خود آپ کی دنیا بھی بدل جائے گی۔"

لیکن ان شیخ صاحب سے میری ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ اس دوران شکیل کسی کیس کے سلسلے میں گرفتار ہوگیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس قسم کی ریاضتوں کے مرحلے سے گزر رہا تھا اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ ایسا اندھا اعتقاد تو آج تک میرے علم میں نہیں آیا ہوگا۔

ہاں اس دوران لالہ رخ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ ایک بار شکیل کی گرفتاری پر تبصرہ کرنے میرے پاس آئی تھی اور بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ میں اس کی خوبصورت باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس دن اس نے کھل کر مجھ سے باتیں کیں اور میں اس کے حسین ذہن کا قائل ہوتا چلا گیا۔

اس وقت اس کا سارا بے ڈھنگا پن ختم ہوگیا تھا۔ احساس ہورہا تھا کہ سوچ میں بھی کیسی طاقت ہوا کرتی ہے جو انسان کو کچھ اور بنادیتی ہے لالہ رخ اب میری نگاہوں

میں اب دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔اس کے بعد ایک ملاقات اور......اور لالہ رخ نے مجھے اپنے دل کی بات کہہ دی وہ بات جس کا میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ وہی عام سی لیکن خاص بات۔ جواب تک کتنے مردوں نے عورتوں سے اور نا جانے کتنی عورتوں نے مردوں سے کی ہوگی۔ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے اس جملے کی باز گشت سنائی دیتی ہے کہ ”میں آپ سے محبت کرتا ہوں یا کرتی ہوں۔“

لالہ رخ ایک باشعور اور سمجھدار لڑکی تھی۔اس نے براہ راست یہ بات تو نہیں کی لیکن اس کا مدعا یہی تھا۔اس وقت میں خود بے ترتیب ہو کر رہ گیا لالہ رخ نے ان ملاقاتوں میں مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ ہم دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے ملتے ہوئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان چکے تھے ہم نے اپنے ذہن کو ایک دوسرے کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا اس لئے جب لالہ رخ نے اشارہ دیا تو میں انکار نہیں کر سکا۔ بلکہ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس وقت ذرا سی دیر کے لئے شکیل کا بھی خیال آیا تھا اس نے مجھ سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں گی وہ مجھے اپنا وکیل بنا کر لالہ رخ کو اپنے ساتھ لایا تھا اور اس وکیل نے ہی اس کی محبت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اب اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ لالہ رخ اس کے لئے کسی بھی صورت تیار ہی نہیں تھی۔اس کا موقف بھی اپنی جگہ درست تھا۔اس جیسے روشن ذہن کی لڑکی کی ایسے آدمی سے کیونکر نباہ کر سکتی تھی جس کی زندگی جیل میں گزری ہو۔

شکیل ان دنوں جیل میں ہی تھا۔اسے دو سال کی سزا ہوئی تھی۔اس دوران میں، میں اور لالہ رخ ایک ہو گئے۔ ہم نے شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد میں نے وہ علاقہ تبدیل کر لیا تھا ہم کہیں اور چلے گئے ہم دونوں نے مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کر لیا تھا۔ لالہ رخ نے سارا کام سنبھال لیا تھا۔ وہ بہت مفید اور ساتھ نبھانے والی بیوی ثابت ہو رہی تھی زندگی بہت آرام سے گزر رہی تھی۔

پھر ایک دن شکیل سے ملاقات ہوگئی۔وہ جیل سے رہا ہو گیا تھا۔ میں کہیں جا رہا تھا کہ وہ مجھے راستے میں مل گیا۔ اس کو دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں نے اس کی محبت سے شادی کر لی تھی۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔اس سے پہلے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتا وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں تو آپ کو مبارک باد دینے کے لئے تلاش کر رہا تھا۔اچھا ہوا آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔“

”دیکھو شکیل میں نے تمہاری طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔“ میں نے کہا۔

”اوہو! تو اس میں کون سی بڑی بات ہوگئی۔ میں تو خود بھی چاہتا تھا اسی لئے تو لالہ رخ سے آپ کی ملاقات کروائی تھی۔“

”کیا کہا۔“ میں یہ سب سن کر حیران رہ گیا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔”وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔میں نے اس سے محبت کی۔ پھر میں غلط راہوں کا مسافر ہو گیا اور وہ اسی طرح بیٹھی رہ گئی۔ آج کل تو لوگ چہرہ دیکھتے ہیں نا۔ دل اور ذہن کو کون دیکھتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ کسی اچھے آدمی سے اس کی شادی کرا دوں تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔ پھر میں نے آپ کو دیکھا اور ایک کہانی لے کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نے اس سونے جیسے دل والی لڑکی کو پہچان کر اس سے شادی کر لی اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے۔“

”اور وہ جو تم نے مجھے شیخ وغیرہ کی کہانی سنائی تھی ،وہ کیا ہے؟“

”وہ جھوٹ ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔”یہ آئیڈیا ایک کہانی پڑھ کر میرے ذہن میں آیا تھا۔ اس کہانی میں بھی کچھ اسی قسم کی بات تھی۔ اب اگر میں سیدھا مجرم بن کر آپ کے پاس آتا تو آپ میری بات پر کہاں دھیان دیتے۔ کیا خیال ہے......ہم لوگ بھی کہانی بنا سکتے ہیں یا نہیں؟“

شکیل کی کہانی چاہے جھوٹ ہو یا سچ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسی انوکھی کہانی پہلے نہیں سنی۔ لوگ اس طرح بھی قربانیاں دیا کرتے ہیں۔

دشمن روحیں

قسط نمبر:10

ایم اے راحت

ظلم و جبر کی داستان حیرت جو کہ خراماں خراماں اپنے پڑھنے والوں کے رؤیں رؤیں میں خوف کی لہر سرایت کرتی رات کے گھٹا ٹوپ پرہیبت اندھیرے میں روحوں کی دنیا میں لے جائے گی، جہاں کہ اذیت سے دو چار روحیں سبک رفتاری سے پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردیں گی۔

ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

''**کون** ہو تم؟ اور یہ سب کیا ہے۔ یہ لڑکا کون ہے جواب دو۔ ورنہ ہاتھ پاؤں توڑ کر یہیں ڈال دوں گا اور شیر تمہیں چٹ کر جائے گا اور وہ یہیں آس پاس ہی موجود ہے۔''

میرے ان الفاظ پر لڑکی بری طرح سے کانپنے لگی اور ہم پر ایک دل کش انکشاف ہوا۔

''یہ میرے گاؤں کا لڑکا ہے؟''

''ہاں تو پھر......؟''

''اس کا نام رام کمار ہے۔ ہماری بچپن کی دوستی ہے پر ہمارے ماتا پتا نے ہمارا لگن نہیں کیا۔ اور آخر کار میری شادی کسی اور سے کردی مگر میں نے طے کرلیا تھا کہ میں اپنے پتی کے ساتھ نہیں رہوں گی چنانچہ ہم پنگھٹ سے بھاگ آئے یہ میرا ساتھی لڑکا ہے۔''

یہ ساری تفصیل سن کر میں تو کچھ نہ بولا مگر میرے ساتھ جو وفادار آری کھڑا تھا اس نے لڑکی کو مارنا شروع کردیا لڑکی کو مار کھاتے دیکھ کر میں خاموشی سے کھڑا رہا اور میں نے اسے اپنی بھڑاس نکالنے دی جب وہ مار مار کر تھک گیا تو بولا۔

''جا بے غیرت واپس اپنے گھر جا...... ماں اور پتا کی لاج رکھنا بیٹی کا دھرم ہوتا ہے اور تو ان کی لاج کو پیروں تلے روند کر یہاں اپنے یار کے ساتھ بھاگ آئی ہے۔''

پھر وہ لڑکے کی طرف مڑا اور بولا۔

''جا دفع ہو جا......!''

میں اس دوران یہ سوچتا رہا کہ چلو مسئلہ تو حل ہوا کم از کم یہ گمشدہ بہو تو مل گئی یہ تو پتہ چل گیا کہ اسے شیر اٹھا کر نہیں لے گیا تھا اس لئے میں بولا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟''

''مصیبت بن گئی ہے بابو جی!''

''ہاں...... یہ تو ہے۔''

''ارے دیکھیں وہ کون ہیں؟''

ہم نے تین چار لوگوں کو دیکھا۔ جنہوں نے ہمیں نجانے کہاں سے دیکھ لیا تھا وہ اسی طرف آرہے تھے۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی گمشدہ بہو کی تلاش میں ہی تھے۔ یعنی وہ اسی گاؤں کے تھے جہاں سے وہ لڑکی غائب ہوئی تھی۔

یہ بات میں جانتا تھا کہ اگر اس لڑکی کے ساتھ ساتھ لڑکے کو بھی گاؤں والوں کے حوالے کیا گیا تو وہ غیرت میں آکر لڑکے کا قتل کردیں گے۔ مگر لڑکی کو تو ان کے حوالے کرنا ہی تھا۔

چنانچہ ہم نے ساری صورت حال انہیں بتادی اور وہ غصے سے لال پیلے ہوگئے اور پھر وہ لڑکی کو لے



www.urdusoftbooks.com

کراپنی بستی کی طرف چل پڑے۔

جبکہ وہ وفادار نوکر جو اپنے مالک کا بدلہ لینا چاہتا تھا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابو جی۔ ہمارا کام تو ابھی باقی ہے نا۔"

"ہاں...... آؤ!"

میں نے کہا اور ہم گھنے جنگل میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ جبکہ میں تو اپنے آپ کو دھوکا ہی دے رہا تھا میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان دو منحوس شیطانی ہستیوں میں سے کون مجھ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ شام ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے انسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم گوشت تو نہیں کھاتے ہوگے؟"

"یہ بات سن کر وہ ہنسا اور پھر کہنے لگا۔

"جناب ہم فوجی ہیں اور فوج میں یہ ساری باتیں نہیں چلتیں گوشت تو بڑے شوق سے کھاتے ہیں ہم لوگ۔"

"ہم لوگوں سے تمہاری مراد کون ہے؟"

"میں اور میرے مالک......"

"اچھا۔"

"ہاں...... ہم کبھی کبھی چھپ چھپ کر گوشت کھایا کرتے تھے۔ اور میرے مالک کھا کرتے تھے۔

"یار جو مزہ اس خوراک میں ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔"

"ارے واہ...... زندہ باد...... چلو پھر تیاری کرو۔ ہمیں شکار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا اور وہ ایک اچھے ساتھی کی طرح فوری تیار ہوگیا۔

شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اترنے لگے تھے۔ ہم نے بڑے آرام سے چند پرندے شکار کیے وہ ایک اچھے ساتھی کی طرح لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا اور بڑی مشکل سے ان پرندوں کی کھال وغیرہ اتار کر اور ان کی صفائی کرکے اس سے ایندھن کا کام لیا گیا۔ اس کے بعد ان پرندوں کے گوشت کو بھونا گیا اور پھر ہم اسے کھا کر سیر ہوگئے اس نے بڑی رغبت سے گوشت کھایا جبکہ میں نے سوچا تھا کہ وہ تھوڑی بہت گڑبڑ تو ضرور کرے گا لیکن وہ تو مجھ سے زیادہ گوشت کا شوقین نکلا۔ غرض یہ کہ ہم نے رات جنگل میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا اس کے لئے ہم نے ایک گھنا درخت تلاش کرلیا اور پھر اسے اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ اس کی شاخیں چوڑی چوڑی اور آپس میں گتھی ہوئی تھیں یہاں ہم نے اپنا ٹھکانہ بنایا اور اوپر جاکر بیٹھ گئے مختلف جانوروں کی آوازوں نے ماحول کو کافی خوف ناک بنادیا تھا پھر نجانے کیوں جانوروں کی آوازیں آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئیں اور پھر ایک پراسرار سناٹا چھا گیا۔ چاروں طرف پورا جنگل موت کا پراسرار روپ دھار گیا ہم نیم خوابیدگی کے عالم میں لیٹے رہے پتہ نہیں میرے ساتھ سفر کرنے والے وفادار غلام کو نیند آئی تھی یا نہیں آئی تھی۔ جنگل کے جانوروں کی مدھم مدھم آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں کہیں دور سے شیروں کے گرجنے کی آواز سنائی دی تو سارے جنگل کو سانپ سونگھ گیا ماحول میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ جس کی وجہ سے ہر چیز سائیں سائیں کررہی تھی۔

اچانک ہی میرے ساتھ لیٹے ہوئے شخص نے کہا۔

"شیروں کی آوازیں آپ نے سنی مہاراج!"

"ہاں۔"

"کیا خیال ہے تلاش کریں انہیں۔"

اس وقت اس کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔

میں حیرانی سے آنکھیں پھاڑنے لگا پھر میں نے کہا۔

"کیا تم یہ خطرہ مول لوگے؟"

"جیون کا سب سے بڑا خطرہ ہے مہاراج اس سے بڑا خطرہ اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"فلسفی ہورہے ہو تم۔"

"فلسفہ بھی جیون کا ایک حصہ ہے۔"

وہ تو غضب ڈھا رہا تھا۔

"تو پھر کیا کہتے ہو؟"

"آئیں مہاراج دیکھتے ہیں۔ شیروں نے ہمیں آواز دی ہے تو ہم ان کی آواز کیوں نہ سنیں۔"

''ہاں۔''

''کیا خیال ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''تلاش کریں انہیں۔''

''ہاں!''

''تو پھر آئیں تلاش کریں انہیں!''

نجانے کیوں میرے اندر ایک امنگ سی پیدا ہوگئی تھی۔ اسی لئے میں اس کے ساتھ درخت سے نیچے اتر آیا شیروں کی آوازیں ابھی بھی آرہی تھیں۔ ہم ان کے تعاقب میں چل پڑے راستے میں درخت کے نیچے کئی سانبھڑ اور چیتل کھڑے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چوکڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہوگئے۔ ابھی ہم محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ہی ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور فضا میں ہلچل مچاتی ہوئی ختم ہوگئی اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''سنی آپ نے یہ چیخ مہاراج!''

''ہاں۔''

''وہ یقیناً آدم خور نے کسی انسان کا شکار کیا ہے۔''

''یہ تو بڑی خوف ناک بات ہے۔''

''مہاراج ہم اس کا پیچھا کریں گے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

تاریک اور ہولناک جنگل سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا انسانی آواز کے ختم ہوتے ہی ہم پر ایک عجیب سی ہولناکی طاری ہوگئی پھر ایک ڈراؤنی اور پراسرار آواز جنگل میں گونجی یوں لگا جیسے کچھ انسان جانوروں کی آوازیں نکال رہے ہوں۔

''یہ آوازیں سن رہے ہو؟'' میں نے کہا تو بولا۔

''ہاں مہاراج...... آپ کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''جنگلوں سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔''

''مہاراج یہ جنگل کے باسیوں کی آوازیں ہیں۔''

''جنگل کے باسی؟''

''میں دھرم کا ہندو ہوں، بھوتوں پریتوں پر وشواس رکھتا ہوں۔ یہ یقیناً بھوتوں کی آوازیں ہیں۔''

اس کی بات ٹھیک بھی ہوسکتی تھی اب شکر میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے وہ ایسے ہی تھے۔ کہ مجھے اس کی بات پر یقین کرنا ہی تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میں آگے بڑھتا رہا وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ اس خوف ناک آواز کا تعاقب کرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن اس آواز کے راز کو جاننے کے لئے ہم کیا کرتے؟ اس لئے ہمیں اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آواز محض ڈرانے کے لئے اس جنگل پر مسلط ہے ہم دوہری کیفیت کا شکار ہوگئے تھے ایک طرف تو آدم خور شیروں کا مسئلہ تھا ان سے مقابلہ کرنا تھا دوسری طرف یہ آواز آئی۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ مہاراج؟''

''میں اسی آواز کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کوئی دھوکہ بھی ہوسکتا ہے مہاراج؟''

''دھوکہ؟''

''ہاں۔''

''وہ کیسے؟''

''بس مہاراج جنگلوں کی کہانی جنگلوں میں رہنے والے ہی جانتے ہیں۔ ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اور اس کے بعد میں نے بھی اس آواز کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اس سخت مہم پر آگے بڑھتا رہا۔

جنگلوں کے بارے میں میری معلومات تو بالکل صفر تھی۔ جو چار آدمی میرے ساتھ آئے تھے اور جو میری رہنمائی کررہے تھے جہنم واصل ہوگئے تھے اگر یہ وفادار غلام بھی نہ ملتا تو اس جنگل میں تو میری جان ہی نکل جاتی ڈراؤنا جنگل تھا اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا خدا جانے کتنی لمبی رات تھی وقت گزرتا چلا گیا اور خدا خدا کرکے ہم اس جنگل سے قدر کھلی جگہ پر نکلے، تو سامنے ایک پیڑ اور بھیانک آواز کے ساتھ ایک ندی نے راستہ

روک لیا۔

ہم ندی کے کنارے کنارے چلتے رہے ندی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ اگر اس کی لہروں میں ہاتھی بھی کھڑے رہنے کی جرأت کرتا تو وہ تنکے کی طرح بہہ جاتا۔

اچانک پچھلی راتوں کا چاند نمودار ہوا تو پورا جنگل روشنی میں نہا گیا صبح ہونے میں بہت دیر نہیں تھی چاندنی اور صبح کی روشنی ملی جلی جنگل کے ماحول و پراثر انداز ہورہی تھی اور جانور آہستہ آہستہ جاگتے جارہے تھے کبھی کبھی کچھ ہیبت ناک چیخیں ہمارے سر پر سے گزر جاتیں۔ یہ جانوروں کی آوازیں ہی تھیں ہماری نگاہیں ندی پر بھی پڑ رہی تھیں اور اچانک ہی ہم نے ندی کے تیز پانی میں کچھ انسانی لاشوں کو بہتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاشیں تیزی سے آگے نکل گئیں۔

اس کے بعد ایک گیدڑ بہتا ہوا آیا لیکن پانی کی لہروں نے اسے کناروں پر پہنچادیا اور وہ نڈھال سا ہو کر باہر نکل کر ہمارے سامنے گر پڑا لیکن ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جنگل کا بھیانک حصہ اب اپنا روپ بدل چکا تھا پھر ایک زرد رنگ کا اژدھا لہروں میں لپٹا ہوا نظر آیا اور پلک جھپکتے میں تیز پانی کی لہروں میں جکڑا آگے نکل گیا کچھ دور چلے تو دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور وہ بول اٹھا۔

”کوئی گاؤں آگیا ہے مہاراج۔“

”ہاں چلو آگے دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو گاؤں ہی کی تلاش ہے۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دور اور چلے تو ہمیں گاؤں کے کچے پکے مکان نظر آنے لگے کچھ لوگ ندی کے کنارے کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے کہا۔

”ہم شکاری ہیں بھائی اور آدم خور کے تعاقب میں پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔“

”جی مہاراج! ہم کشتی لاتے ہیں آپ وہی کھڑے رہو۔“ ان لوگوں نے کہا۔

پھر ان میں سے ایک بولا۔

”بہاؤ بہت تیز ہے ندی بہت گہری ہے آپ آسانی سے ندی پار کرسکیں گے۔“

دیہاتیوں کا لہجہ بڑا محبت بھرا تھا۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ دوسرے کنارہ پر کچھ دیہاتی ایک کشتی پر لادے آرہے ہیں کشتی زیادہ بڑی نہیں تھی دو دیہاتیوں نے اسے پانی میں ڈال کر اس کے بعد اسے کنارہ کی طرف بہانے لگے تھوڑی دیر بعد وہ کنار پر لے جائے گیں۔

اور ہم نے کشتی کے ذریعے ندی پار کرلی۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ کناروں پر جمع ہوتے جارہے تھے۔ ہم نیچے اتریں تو انہوں نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔

”وہ ہمارے دو آدمیوں کو ہضم کرچکا ہے۔“

”کون؟“

”شیر۔“

”تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا ہے کہ ہم دونوں کسی آدم خور شیر کی تلاش میں ہیں؟“

”مہاراج آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ آپ دونوں شکاری ہیں اور پھر دوسری بات یہ کہ آپ دونوں جنگل کی طرف سے ہی آرہے تھے۔ اسی لئے ہم لوگوں نے یہ فرض کرلیا کہ شاید آپ دونوں یعنی اسی آدم خور کی تلاش میں ہوں۔“

میں نے ان سے پوچھا تمہارے دو بندوں کو وہ کس طرح ہضم کرگیا؟ میرے اس سوال پر ان میں سے ایک شخص بولا۔

”رات کے وقت ایک بندہ قریب کے گاؤں سے آرہا تھا کہ آدم خور نے اسے پکڑلیا ہمارے آدمی اس کی تلاش میں گئے تھے۔ پھر اس شخص کی باقیات ملیں۔“

میں نے توجہ سے اس کی بات کو سنا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”دوسرا بدنصیب کون تھا جو اس آدم خور کا شکار ہوا؟“

”وہ بھی ایک محنت کش تھا بے چارہ آدھی رات اپنے کام سے واپس آرہا تھا۔ گاؤں والوں نے اس کی دل خراش چیخ سنی۔ کچھ لوگ اب اس کے تعاقب میں گئے ہیں اب وہ لاش ڈھونڈ کر ہی واپس آئیں گے۔“

''تم نے اس بے چارے کو قلاش کیوں کہہ رہے ہوں؟''

''ظاہر سی بات ہے کہ شیر اس انتظار میں نہیں ہوگا کہ گاؤں والے اسے ڈھونڈ کر اس بدنصیب کو رہا کروائیں۔ جب تک گاؤں والے شیر کو تلاش کریں گے وہ اپنا شکار کر کے جاچکا ہوگا۔''

''ہوں۔''

میں نے ہنکارا بھرا۔اتنے میں وہ شخص گویا ہوا۔

''آپ اگر چاہیں تو آرام کرلیں ہم آپ کو جگہ بتادیتے ہیں۔''

ان لوگوں کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ شاید ہم شکاری ہیں۔اور ہوسکتا ہے کہ ہم آدم خوروں سے انہیں نجات دلادیں۔ چنانچہ وہ ہماری بڑی آؤ بھگت کررہے تھے۔ اور آخر کار وہ ہمیں ایک ایسے گھر میں لے گئے جو خالی تھا۔یہاں انہوں نے جلدی جلدی چارپائی اور بستروں کا انتظام کیا اور ہم لیٹ گئے میرا ساتھی بولا۔

''کیا کہتے ہیں مہاراج۔''

''میرا خیال ہے کہ رات بھر جو ہم نے جنگل گردی کی ہے اس کے بعد نیند بڑے مزے کی آئے گی۔''

''ٹھیک ہے پھر سونے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ہم اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دیہاتی گرم گرم دودھ اورباجرے کی روٹیاں لے آئے۔ جن پر کافی مقدار میں مکھن رکھا ہوا تھا۔یہ تازہ مکھن تھا۔ جو شاید ابھی ابھی دودھ سے نکالا گیا تھا۔گرم گرم دودھ اور مکھن کے ساتھ باجرہ کی روٹی نے وہ مزا دیا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا اور پھر نیند ایسی آئی کہ گھوڑے بیچ کر سونے کا محاورہ درست ثابت ہوگیا۔شام تک سوتے رہے تھے۔شام کو جب جاگے تو بہت سی آوازیں گونج رہی تھی۔ان لوگوں کی مہمان نوازی کا ہم دونوں کو ہی اطراف تھا۔ میرا ساتھی بولا۔

''جاگ گئے مہاراج؟''

''ہاں۔''

''تھکن تو نہیں ہے؟''

''یار......ساری تھکن اتر گئی ہے۔''

''مہاراج ان لوگوں کی باتیں میں سن رہا ہوں یہ ہمیں کوئی بہت بڑا شکاری سمجھتے ہیں اور اس بات پر بہت خوش ہیں کہ اب ہم ان کی مدد کریں گے۔''

''یار......کیا کہتے ہو تم؟''

''بھگوان کی سوگند۔میرا بس چلے تو میں ایک منٹ میں ان آدم خوروں کو ہلاک کردوں۔یہ لوگ بڑے دکھی ہیں اور بہت دنوں سے ان آدم خوروں کا شکار بن رہے ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور جھونپڑے کی چھت کی جانب دیکھنے لگا۔ ماضی انسان کبھی نہیں بھولتا اور ماضی انسان کو نہ جانے کیا کچھ یاد دلاتا ہے کیا زندگی تھی کیا بن گئی۔ ماں باپ تھے گھر بار تھا، کس طرح ختم ہوگیا اور اس کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔ کیسے کیسے زندگی کے راستے بنتے چلے گئے نہ جانے کیسے کیسے جھگڑوں میں پھنسا اور اس کے بعد یہاں تک گنگا سری ذہن میں آگئی لیکن میں نے نفرت سے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ مگر یہ کیا مصیبت کہ اب وہ دوسری دیوی ذہن میں آگئی مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے اپنے ساتھی سے کہا۔

''اب وہ لوگ آجائیں گے۔''

میرا یہ کہنا ہی تھا کہ پانچ چھ افراد پہنچ گئے ہماری جھونپڑی کے باہر مونڈھے ڈال کر گویا میٹنگ کا آغاز کردیا گیا ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

''میرا نام راج کمار ہے مہاراج میں گاؤں کا مکھیا ہوں۔''

''ہاں...... راج کمار ہم تمہاری کیا خدمت کرسکتے ہیں؟''

''مہاراج آپ کے پاس بندوقیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شکاری ہیں۔ مہاراج ان شیروں نے تو ہمارا جیون نشٹ کرڈالا ہے کسی کو اپنے جیون کا بھروسہ نہیں رہا۔ ابھی تھوڑے فاصلہ پر ایک

پہاڑی کے ٹیلہ پر ہمارے ایک آدمی کی کھائی ہوئی لاش پڑی ہوئی ہے ہم نے دن میں ایک کام کیا ہے مہاراج کہ وہاں ایک مچان تیار کروا دیا ہے کیوں کہ آپ کو پتہ ہے کہ شیر کھائی ہوئی لاش کے پاس ضرور آتا ہے۔"

"ٹھیک...... میرا خیال ہے ہم مچان پر جائیں گے۔"

"شام کے کھانے کے بعد مہاراج۔"

راج کمار نے کہا اور ہم لوگ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو لئے تو ہمارے سامنے کھانا لگا دیا گیا سرسوں کا ساگ مکئی کی روٹی اوپر سے مکھن۔ لیکن اس وقت ہمیں ذرا محتاط رہنا تھا کیونکہ اس کے بعد ہمارا کام ہی دوسرا تھا۔ پھر اس کے بعد ہم مچان کی طرف چل پڑے۔ گاؤں کے ایک شخص کو رہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ کر دیا گیا تھا گاؤں کے مکھیا نے کہا۔

"مہاراج آپ چنتا نہ کریں ہم لوگ بھی زیادہ دور نہیں ہوں گے آپ سے؟"

"ٹھیک ہے۔"

میں نے جواب دیا اور ہم دونوں مچان پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا ایک پیشہ ور شکاری کی حیثیت سے میں نے ابھی کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اور میرے ساتھ بیٹھا شخص بھی تقریباً میرے ہی جیسا تھا۔ اس نے اپنے مالک کو کھو دیا تھا۔ اور وہ اب میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ بہرحال یہ سب جاری رہا اور ہم مچان پر بیٹھے رہے۔ ابھی بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ میرے جسم میں سنسنی پیدا کر دیتی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا پھر اچانک ہی ہمیں دھڑام دھڑام کی آوازیں سنائی دیں اور ہم چونک گئے۔

"یہ کیسی آوازیں ہیں؟"

"سانبھر ہے مہاراج۔"

سانبھر کا ایک بے حد پریشان اور گھبرایا ہوا غول ہمارے پاس آیا اور پھر گزر گیا جس شخص کو شیر نے کھایا تھا اس کی بچی کچی لاش ہمارے سامنے ایک گڑھے میں پڑی ہوئی تھی کہ اچانک دور سے شیر کی گرج سنائی دی اور کچھ دیر کے بعد ہم نے شیر کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ دبے قدموں اسی طرف آ رہا تھا۔

شیر کو دیکھ کر ہم سناٹے میں آ گئے شیر آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ اور میں نے اور میرے ساتھ بیٹھے ساتھی نے بندوقیں تان لیں ہم دونوں پوری طرح تیار تھے۔ شیر آہستہ آہستہ آیا اور گڑھے میں اترا۔ پھر اس نے آدمی کی کھائی ہوئی لاش منہ میں دبائی اور گڑھے سے باہر نکل آیا اسی وقت وہ بولا۔

"دیکھیں مہاراج دیکھیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اور اس نے ایک ساتھ فائر کر دیا اس کے ساتھ ہی دو دھماکے ہوئے اور دونوں گولیاں شیر کا پیٹ چیرتی ہوئی نکل گئیں شیر نے لاش کا آدھا حصہ چھوڑا اور جست لگا کر مچان کے قریب آیا وہ درخت سے ٹکرایا اور نیچے گرا۔ لیکن اچانک یوں لگا جیسے نیچے گرتے ہی اس کا وجود غائب ہو گیا ہو۔ گاؤں کا وہ آدمی جو میرے ساتھ تھا کپکپاتی آواز میں بولا۔

"مائی باپ یہ بھیانک جانور ایسا ہی کرتا ہے آپ کا نشانہ چوک گیا ہے۔"

"نہیں نشانہ نہیں چوکا۔ دونوں گولیاں اس کے بدن کے پرخچے اڑاتی ہوئی نکل گئی ہیں تم یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"جی مہاراج۔"

اس کا لہجہ بڑا سنگین تھا۔

"تو پھر کیا کہتے ہو؟"

"آیئے مہاراج؟"

اس نے اتنے اعتماد بھرے انداز میں کہا کہ مجھے شرم آ گئی وہ ایک معمولی سا انسان ہوتے ہوئے کس قدر پراعتماد تھا ہم دونوں نیچے اتر کر جو پہلی چیز ہمیں نظر آئی وہ خون تھا یقیناً یہ خون شیر کے بدن سے نکلا تھا اور اس کے دھبے آگے بڑھتے چلے گئے تھے خون کے بڑے بڑے دھبوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہم گھنے جنگل کی طرف بڑھنے لگے ہمارا ساتھی جو اسی گاؤں کا

باشندہ تھا گھبرا رہا تھا اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''مہاراج وہ پلٹ سکتا ہے۔ اور پھر میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ شیر ایک نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں آ جاؤ۔''

''نہیں مہاراج شما چاہتا ہوں۔ مجھے شما کر دیں میرے تو پاؤں بھی ٹھیک سے نہیں اٹھ رہے۔ میں واپس گاؤں جا رہا ہوں۔''

''تیری مرضی ہے۔ جیسے تو پسند کرے۔'' میں نے کہا اور وہ واپسی کے لئے مڑ گیا میں نے دیکھا کہ اس کے قدم کانپ رہے تھے میرا خیال تھا کہ اس کا اس طرح اکیلے جانا مناسب نہیں ہے۔ اور میرا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔ بہرحال ہم خون کے دھبوں کا تعاقب کرتے رہے اور یہ دھبے آگے جا کر گھنے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر طرف قد آور جھاڑیوں کا راج تھا ہوا درختوں سے سنسناسنسنا کر آگے بڑھ رہی تھی بڑی عجیب و غریب آوازیں فضاء میں بکھری ہوئی تھیں یہاں تک کہ ہم کافی دیر تک شیر کو تلاش کرتے رہے میرے ساتھ چلنے والا غلام فطرت شخص بھی بڑے کمال کا تھا وہ بالکل نہیں ڈر رہا تھا جبکہ مجھے اس سے بہادری کی امید نہیں تھی ہم صبح تک زخمی شیر کا تعاقب کرتے رہے اور اسے تلاش کرتے رہے لیکن پھر روشنی ہو گئی اور وہ بولا۔

''نکل گیا حرامی! چلیں مہاراج واپس چلیں؟''

آخرکار ہم واپس پلٹ پڑے کافی فاصلے طے کئے گاؤں سے کافی فاصلے پر ہم نے کافی لوگوں کو اکٹھا دیکھا جبکہ وہ بولا۔

''تو وہ ہی ہوا جو ہم نے سوچا تھا۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آیئے مہاراج!''

ہم آگے بڑھے اور ان لوگوں کے قریب پہنچ گئے وہاں پر اسی آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی شیر نے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا ہم افسوس کرنے لگے ہم دونوں نے آپس میں بھی گفتگو کی کہ اسے اکیلے واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔

جبکہ ہم نے اسے کتنی دفعہ منع کیا تھا کچھ لوگ رو رہے تھے آخرکار انہوں نے لاش اٹھائی اور گاؤں کی طرف چل پڑے رات بھر سے ہم جاگے ہوئے تھے گاؤں والے بھی ہم سے بدظن نہیں ہوئے تھے اسی لئے میرا ساتھی بولا۔

''مہاراج ہم پتہ نہیں کتنے دنوں سے کوششیں کر رہے ہیں اور ابھی تک کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اس پاپی شیر کا۔ پر مہاراج آپ بھی ہمت نہ ہاریں ہمیں آپ کا بڑا سہارا حاصل ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ صبح کا ناشتہ کیا گیا کوئی ایک یا ڈیڑھ گھنٹے ہم نے آرام کیا کہ ہمارے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ شیر کافی زخمی ہو گیا ہے اور کہیں نہ کہیں ہمارا اس سے ٹکراؤ ضروری ہے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ تیار ہو گیا اور ہم اپنے مشن پر روانہ ہو گئے آدم خور شیر کے پنجوں کے نشان ندی کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آگے پتھریلی زمین آ گئی تو پنجوں کے نشان ختم ہو گئے تھوڑی دور اور چلے تو خوفناک جنگل نظر آیا۔ جو پہلے جنگل سے بھی زیادہ تاریک اور ڈراؤنا تھا زخمی شیر انتہائی خطرناک اور انتہائی قوت برداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہمارے لئے ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا اندھیرے جنگل میں آگے بڑھے تو بڑا وحشیانہ نظر آیا۔

پورا جنگل چھوٹی بڑی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ جنگلی مرغ آپس میں لڑ رہے تھے اچانک دس بارہ بھیڑیوں نے غار سے نکل کر ہم پر حملہ کر دیا تو ہم نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں کی ہولناک آوازوں کے ساتھ دو بھیڑیے تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔ باقی غاروں میں جا چھپے اور پورے جنگل پر ہیبت ناک سناٹا چھا گیا۔ اس سے کم از کم ایک بات کا اندازہ ہوتا تھا جس کی نشان دہی اس نے کی۔

''مہاراج اگر آدم خور اس جنگل میں موجود ہے تو دوسرے جانور اس طرح آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ زخمی شیر اس

جنگل میں کم از کم نہیں ہے آپ کو شاید بات معلوم نہیں کہ جنگل کے بادشاہ کی موجودگی میں چڑیا تک خوف زدہ رہتی ہے۔"

میں نے پرخیال انداز میں گردن ہلادی تھی۔ شیر شدید زخمی تھا۔ خدا جانے کدھر نکل گیا۔ اس کا تعاقب ہمارے لئے بڑا مہنگا ثابت ہورہا تھا۔ لیکن بہرحال میں جس کیفیت کا شکار تھا اس کے بارے میں اسے بھی معلوم نہ تھا۔ جو میرے ساتھ چل رہا تھا میرے دل میں تو بس ایک ہی خیال تھا کہ کاش میں ان دونوں چڑیلوں کی گرفت سے باہر نکل جاؤں۔ جنہوں نے میری زندگی تلخ کررکھی ہے۔ جنگل میں شیر کا تعاقب ہمارے لئے بڑا مہنگا ثابت ہورہا تھا۔ ایسا بھیانک جنگل میں نے زندگی میں بھی تصور تک میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے راستے میں اس سے سوال کرڈالا۔

"یہ بیلا کھیون کا جنگل ہے ناں۔"

"جی مہاراج۔"

"ہوں!"

ان علاقوں میں اس سے بڑا خوف ناک جنگل اور کوئی نہیں ہے اور پھر یہ ہے بھی جنگل در جنگل، ایک جنگل ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہوجاتا ہے یہاں ہم پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے اس جنگل میں کالے رنگ کے سانپ ہی سانپ تھے۔ سانپ ویسے سانپوں کی یہ صفت بھی اس نے ہی مجھے بتائی کہ جب تک انہیں چھیڑا نہ جائے یا پھر وہ پاؤں تلے نہ آجائیں وہ وار نہیں کرتے البتہ اس نے کہا۔

"ایک بات آپ سے کہیں مہاراج ہمارے من میں پہلے بھی یہ ہی بات تھی کہ ہم جن علاقوں میں آدم خوروں کا پیچھا کررہے ہیں۔ وہ علاقے غلط ہیں پہلے بھی درندے جس طرح دندناتے پھر رہے تھے ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شیر اس جنگل میں نہیں ہے اور اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں سانپ ہی سانپ ہیں سانپوں کا شہر ہے۔ شیر کا یہاں کیا کام، میری مانیں تو مہاراج اس موت کے جنگل سے دن چھپنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہئے۔"

ہم دونوں تیز رفتاری سے چل پڑے۔ بڑے بڑے بھیانک مناظر نگاہوں کے سامنے آئے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی کچھ نا کچھ نظر آجاتا تھا۔ لیکن اب ہمیں ایک موٹا سا اژدھا نظر آیا اس نے ایک چیتے کو ہلاک کررکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ایک فٹ چوڑا پھن پھیلایا اور ہم پر خوفناک نگاہیں ڈال دیں اس کی لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی میں نے بندوق سیدھی کرلی تو اس نے مجھے روک دیا۔

"معافی چاہتا ہوں مہاراج ان پر فائر نہ کریں کیونکہ اگر شیر کہیں پاس ہوا تو فائر کی آواز پا کر ہماری طرف متوجہ ہوجائے گا۔"

وہ جس قدر تجربہ کار تھا اس کا اندازہ اب مجھے ہورہا تھا۔ چنانچہ ہم خاموشی سے سانپوں اور اژدھوں کی بادشاہت کی حدود سے باہر نکل گئے۔ سامنے ایک تالاب تھا۔ وہاں نیچے اور غور سے دیکھا تو تالاب کے پانی میں سیاہ رنگ کے ناگ تیر رہے تھے خدا کی پناہ بڑا خوف ناک اور ہیبت ناک جنگل تھا۔ دور دور تک کوئی اور جاندار نظر نہیں آرہا تھا سوائے ان سانپوں کے! لگ رہا تھا کہ پورے جنگل میں بس ان کا ہی راج ہے۔

اب ہم جس طرف نکل آئے تھے وہاں سے اب صحیح معنوں میں واپسی کا یقین بھی نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

"اگر ہم گاؤں واپس جانا چاہیں تو کیا آسانی سے گاؤں واپس جاسکتے ہیں۔"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا مہاراج کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اوہو...... وہ دیکھئے وہ کیا ہے؟"

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ایک پہاڑی کے دامن میں ہمیں ایک کالا سا بڑا سا دھبہ نظر آرہا تھا کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ ایک تاریک سرنگ محسوس ہوئی اس سرنگ میں بھی بڑے بڑے سانپ رینگ رہے تھے۔ دور ہی سے اندازہ ہورہا تھا۔

''نہیں مہاراج یہ ہمارے لئے نہیں ہے۔''

اور وہاں سے رخ بدل لیا آگے بڑھے تو ادھر ادھر پہاڑیاں نظر آئیں ہم ایک پہاڑی پر چڑھے وہاں بھی بہت سارے خونخوار سانپ پیڑ پر چڑھے خرمستیاں کر رہے تھے ان زہریلی بلاؤں سے بچتے بچاتے ہم بائیں طرف سنگلاخ چٹانوں پر اتر گئے نیچے اترے تو آگے ندی آ گئی ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اور ایک مقام پر ندی پار کر کے ناک کی سیدھ میں چل پڑے کوئی دو میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ہمیں کچھ انسان نظر آئے غالباً کوئی اور چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن یہ وہ گاؤں نہیں تھا جہاں ہم واپس جانا چاہتے تھے تھوڑا آگے چلے تو پرانے مکان نظر آنے لگے۔ جھونپڑے بنے ہوئے تھے یہ کوئی خاص قبیلہ تھا۔ جوناگوں کا پجاری تھا میرا ساتھی...... اب میں اسے ساتھی ہی کہوں گا وہ ان لوگوں کی زبان جانتا تھا۔ لیکن یہ زبانیں اب میں نے بھی کافی حد تک سیکھ لیں تھیں یا پھر کچھ پراسرار قوتوں نے ہر زبانیں خود بخود میرے ذہن میں داخل کر دی تھیں مگر میں خاموش کھڑا رہا۔ جبکہ وہ بولا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟''

''ہم؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کیا نام ہے اس گاؤں کا؟''

''بھولان۔''

''کتنی آبادی ہے؟ آپ کے اس گاؤں کی؟''

''وہ پتہ نہیں مہاراج...... پر بہت سے لوگ ہیں یہاں پر مہاراج۔ پر آپ کدھر سے آ رہے ہیں؟''

''سامنے کے جنگل سے۔''

''سامنے کے جنگل سے؟''

''ہاں!''

''نہیں مہاراج...... اس طرف سے نہ تو کوئی آ سکتا ہے اور نہ ہی اس طرف جا سکتا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ دیوی اور دیوتا کا دیس ہے۔''

''دیوی، دیوتا؟''

''ہاں!''

''مگر یہاں تو سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے ہیں۔''

وہی تو ہم کہہ رہے ہیں وہ ناگ دیوتاؤں کا دیس ہے۔ کوئی بھی ان خوف ناک دیوی دیوتاؤں کے نرغے سے جیتا نہیں نکل سکا۔ وہ امر ہیں اور ان کی گرفت سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''ہم یقین نہیں کر سکتے مہاراج۔ اگر آپ لوگ زندہ ہو، تو بڑی عجیب بات ہے۔''

وہ لوگ بہت زیادہ عقیدت مند تھے۔ دیوی دیوتا کے ہم نے ادھر ادھر دیکھا وہاں پانی کا عجیب سا شور تھا اس شور کے بارے میں پتہ چلا کہ پہاڑ کے پیچھے ایک بہت ہی تیز رفتار ندی ہے جس کی خوف ناک لہریں پہاڑ سے ٹکراتی ہوئی گزرتی ہیں یہ اسی کا شور تھا ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

''مہاراج اگر ہاتھی بھی ان لہروں میں پھنس جائے تو تنکے کی طرح بہتا ہوا گزر جائے اور یہ ریت کے پہاڑ نما ٹیلے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سورج مغرب میں پہاڑوں کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہونے لگا۔ شفق کی خونی سرخی ہرے بھرے پہاڑوں پر بے حد خوبصورت لگ رہی تھی اور حسین مناظر سے طبیعت میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ گاؤں والوں نے ہمیں پیشکش کی، کہ ہم رات وہاں بسر کر سکتے ہیں۔ یہاں شیروں وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں تھا انہوں نے بھی جس استطاعت کھانے پینے کی اشیاء ہمیں دے دیں جن میں پھل اور دودھ کی بہتات تھی رات ہم نے وہی بسر کی۔ صبح ہم اٹھے ناشتہ کیا پہاڑ پر چڑھے اور قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسری طرف اتر گئے آگے وہ ہی ندی سے بہتے

کوتا نے ہمارے سامنے موجود تھی اور واقعی اس کی تیز لہروں میں چوپایوں کی لاشیں بجلی کی رو کی طرح گزر رہی تھیں۔ ہم اب ناگوں کا علاقہ اور آدم خور شیروں کو بھول چکے تھے۔ ہم اپنی منزل سے بھٹک گئے تھے اور اب نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وقت ہمیں کہاں سے کہاں لے جائے؟ میں نے ایک دفعہ آنکھیں بند کرکے حالات کا تجزیہ کیا تو مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مشکلات کا شکار رہوں یا پھر آسانی کا۔"

"مجھے اس احساس پر ہنسی سی آئی۔ مجھ جیسا کاہل انسان جس نے ماں باپ کے کندھے پر بیٹھ کر زندگی کو استعمال کیا۔ آج وہ نہیں راج مہاراج بنا اس مشکل کا شکار ہے۔ میں تو ان مشکلات میں پھنس کر اپنا دین بھی کھو بیٹھا اور مجھے اس کا بے حد دکھ تھا۔ لیکن اب میں ان مشکلات سے گزر رہا تھا کہ بس کیا بتاؤں لیکن پھر بھی نجانے کیوں میرے دل میں ایک خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ جن مشکلات سے میں گزر رہا ہوں یہ میرا امتحان ہو، جو برائی میری اندر پیدا ہوچکی ہے یا جو غلطی سے میرے وجود میں اتر چکی ہے شاید ان مشکلات سے گزرنے کے بعد میرا قصور معاف ہوجائے اس خیال نے میری آنکھوں میں نمی پیدا کردی۔

وہ بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا وہ تو باقاعدہ مجھے ایک ہندو ہی سمجھتا تھا۔ ہم لوگ ضرورت پڑنے پر شکار کرلیا کرتے تھے جبکہ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ چلو وہ تو دوسری طبیعت کا بندہ ہے مگر میں بھی گوشت خور ہوں۔ ان تمام خیالوں میں ڈوبے ہوئے ہم ندی کے کنارے کنارے چل رہے تھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس ہیبت ناک ندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ندی بڑے ہیبت ناک اور پراسرار آواز کے ساتھ بہہ رہی تھی پانی کا شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

اس شور نے ہمارے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہماری زبانیں ایک طرح سے بند ہوچکی تھیں بس ہمارا بدن متحرک تھا آگے بڑھے تو تین اونٹوں پر کچھ لوگ جاتے ہوئے دکھائی دیئے ہمیں دیکھ کر انہوں نے گردن ہلائی ہم نے ان سے ندی پار کرنے کا راستہ پوچھا۔

تو ایک شخص نے مجھے بتایا کہ آگے چل کر ندی دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ وہیں ایک پل ہے وہاں کشتیوں کا بندوبست ہے اس سے ندی پار کی جاسکتی ہے۔

یہ سن کر وہ بولا۔

"مہاراج یہ بڑی بات ہے کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی آبادیاں مل رہی ہیں۔ جبکہ ہم اپنی منزل سے بہت دور نکل آئے ہیں۔"

آخر ہمیں کشتیوں کا ایک پل نظر آیا اور ہم نے وہ خوف ناک جگہ بھی عبور کرلی۔

دوسری طرف پہنچے تو سامنے ہی بنجاروں کے جھونپڑے نظر آئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں سے رونے پیٹنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں ہم نے آواز کا تعین کیا اور جب ہم وہاں پہنچے تو لوگ دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا بھائی؟"

بمشکل ہم نے ایک شخص کو بات چیت کرنے پر رضامند کیا۔ تو اس نے ہمیں بتایا کہ رات کو دو نوجوان لڑکے باڑے کے باہر سو رہے تھے کہ ایک زخمی آدم خور نے ان پر حملہ کردیا اور پھر ان دونوں کو ہلاک کردیا ان کی آدھی کھائی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔

"تم سب کو کیسے پتہ چلا کہ وہ شیر مطلب آدم خور شیر زخمی تھا؟"

"دراصل قریب کے جھونپڑے میں ایک شخص سویا ہوا تھا اس نے ہی یہ سارا منظر دیکھا اور پھر ہمیں بتایا۔"

"مہاراج وہ آدم خور بہت زیادہ زخمی تھا، اور بہت خونخوار بھی تھا اس کے پیٹ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔"

یہ تفصیل سننے کے بعد ہم دونوں نے خوشی سے

ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ میرا ساتھی بولا۔

''ہم اسی آدم خور کی تلاش میں آئے ہیں۔ بھائی اگر تم لوگ ہم سے تعاون کرو تو ہم اسے ہلاک کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

بنجاروں کے مکھیا...... جو کہ کب سے ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے تھے بولے۔

''ہم تم سے کیا تعاون کریں مہاراج؟''

''جن لوگوں پر حملہ کر کے اس نے انہیں ہلاک کردیا ہے اور ان کی لاشیں کھالی ہیں ان میں سے کسی ایک کی لاش کو وہیں چھوڑ آؤ۔ جہاں انہیں ہلاک کیا گیا ہے کیونکہ شیر آدھی کھائی ہوئی لاش کے پاس ضرور آتا ہے۔''

وہ لوگ تیار ہوگئے۔ خاص طور پر مکھیا نے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا اور ایک بار ہم پھر پرامید ہوگئے چنانچہ ہم نے لاش اس ڈیرے پر ڈلوائی جہاں شیر نے ان پر حملہ کرکے ان دونوں کو ہلاک کردیا تھا لیکن ہمیں ایک جگہ کی ضرورت تھی ہم نے لاش کے سامنے ایک درخت پر جگہ بنائی اور وہاں بیٹھ گئے بنجارے اپنے اپنے جھونپڑوں میں جاچھپے تھے اور دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے اب یہ عام بات تو نہیں تھی کہ وہ آسانی سے شیر کا انتظار کرتے اور پھر سو جاتے۔

سورج غروب ہوا اور پھر چاند نمودار ہوگیا دور دور کا علاقہ دودھیا روشنی میں نہا گیا تھا ہم دم سادھے انتظار کرتے رہے ہماری بندوقیں تیار تھیں۔ اچانک ہی گیدڑوں کی آوازیں اور موروں کی کوہونے آسمان سر پر اٹھالیا اور پھر سارے ماحول کو سانپ سونگھ گیا ایک دھاڑ گونجی اور آدم خور آتا ہوا دکھائی دیا ہمارے اعصاب تن گئے تھے شیر آتا دکھائی دیا اور ہم اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگے لیکن اب ایسی شناسائی بھی نہیں تھی اس سے کہ ہم اسے پہچان لیتے۔ ہم یہ جاننے کی کوشش کررہے تھے کہ کیا یہ وہ ہی زخمی شیر ہے جو ہماری گولیوں سے زخمی ہوا تھا بہرحال یہ ایک مشکل کام تھا کہ ہم اسے پہچان لیتے۔

شیر آہستہ آہستہ زخمی بنجارے کی آدھی لاش کی طرف بڑھا اور نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر لاش کو سونگھا اس کا پیٹ صاف نظر آرہا تھا جس پر گولیوں کے دوہرے نشان تھے اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ درندہ نہیں ہے بلکہ کوئی بھوت یا مافوق الفطرت مخلوق ہے جو ہماری دو گولیاں کھانے کے باوجود اسی سج دھج سے چلا آرہا تھا۔ بہرحال ہم دم سادھے ہوئے تھے اور آس پاس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک ہی کسی چھٹی حس کے تحت شیر نے لاشعوری طور پر درخت کی جانب دیکھا ہماری رائفلوں سے دو شعلے نکلے وہ زمین پر گرا۔ اور پلک جھپکتے میں اس نے ایک لمبی جست لگائی اور ہمارے درخت کے پاس سے گزرتا ہوا ایک بار پھر ہماری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

''خدا کی پناہ خدا کی پناہ خدا کی پناہ۔''

میں نے دل ہی دل میں سوچا اگر یہ الفاظ میرے منہ سے نکل جاتے تو یقینی طور پر میرے پاس بیٹھا شخص چونک اٹھتا۔

لیکن اب ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک وقت بھی نہیں تھا اب اس وقت خطرہ مول لئے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا چنانچہ ہم درخت سے نیچے اتر آئے اس بار ہم پوری ہمت اور ذمہ داری کے ساتھ شیر کے تعاقب کررہے تھے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ کسی کی جان لیوا چیخوں سے پورے پہاڑ گونج اٹھے ساتھ ہی شیر کی غراہٹوں سے پورا علاقہ گونجا تو ہم تیزی سے آوازوں کی سمت بڑھے ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بستی کی طرف سے ایک شخص بھاگتا ہوا آیا وہ قریب پہنچا اور پھر دوسرے ہی لمحے دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

ہم حیران رہ گئے پھر ہم نے جھک کر بے ہوش کو دیکھا پھر میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر اسے زمین پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے وہ بندوق لئے چاروں طرف

کا جائزہ لے رہا تھا کہ کہیں شیر آس پاس ہو اور ہم پر حملہ آور ہو تو اسے گولی ماردی جائے بڑی ذمہ داری کا کام تھا ادھر بڑی مشکل وہ بندہ ہوش میں آیا اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور زبان گنگ ہو چکی تھی اس نے بڑی مشکل سے بتایا کہ اس کا سامنا ابھی ابھی ایک آدم خور سے ہوا تھا اور وہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا وہ شخص انتہائی خوف زدہ تھا۔

"مم...... مہاراج...... وہ زخمی ہے، وہ خون خوار درندہ ہو رہا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔"

"تم جاؤ...... بھاگ جاؤ۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟"

"بھاگوں گا نہیں مہاراج...... آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ جب تک وہ پاپی مر نہیں جائے گا میں بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

اس شخص پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی اس کی اس بات پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مسکرا دیئے۔

"اب سنبھالیں مہاراج۔"

"ہاں کوشش کرتا ہوں۔ اتنے چالاک اور مکار آدم خور کی تلاش اتنی رات کو کرنا اس کی خوراک بننے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا ہم نے شیر کا پیچھا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں ہم محفوظ رہ سکیں ایک نالے کے قریب ایک اونچی چٹان نظر آئی تو میں نے وہاں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم دونوں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جبکہ ہمارا نیا ساتھی خوف کے مارے ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ ابھی ہمیں سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک ہی اس کی چیخوں نے ہربڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا ہم نے اس شخص کو دیکھا اس کی حالت بری طرح خراب ہو رہی تھی پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اب کیا ہوا ہے کیا مصیبت نازل ہو گئی تم پر؟"

"مائی باپ...... ابھی ابھی آدم خور یہاں سے گزرا ہے وہ نالے کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہمیں گھور رہا تھا اور اس کے بعد وہ نجانے کدھر نکل گیا۔"

"وہ کھڑا گھور رہا تھا اور تمہاری آواز بند ہو گئی۔"

"بس مہاراج ہماری آواز نہ نکل سکی۔" یہ سن کر میں مسکرا دیا اور پھر بولا۔

"اسے کہتے ہیں نادان دوست۔ اس نے تو ہمیں مروا ہی دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ آدم خور اگر ذرا سی ہمت کرتا تو ہمیں آسانی سے سوتے میں شکار کر لیتا۔"

"اب کیا کریں۔ مائی باپ؟"

"جیسا کہ کہہ رہا ہے ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔"

میں نے بے رخی سے کہا۔ اب میں شیر کے خوف سے بے خوف ہو گیا تھا بہرحال میرا ساتھی تو میرے ساتھ ہر کام کے لئے تیار تھا۔ ہم جان کا خطرہ مول لے کر شیر کے تعاقب میں چل پڑے۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ شیر کی خوف ناک گرج سے فضا لرز گئی اچانک آدم خور گھنے جنگل سے نکلا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم دونوں ایک دم سے چوکنے ہو گئے تھے دور سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شیر کی نگاہوں میں انتقام کی آگ سلگ رہی ہے اور وہ ہم پر جھپٹنے کے لئے تیار ہے۔ ہم نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بنا ایک ساتھ فائر کر دیئے۔

لمحہ بھر کے لئے اس نے اپنے جسم کو تولا اور زمین پر گر پڑا گولیاں اس کے بدن میں لگی تھیں مگر واقعی اتنا سخت جان اور دلیر جانور ہم نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ شیر ہے یا چھلاوا ہم دونوں نے نشانہ لیا لیکن فائر کرنے کی نوبت نہ آئی شیر ایک بار پھر اٹھا لمبی چھلانگ اور جنگل میں غائب ہو گیا عجیب موذی اور ظالم سے پالا پڑا تھا۔ ہم ان گھنے جنگلوں سے اکتا گئے تھے روزانہ لمبے لمبے سفر طے کرنے پڑ رہے تھے بہرحال اب شیر کو چھوڑنا میرے بس کی بات نہ تھی ایک مرتبہ پھر ہم گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔

یہ بات ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ زخمی شیر

بہت زیادہ چوکنا اور ظالم ہوتا ہے آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی اور تاریک جنگل اس وقت بالکل تاریک پڑا ہوا تھا۔ درخت بھوتوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ اچانک ہمیں پھر شیر کی غراہٹ سنائی دی میں فوراً فائر کے لئے تیار ہو گیا لیکن غراہٹ عجیب سی تھی تھوڑی دیر تک ہم انتظار کرتے رہے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں اور اندازہ ہوا کہ شاید درندہ دم توڑ رہا ہے اور چند لمحات کے بعد وہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ گیا وہ زمین پر گھسٹ رہا تھا اور شاید اب اس کے اندر اپنے قدموں پر چلنے کی ہمت نہیں تھی ہم نے دو فائر اور کئے اور سخت جان عیار آدم خور کی لاش ہمارے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ ہم اس کے قریب پہنچے اور یہ اطمینان کر لیا کہ وہ واقعی ختم ہو چکا ہے تو ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اور پھر اس کے بعد انتہائی لمبا سفر طے کرنے کے بعد ہماری واپسی ہوئی تھی اور شیر کی ہلاکت کی خبر سن کر گاؤں والے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ہمیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ ہم نے وہاں سے واپسی کی اجازت مانگی لیکن گاؤں والوں نے کہا۔ ”نہیں مہاراج...... آپ نے ہم لوگوں پر جتنا بڑا احسان کیا ہے ہم ایسے تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ چنانچہ ہمیں وہاں رکنا پڑا۔“

گاؤں والے واقعی شیر کی موت کا بہت بڑا جشن منا رہے تھے پہلی بار گاؤں دیکھنے کا موقع ملا گاؤں کی حسین کنیائیں ہماری خوب خاطر مدارت کرنے لگیں گاؤں والوں کے عقائد کچھ عجیب سے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس کے پجاری ہیں ایسے ہی سیر کے لئے نکل گئے تھے وہ شخص جو اپنے مالک کا بدلہ شیر سے لینے کے لئے میرے ساتھ جڑا تھا۔ اب اس وقت میرے ساتھ نہ تھا۔ میں آگے بڑھتا رہا اور مجھے ایک ٹوٹی پھوٹی کالے رنگ کی عمارت نظر آئی۔ نجانے کیوں میرے قدم اس عمارت کی جانب اٹھ گئے میں آگے بڑھا۔ مندر نما عمارت تھی۔ بہت ہی بھدی ایک بات میں نے محسوس کیا کہ میرے قدم خود بخود اس عمارت میں داخل ہوئے ہیں۔ جب میں عمارت میں داخل ہوا تو حیران ہوا کہ اس عمارت کے اندر داخل ہونے کا میرا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر میں نے وہاں کسی کو کھڑے دیکھا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی زندہ وجود نہ تھا۔ بلکہ ایک مجسمہ تھا ایک بہت ہی بڑا مجسمہ۔

اس مجسمے کا بھیانک چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مجھے یوں لگا جیسے وہ شرارت بھری آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ یہ بات سچ نکلی یہ سوچ میرا وہم نہیں تھی بلکہ وہ گنگا سری تھی جو مجھے دیکھ رہی تھی اچانک سے اس کے ہونٹ مسکرائے اور پھر وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”کہو...... خوب سیریں ہو رہی ہیں شکار ہو رہے ہیں اپنی پوجا کرروا رہے ہو۔؟“

”تم ؟“

”ہاں کیوں ؟ تمہیں حیرت ہوئی ہے۔ اس گاؤں کے لوگ میرے پجاری ہیں اور یہ اعزاز میں نے تمہیں دلوایا ہے ورنہ اس آدم خور کو شکار کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔“

”آہ...... تو کیا تم بدستور میرا پیچھا کر رہی ہو۔“

”ہاں تمہیں دیکھ رہی ہوں کہ تم کیا کیا کھیل کھیل رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا تم اتنی آسانی سے ہم سے دور جا سکتے ہو۔“

”آہ...... مجھے لگ رہا ہے کہ تم میری زندگی کے آخری سانس تک میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔“

”ہاں بالکل...... تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ چھوڑ ہی نہیں سکتی ؟“

”یہ سب تو بس کہنے کی باتیں ہیں ورنہ مجھے یقین ہے میں جلد ہی اپنا کھویا ہوا ایمان واپس حاصل کر لوں گا۔“

”ہوں...... یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔“

”ہوں...... ہاہاہا...... دیکھتے ہیں۔“

(جاری ہے)

قرض

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

انسانی زندگی میں آن شان مصمم ارادہ، ذہنی تگ و دو، اور پرخلوص لگن سے انسان اپنے اٹل رادوں کو اٹل عملی جامہ پہنا کر دوسروں کی نظر میں سرخرو ہوجاتا ہے اور پھر......

قرض عرض مرض اور فرض جیسے الفاظ کو احاطہ کرتی برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی کہانی

زمین کی بساط پہ فضا نے اپنا مہرہ......چال چل دی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ فیل، اسپ یا شاہ نہیں تھا۔ اس کا مہرہ ''رات'' تھا، سیاہ ترین رات ...... کسی کے مقدر کی طرح سیاہ ترین رات...... اور رات بھی خطرناک اور وحشت انگیز......آسمان پہ سیاہ بادل حاوی تھے۔ بادل۔ جو جارحانہ انداز میں بجلی کو ''زدو کوب'' کررہے تھے۔ بجلی کی ہراساں چیخیں فضاء کولرزائے دیتی تھیں۔ بجلی جب چلاتی تھی تو اس کے منہ سے شعلے نکلتے تھے۔ ایسے ہی جب ایک بار وہ چلائی تو ان شعلوں کی چمک میں ایک سفید حویلی چمکی تھی۔ اس حویلی کے لان میں ایک نقاب پوش واضح ہوا۔ اس کی گہری آنکھیں سانپ کی مانند چمکی تھیں اس کے دائیں شانے پر ایک چار پانچ سالہ بچہ جھول رہا تھا۔ بادلوں نے فوراً ہی بجلی کو دبوچ لیا تھا۔ بجلی کے دل میں اب تجسس جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر سر باہر نکالا۔ بچہ رو رہا تھا۔ اور وہ شخص بچے کے معصوم وجود کو سختی سے جکڑے ہوئے تھا۔ اس کی سختی بچے کو مزید رلا رہی تھی۔

اس نقاب پوش کی آنکھوں میں ایسی سفا کی تھی کہ بجلی جھرجھری لے کر بادلوں کے فراخ سینے میں منہ چھپا گئی۔ بادل اتنی زور سے دہاڑے کہ فضا بے ساختہ تھرا اٹھی۔ بجلی کچھ دیر تو بادلوں ہی میں سہمی رہی پھر اس نے ہمت کرکے بادلوں میں جھری سی بنا کر ذرا سا جھانکا۔ اس کی آنکھیں ابھی کسی بھی منظر کو چھو نہ پائی تھیں کہ بادلوں نے اسے چابک رسید کیا۔ بجلی بلبلا اٹھی اور مارے درد کے اس کی آنکھیں میچ گئیں فضاء کو پھر سیاہی نے ڈھانپ لیا۔ ویسے یہ سیاہی بھی بلا کی بے نیاز ہے۔ جب یہ کسی کے مقدر پر پھر جاتی ہے تو اس بدنصیب کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ کچھ بھی نہیں......اس کا کوئی ستارہ نہیں۔ امید کا کوئی جگنو بھی نہیں۔ اور اس وقت بھی سیاہی ''رات'' کی آنکھوں پر پھر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ساری روشنیاں اڑان بھر کر غالباً بجلی کے وجود میں جا سمائی تھیں اور اب اندھی رات اپنے اندھے پن کا ماتم کرتے ہوئے ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔ جن کے مقدروں پہ سیاہی پڑ جائے وہ بھی اس اندھی رات کی طرح پھر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوتے ہیں۔

ہاں اگر وہ سیدھے راستے پہ چل نکلیں تو اپنے ''اندھے مقدر'' کو دعا کے ذریعے روشن کرسکتے ہیں۔ بلاشبہ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ بجلی نے پھر چہرہ نکالا تو چم سیدھی بچے پہ جا پڑی وہ اب حلق پھاڑ کر


Hammad

روہا تھا۔اس شخص نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔اس کے ہاتھ میں موجود چاقو چمکا تھا۔اس نے چاقو کی نوک بچے کے دائیں شانے میں گھبو دی ساتھ ہی اس نے کچھ کہا بھی تھا۔بجلی نے اپنا دراڑوں جیسا ہاتھ باہر نکال کر اس نے چاقو چھیننا چاہا، مگر...... چاقو کو چھوتے ہی اسے گویا کرنٹ لگا تھا۔بجلی نے بے ساختہ چلاتے ہوئے ہاتھ بے اختیار اوپر کھینچ لیا۔وہ سہم کر بادلوں میں چھپ گئی تھی۔اندھی رات پل بھر کو تو سانس لینا بھی بھول گئی۔بجلی نے ایک آنکھ میچ کر دیکھا تو وہ شخص بچے سمیت اندھیرے کی سیاہ آغوش میں سماچکا تھا۔اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

صرف اور صرف بارش تھی جو متواتر برس رہی تھی اور اندھی...... سیاہ رات تھر تھر کانپتی بھیگ رہی تھی۔ نجانے وہ سردی سے کانپ رہی تھی یا پھر...... دہشت سے...... بہر حال اس کا لرزتا وجود بھیگ رہا تھا اور کہیں جائے پناہ بھی نہ جائے امان......!

وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں پھنسائے سر جھکائے چل رہا تھا۔گولڈن براؤن سلکی بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرے تھے وہ سوچوں میں مگن سر جھکائے ٹہلنے کے انداز میں چل رہا تھا۔سورج مغرب کی سمت جھکتا جارہا تھا اور سائے طویل ہورہے تھے۔پختہ اینٹوں کی روش کے اطراف سنبل کے طویل قامت پیڑ غرور سے سر تانے کھڑے تھے۔ہوا انہیں نرمی سے چھو رہی تھی۔

اچانک اس نے قدموں کا رخ موڑا۔وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ہلکے سرمئی رنگ کی عمارت...... جس کی بالائی منزل، گلاس کے چمکتے دروازے اور گول طویل ستون دور سے بھی نظر آرہے تھے۔سرخ اینٹوں کی شفاف سڑک، جس کے اطراف آم کے پیڑ تھے اور دونوں جانب ہی سرسوں کی فصل...... سیدھی اس شاندار عمارت تک جاتی تھی جلد ہی وہ عمارت کے سامنے تھا۔دونوں گارڈز خوش گپیوں میں مگن تھے۔اس بات سے قطعاً بے خبر کہ موت عین ان کے سر پر پہنچ چکی ہے۔

قدموں کی آہٹ پر دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔"ٹھک" کی آواز ابھری اور ایک ساتھ دو شعلے لپکے۔دونوں کو گولی سینے میں لگی تھی۔دونوں کو موت نے ایک ہی انداز میں دبوچا تھا۔اور دونوں ایک ساتھ ہی نیچے گرے تھے اور فرشتہ اجل نے ایک ساتھ ہی دونوں کی روح قبض کی تھی سائیلنسر لگے ریوالورز کے سیاہ نتھنوں سے کچھ لمحے دھواں نکلتا رہا۔اس نے دونوں ہاتھ پھر جیبوں میں پھنسالئے اور محض اچٹتی سی نظر نیم پلیٹ پر ڈالی، "مہروز ہاؤس" اس نے ہلکے سے سر جھٹکا اور اگلے ہی منٹ میں وہ اندر تھا۔طویل روشنی اسے عمارت تک لے گئی۔

دائیں جانب گیراج میں کرولا اس بات کی نشاندہی کررہی تھی کہ اس کا "شکار" گھر پر تھا۔ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ملازمائیں اس پر نگاہ پڑتے ہی سراسیمہ ہوگئیں۔"فیروز کا بیڈ روم کون سا ہے؟" اس کے سرد لہجے نے ان کے اندر پھریری سی دوڑادی۔کوئی جواب نہ پاکر اس نے ایک ملازمہ کو لپک کر دبوچا تو سب کی گھٹی گھٹی سی چیخیں نکل گئیں۔

پسٹل کا "دیدار" انہیں سہمائے دے رہا تھا۔وہ ملازمہ کے سر سے پسٹل لگائے اسے آگے دھکیل رہا تھا۔تھر تھر کانپتی ملازمہ اس کی رہنمائی کرنے پر مجبور تھی۔"وہ...... وہ......!" اس نے کانپتی انگلی سے اشارہ کیا اور وہیں سیڑھیوں کی خوب صورت ریلنگ کے ساتھ لگ کر نیچے کھسکتی چلی گئی۔پسٹل دائیں ہاتھ میں تھامے اس نے آگے بڑھ کر بائیں پاؤں کی زوردار ٹھوکر دروازے پر رسید کی تو دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔

فیروز نے پہلو میں موجود لڑکی سے نظر ہٹا کر دروازے کی جانب قہر آفریں نگاہ ڈالی کس میں اتنی جرأت تھی کہ اس کی تنہائی میں مخل ہوتا؟ اس پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔"تم یہاں......" اس سے زیادہ بولنے کی اسے مہلت نہ ملی وہ فیروز بخت کی بات کاٹ گیا۔

"کلمہ پڑھ لو فیروز بخت!" اس سنگین لہجے نے جادو کا اثر کیا تھا۔فیروز بخت کا رنگ اڑا تھا۔

"دیکھو......!" اس نے کہا مگر اسی پل ایک

شعلہ لپکا اور صوفے پر بیٹھے فیروز بخت کو چاٹ گیا گولی عین دل پر لگی تھی ساتھ بیٹھی لڑکی کی چیخیں نکل گئیں۔

فیروز بخت کچھ دیر تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا آف وائٹ صوفہ خون سے رنگین ہورہا تھا۔ اس نے ایک نظر فیروز بخت پہ ڈالی اس کے چہرے پر موت کی اذیت رقم تھی۔ لڑکی جو بھی چیخ رہی تھی اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر لبوں پہ سختی سے ہاتھ رکھے، اپنی آواز کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ایک دم پلٹا اور باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں ایک ملازمہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

''مہروز صاحب! وہ فیروز صاحب کے کمرے میں۔'' اسے دیکھ کر ملازمہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا اور رنگ ہلدی ہوگیا۔ لیکن وہ بے نیازی سے گزرتا چلا گیا۔ مہروز ہاؤس سے باہر نکل کر وہ واپس ہولیا۔ اس کے انداز میں بلا کا اطمینان تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اب وہ پھر ہاتھ جیکٹ میں پھنسائے سر جھکائے چہل قدمی کے انداز میں چل رہا تھا۔ سورج مزید مغرب کی جانب جھک چلا تھا۔

☆......☆......☆

''وہ...... وہ خبیث انسان میرے گھر میں...... میرے بیٹے کو مار گیا......؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' مہروز بخت خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا اس کے گھر پہ حملہ اور پھر بیٹے کا قتل کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اس کے کارندے اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ اور قانون بھی اس کے ہاتھ میں، اس کی جیب میں تھا اور ہمارا قانون تو......

''مہروز صاحب!'' ایس ایچ او مظہر ملک کی آواز پر اس نے اسے دیکھا۔ وقار احمد اور اسامہ کے خلاف ایف آئی آر...... ''مجھے اسامہ وقار آج رات تک لازمی چاہیے۔ میں اپنے انتقام کی آگ اس کے وجود میں اتارنا چاہتا ہوں۔ آج رات...... ہر حال میں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔ اس کے کرخت نقوش اس وقت مزید کرخت ہوگئے تھے۔

''ان کے سارے ٹھکانوں کی جانب گئی ہے پولیس۔ میں بھی نکل رہا ہوں۔ اگر وہ کسی بل میں بھی ہوا تو ہم اسے نکال لیں گے۔'' مظہر ملک کے لہجے میں زعم تھا۔ مہروز بخت نے محض ہنکارہ بھرا تھا۔

اگلے چند روز کافی ہنگامہ خیز تھے۔ وقار احمد کا ہر ٹھکانہ ان کی نظروں میں تھا۔ اور تقریباً ہر ٹھکانے پر پولیس نے چھاپے مارے تھے۔ وقار احمد بھی کوئی عام شخص نہ تھا کہ اس پر یوں آسانی سے ہاتھ ڈالا جاسکتا۔ مگر اس نے خود پولیس سے تعاون کیا تھا۔ اور جواباً پولیس نے بھی اس سے ''تعاون'' کیا تھا۔

مہروز بخت کو یقین دلایا گیا کہ اسامہ کہیں نہیں ملا۔ اور رہا وقار احمد نے تو قبل از گرفتاری ضمانت حاصل کرلی تھی یوں ہی ایک ماہ گزر گیا۔ مہروز بخت کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھا۔ اس کے آدمی نگرانی پہ مامور تھے۔ اور پھر مہروز بخت کو علم ہوا کہ پولیس نے اس سے غداری کی ہے۔ اس نے سختی سے باز پرس کی مگر جواباً اعلیٰ افسران کا جواب ملا کہ ''سر اوپر سے دباؤ پڑا تھا۔'' اس نے خود اسامہ کو مارنے کی ٹھان لی۔ مگر اس سے قبل ہی ایک رات......

رات نے اپنے سیاہ پر فضا میں پھیلا رکھے تھے۔ اندھیرا کسی اژدھے کی مانند پھنکار رہا تھا۔ مہروز بخت اپنے فارم ہاؤس سے گھر واپس آرہے تھے۔ گارڈز بھی ان کے ہمراہ تھے۔ گاڑی جب پورچ میں کھڑی ہوئی تو وہ نیچے اترے۔ اسی پل ایک پھنکار ابھری اور ان کے دائیں پاؤں میں انگارہ سا اتر گیا درد کی لہر ان کی پوری ٹانگ کو کاٹتی چلی گئی۔ ان کے لبوں سے کراہ نکلی اور پھر وہیں انگارہ بائیں پاؤں میں دھنس گیا۔ گارڈز فوراً الرٹ ہوئے مگر تب تک وہ سیاہ ناگ تیزی سے سرکتا گھاس میں غائب ہوگیا اس پر کی گئی فائرنگ بیکار ثابت ہوئی تھی۔ تب تک مہروز بخت تکلیف کی شدت سے چلانے لگے تھے۔ انہیں فوراً طبی امداد دی گئی۔

ان کا ایک بوڑھا ملازم سپیرا رہ چکا تھا۔ اس نے زخموں پر کٹ لگا کر خون چوسا اور اسی سبب ان کی جان

بچ گئی۔ لیکن بہرحال ڈاکٹرز کوان کی ٹانگیں گھٹنوں سے ذرا اوپر کاٹنا پڑی تھیں۔ صدمہ ان پہ بے حد اثر انداز ہوا تھا اور وہ گم صم ہو کر رہ گئے تھے۔

''اسامہ!'' وقار احمد نے راکنگ چیئر جھلاتے اسامہ کو مخاطب کیا۔ ''جی بابا'' چیئر کی حرکت تھم گئی اور وہ بیڈ پر نیم دراز وقار احمد کو دیکھنے لگا۔ ''مہروز بخت کو کاٹنے والا سانپ جانتے ہو کون تھا؟'' ان کے چہرے کا تاثر عجیب سا تھا۔

''جی......؟'' وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''وہ گورکی تھا۔''

''وہاٹ؟ بٹ......'' تحیر نے اسے بات بھی مکمل نے کرنے دی تھی۔

''ہاں...... وہ ایک پراسرار شخص ہے، یہ تم اکثر کہتے ہو اور اس کے پاس بہت طاقتیں ہیں۔''

''ہوں گی مگر وہ سانپ کیسے بن سکتا ہے؟'' بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''بخشو!'' انہوں نے اسامہ کی بات کا جواب دینے کی بجائے ملازم کو پکارا جو فوراً مووب سا آن کھڑا ہوا۔ ''گورکی کو بھیجو۔''

''جی۔'' وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ کچھ سیکنڈ بعد گورکی آ گیا۔ اس کے لمبے گھنگریالے بال بے ترتیبی سے شانوں پر دھرے تھے۔ چہرے کے نقوش میں کرختگی تھی اور بھوری آنکھیں اسرار میں ڈوبی تھیں۔ اسامہ کو اپنا وہ روپ دکھاؤ جس میں تم نے مہروز بخت کو معذور کیا ہے۔'' وہ بولے۔

ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ گورکی نے اثبات میں سر ہلایا اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس کی ہیئت بدلنے لگی۔ چند لمحوں کی عجیب وغریب تبدیلیوں کے بعد وہاں ایک سیاہ ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اسامہ کے چہرے پر دست حیرت نے پنجے گاڑے تھے۔ اور احمد محظوظ کن نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بس کافی ہے۔'' احمد نے سر کو جنبش دی تھی گورکی چند لمحے بعد پھر اپنی اصلی حالت میں تھا۔

''اسامہ! میں تمہیں ہر کام میں پرفیکٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے بچپن ہی سے تمہیں غیر معمولی تربیت دے گئی۔'' وہ سگار سلگانے لگے ان کی بات درست تھی اسامہ کی تربیت دیگر بچوں سے قطعاً مختلف انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اسکول سے آ کر ''ہتھیاروں'' سے کھیلتا تھا رفتہ رفتہ یہ کھیل اس کی عادت نہیں یا یوں اب وہ محض سترہ سال کی عمر میں اس فن میں طاق تھا۔ اس کا نشانہ بے مثال تھا۔

''اور اب تم گورکی سے علم حاصل کرو گے۔!'' انہوں نے گورکی کو مخاطب کیا تھا۔

''سر؟'' اس نے فوراً سر خم کیا۔

''آج سے اسامہ کو اپنا علم، اپنا تجربہ گھول کر پلانا شروع کر دو۔'' ان کی آنکھوں میں ایک پراسراری چمک تھی۔ اور اسامہ! مہروز کا بیٹا شہروز بخت چند دن میں واپس آ رہا ہے۔'' وہ مزید بولنے لگے لہجہ اور انداز رازدارانہ تھا۔ اسامہ نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

''پاپا! میں فیروز بھائی کے قاتل کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔'' شہروز بخت کی سیاہ آنکھوں میں طیش کی چنگاریاں تھیں۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اگر میں معذور نہ ہوتا تو......'' انہوں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر قدرے توقف سے گویا ہوئے ''اس میں معاملے میں اور کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے تمہیں بلوایا ہے۔ اسامہ اور وقار احمد...... ان دونوں کی موت ہی مجھے سکون دے سکتی ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' شہروز بخت پرعزم تھا۔ ''لیکن...... اسامہ پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل ہے۔'' ان کی آنکھوں میں طیش کی پرچھائیاں تھیں اور طیش کی تہہ میں تشویش کروٹیں لیتی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں پاپا! اسامہ اب میرا شکار ہے اسے تڑپا تڑپا کر مارنا...... میرا مشن ہے اور وہ ایسے ہی مرے گا یہ شہروز بخت کا وعدہ ہے۔'' وہ وہیل چیئر پر بیٹھے

مہروز بخت کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔"
اور یکلخت ہی مہروز بخت کا تفکر کافور ہو گیا...... انہیں علم تھا کہ شہروز اپنی سانسوں کی ڈور توڑ سکتا ہے۔" مگر" وعدہ" نہیں...... انہیں بخوبی علم تھا کہ اسامہ سے بدلہ لینے کے لئے شہروز اب ہر حد تک جائے گا۔" ہر حد تک" اور یہی تو وہ چاہتے تھے۔ سوان کا اطمینان فطری تھا۔

☆......☆......☆

شام دھیرے دھیرے موت کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے سرمئی رنگ پر موت کا سیاہ رنگ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ویران سڑک تھی کبھی کبھار کوئی گاڑی وغیرہ گزرتی تھی۔ اسامہ کی بیک مرسیڈیز سڑک پر پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ وہ حسب معمول اکیلا ہی تھا۔ اگرچہ اسے کافی خطرات درپیش تھے مگر اسے باڈی گارڈز کا دم چھلا کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا سو...... اس وقت وہ جس جگہ سے گزر رہا تھا وہاں چند درخت تھے انہی درختوں نے یکا یک شعلے اگلے...... چند انگارے دو ٹائرز و چھلنی کر گئے چند انگارے اس کے سر کے آس پاس سے گزرے تھے اگلے ہی لمحے اس نے سر جھکا لیا۔ گاڑی کچھ دور تک لڑھکنے کے بعد چرچرا کر رک گئی۔ ونڈ اسکرین تڑخ کر ٹوٹ گئی تھی۔ فائرنگ بدستور جاری تھی۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے پرندوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ اور وہ چلاتے ہوئے فضاء میں پرواز کر گئے تھے گولیاں مرسیڈیز پر دونوں طرف سے برس رہی تھیں۔ گویا وہ اسے کسی صورت زندہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے وہ ٹوٹی اسکرین سے بلی کی طرح بونٹ پر پھسل گیا تھی گولیاں اس کے آس پاس لہرائیں بارود کی بو...... اس کی پسندیدہ خوشبو اس کے پاس مہکنے لگی تھی دائیں شانے میں یکلخت آہنی سلاخ دھنس گئی۔ اس نے چیتے کی مانند ایک جست بھری اور تقریباً اڑتا ہوا دائیں جانب والے رائفل بردار پر جا پڑا۔ ان میں سے کوئی بھی اس صورت کے لئے تیار نہ تھا۔ لمحہ بھر کو سب ہی بوکھلا گئے۔ اور لمحہ بھر کی یہ" بوکھلاہٹ" اس کے لئے کافی تھی۔ رائفل اس نے ایک جھٹکے سے چھینی تھی اور اس کا دستہ اسی کے مالک کے سر پر رسید کیا تھا۔ اس کی بائیں ٹھوکر اس شخص پر پڑی جو اس کا نشانہ لے چکا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔

رائفل کی نال سے نکلتا برسٹ بہت سی مٹی اڑا گیا۔ اگلے چند لمحے بے حد حیرت انگیز تھے زخمی ہونے کے باوجود وہ ان سب کو زیر کر چکا تھا۔ ایک طویل برسٹ...... چار سو گھومتی رائفل اور...... زخمیوں کی چیخیں۔ وہ کل آٹھ لوگ تھے جن میں سے چھ تو تقریباً بے دست و پا تھے باقی دو خالی ہاتھ کھڑے اسے حیرت سے تک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہمت دکھائی اور منہ کی کھائی۔ اسامہ کا فولادی گھونسہ اس کا جبڑا توڑ گیا۔ دوسرا ویسے ہی تھر تھر کانپ رہا تھا۔

موت سامنے دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔" مم...... مجھے مت مارنا۔" اسامہ کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ گھگھیایا۔

"اوکے۔ ویسے بھی یہ" کچرا" بھی کسی کو تو سمیٹنا ہی ہے۔" اس کے لبوں کو مدھم مسکراہٹ نے چھوا۔" اپنے مالکوں کو بتا دینا کہ" پہل" ان کی طرف سے ہوئی ہے۔ ورنہ شہروز بخت پر ہاتھ ڈالنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔"

"بہروز کی کھوپڑی بکھر چکی تھی۔"

فضا ایک بار پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔" لے جانا۔" آخری آدمی کو سرد لہجے میں ہدایت دے کر وہ پلٹا۔ اس کا رخ حملہ آواروں کی کرولا کی جانب تھا۔ اور اس کی چال مستحکم تھی۔

☆......☆......☆

"تم اتنے سارے لوگوں سے وہ ایک" لڑکا" نہیں قابو کیا گیا؟" مہروز بخت کی مٹھیاں طیش سے بھینچی تھیں۔ اور آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

فاضل کا سر ندامت اور دہشت سے جھکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہراس کے سائے لرز رہے تھے۔" مم...... معافی سرکار!" الفاظ اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔

"جب وہ سب مر گئے تو تم بھی کہیں ڈوب

مرتے۔ یہ منحوس صورت لے کر یہاں کیوں آئے؟'' اس نے دانت پیستے ہوئے پسٹل کا رخ اس کی طرف کردیا۔ فاضل کا رنگ موت سے پہلے ہی موت کے خوف نے زرد کردیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر...... ''سنسناتی'' ہوئی موت اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کرگئی۔

''بہت برا ہوا۔ بہت برا۔'' مہروز بخت خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''اگر...... اگر اسامہ بچ گیا ہے تو...... اب ہمارا کوئی آدمی نہیں بچے گا۔''

''آپ فکر مت کریں۔ اس بات میں خود...... جاؤں گا......'' وہ کہہ کر رکا نہیں۔

☆......☆......☆

سڑک پر کھڑی جیپ نے راستہ بلاک کر رکھا تھا۔ شہروز بخت ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ دفعتاً اس کا سیل گنگنایا نمبر دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ عیاں تھا کہ ''کالز'' سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہے۔ ''ہیلو۔'' اس کا لہجہ شوخ تھا اور یک دم ہی لاتعداد سارے چمک اٹھے تھے۔ ''تمہیں بھلا سکتا ہے کوئی؟ ارے یار! بس کچھ بیزی ہوں۔'' یکا یک اس کا انداز سنجیدہ ہوگیا۔

''نہیں یار تم سے اہم تو شہروز بخت کے لئے اس کی اپنی زندگی بھی نہیں۔'' ایک گاڑی کی آہٹ پر اس نے سر موڑ کر دیکھا اور عجلت میں گویا ہوا۔

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' لیکن کون جانے کہ وہ ''بعد'' کبھی آئے گا یا نہیں۔؟ اس نے سیل آف کر کے ڈیش بورڈ پر پھینکا اور سرعت سے باہر لپکا۔ آنے والی گاڑی بھی رک گئی اور...... اسامہ باہر نکلا۔ سڑک سے قدرے فاصلے پر کیکر کے درخت پر بیٹھے عقاب نے اپنی عقابی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ شہروز بخت اور اسامہ آمنے سامنے تھے۔ عقاب نے فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ واضح سنی تھی۔ اب خدا جانے موت اسامہ کے لئے تھی یا...... شہروز بخت کے لئے ان دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ اوپر کئے تھے دونوں کے ہاتھ میں ''موت'' دبی تھی۔ اس موت کا رخ ''مقابل'' کی سمت تھا۔ وہ دونوں چند لحظہ تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ دونوں کے ریوالور نے ایک ساتھ موت اگلی تھی۔ لیکن...... عین آخری لمحے عقاب کی چونچ نے شہروز بخت کے سر پر ''لینڈ'' کیا تھا۔ اس کا توازن بگڑا تھا۔ اور جب توازن بگڑا تھا تو نشانہ بھی ''بگڑ'' گیا تھا۔ موت نے شہروز بخت کا دل چاٹ لیا تھا۔

لیکن موت نے اسامہ کے بائیں بازو کو ''چھوا'' تھا۔ عقاب واپس اس درخت کی شاخوں پر جا بیٹھا شہروز بخت دل پر ہاتھ رکھے وہیں ڈھیر ہو چکا تھا۔ اسامہ نے بغور اس کا جائزہ لیا شہروز بخت کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا اس قدر عجیب کہ پہلی بار اسامہ کے دل کو ''کچھ'' ہوا تھا شہروز کی آنکھیں نیم وا تھیں اور ان میں موت سمائی ہوئی تھی۔ اسامہ ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔

کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے ''صبر'' کے آداب سکھانے والے
جب وہ ''بچھڑا'' تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے

☆......☆......☆

نم زدہ...... تازہ مٹی کی مہک میں اگربتی کی سوگوار خوشبو بھی شامل تھی اور تازہ گلابوں کی خوشبو بھی۔ اس نے آنکھیں کرب سے میچ لیں۔ ''یہ سچ ہے کہ تم ''زندگی'' ہو میری۔''

زندگی کا مگر...... بھروسہ ''کیا؟'' گھمبیر لہجہ...... اچھا! مجھے لگتا ہے کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ سنجیدگی سے کہا گیا جملہ۔ شہروز بخت کی زندگی تمہارے بغیر کچھ نہیں میری زندگی۔ وہ جو اسے ''زندگی'' کہا کرتا تھا وہ اب زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور جا چکا تھا۔ لیکن وہ خود بھلا کب جانا چاہتا تھا؟ کوئی بھی جان بوجھ کر زندگی کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اسے جانے پر مجبور کیا جاتا ہے شہروز بخت کو بھی مجبور کیا گیا تھا۔ زندگی کے دل سے قاتل کے لئے ہزاروں بددعائیں نکلی تھیں اور اس کی آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے تھے۔

زندگی نے ایک نظر شہروز بخت کی قبر پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی اس کی چال میں صدیوں کی تھکن تھی وہ قبرستان سے "باہر" نہیں جارہی تھی وہ قبرستان کو اپنے اندر اٹھائے جارہی تھی اور جب ہنستا بستا دل قبرستان بن جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے بھلا......؟ پھر......

☆......☆......☆

فضاء پر سناٹے کا راج تھا۔ گاہے بگاہے پرندوں کی آوازیں سناٹے کے کانوں پر چوٹیں مارتی تھیں اور وہ کسمسا کر رہ جاتا تھا۔ اسامہ اپنی مخصوص مستحکم چال چلتا چھوٹی سی پختہ سڑک پر چل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ حسب معمول جیکٹ کی جیب میں پھنسا رکھے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ بال فراخ پیشانی کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس کے کسی بھی انداز سے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ "شکار" پر جارہا ہے اس کا رخ ایک فارم ہاؤس کی طرف ہوا۔ سرسوں کے پیلے پھولوں نے تاحد نگاہ فارم ہاؤس کی وسیع عمارت کو گھیر رکھا تھا۔ وہ فارم ہاؤس ڈی آئی جی کا تھا۔ اس نے وقار احمد کا ایک کام کرنے سے انکار کیا تھا اور اسے "انکار" کا مزہ چکھانا ضروری تھا ورنہ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی انکار سیکھ جاتے۔ گیٹ پر متعین "گارڈز" بیٹھے ہوئے تھے اور بے ہنگم انداز میں قہقہے لگا رہے تھے انہیں کلمہ پڑھوانے میں محض ڈیڑھ منٹ صرف ہوا تھا راستہ صاف تھا اسامہ کو راستہ صاف کرنا بخوبی آتا تھا چند سیکنڈ بعد ہی وہ ممتاز ظفر کے سامنے تھا۔

"ممتاز ظفر اس وقت اپنے چند دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔" ارے یہ غریب لوگ کیا کر سکتے ہیں سوائے رونے دھونے کے؟ اور رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس فیصلہ ہوگیا۔ احمد حسن کو "پولیس مقابلے" میں چھلنی کردیا جائے گا۔ تم زوہیب کو کچھ عرصہ کے لئے باہر بھیج دو۔ کیا ہوا جو وہ اشتہاری ہے۔ آخر یہ غریب لوگ بھی تو اس ملک پر بوجھ بنے ہیں۔ ذرا سا کم ہو جائے گا۔" ممتاز ظفر نخوست سے بول رہا تھا۔

لیکن کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا نا؟" سہیل خان تفکر سے گویا ہوئے۔

"ارے فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوگا۔ کتنے ہی لوگ اس فیز سے گزر کر آج ایک بہترین زندگی گزار رہے ہیں اب دور کیا جانا؟ اسی فرزان کو دیکھ لو......لوگ آج اشرف ڈکیت کو بھول چکے ہیں پلاسٹک سرجری نے اسے فرزان ملک بنادیا۔ ممتاز ظفر کی بات پر ایک بلند قہقہہ پڑا تھا۔

"لیکن مسئلہ تو ہوگیا ہے ممتاز ظفر اسامہ کا سرد لہجہ سب ہی کو ٹھٹکا گیا۔

"تت......تم؟" ممتاز ظفر نے شاید اس کی آنکھوں میں اپنا انجام دیکھ لیا تھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں یہ کوئی پہلی بار تو ہے نہیں کہ کوئی مسئلہ ہوگا۔ کلمہ پڑھ لو سب۔ اس کے سیاہ آنکھوں کا سحر چند لمحے کو تو انہیں گویا مفلوج کر گیا تھا۔

برہان نے پسٹل کو زحمت دی تھی مگر...... وہ صرف زحمت ہی دے رہا تھا۔ ایک طویل برسٹ بارود کی خوشبو گولیوں کی زبردست تڑتڑاہٹ اور آخری چیخ ......یہ اس کا من پسند مقام تھا۔

گارڈز کو سائیلنسر موڈ پر شکار کرنا اس کی مجبوری تھی ورنہ یہ تڑتڑاہٹ......آہ کیا میوزک میں سرشاری ہے؟ اس نے آنکھیں موند کر سوچا ہرگز نہیں اس نے ایک آخری نگاہ ان لوگوں پر ڈالی جو محض چند لمحے قبل لوگوں کی تقدیر کے فیصلے کر رہے تھے انہیں خبر نہ تھی کہ ان کی تقدیر کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔

وہ ایک دم پلٹا اور بوڑھے ملازمین، میاں بیوی کو یکسر نظر انداز کرتا باہر نکل گیا۔ اس کی چال باوقار تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی مرسیڈیز میں تھا گاڑی سڑک پر حسب معمول پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

یک بارگی ایک نسوانی وجود سڑک پر نمودار ہوا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ "خدمت نسواں" کا قائل نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا پیر بریک پر جا پڑا۔ "مجھے کچھ لوگ کڈنیپ کر کے لائے ہیں وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں پلیز ہیلپ می۔" وہ بار بار پیچھے دیکھ رہی تھی وہ آرہے ہیں۔ وہ خوف زدہ انداز میں چلائی۔

اسامہ نے سرموڑ کر دیکھا۔ دو راتقل بردار جھاڑیوں سے نمودار ہوئے تھے۔ اسامہ کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور انہیں ساکت کر گیا فضا نے بارود کے ساتھ ساتھ خون کی بو کو بھی سونگھا تھا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لڑکی کو سر کی جنبش سے اشارہ کیا اور وہ فرنٹ سیٹ پہ آن بیٹھی۔

تھینک یوسوچ۔" وہ اسے ممنون نظروں سے تک رہی تھی وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

"ویسے لوگوں کی زندگیوں سے اتنی آسانی سے کھیل لیتے ہو تم؟" وہ اپنے زخمی بازو پر ہاتھ جماتے بولی۔

"وہ صرف زخمی ہوئے ہیں۔" اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

"میرا نام ایشال ہے۔ حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے یہاں آئی ہوں۔ شاید اغوا برائے تاوان کا کوئی چکر تھا۔" اس کی بات پر اسامہ نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

☆......☆......☆

"اگر آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں تو؟" ایشال اپنے بازو کی ڈریسنگ کو دیکھ رہی تھی۔ حالات کے پیش نظر فرسٹ ایڈ باکس تو اسامہ کی گاڑی میں موجود رہتا ہی تھا اس نے کچھ دیر قبل ایشال کے بازو کا زخم صاف کر کے بینڈیج لگائی تھی اور اب وہ اسے اس کے گھر اتار کر جا رہا تھا جب ایشال کی بات نے اس کے قدم روکے تھے۔ "مجھ سے ملنا تمہارے حق میں اچھا نہیں۔" اس نے مختصرا کہا۔

"یہ تو وقت ثابت کرے گا کہ کس سے ملنا کس کے حق میں اچھا نہیں۔ بہر حال کہاں ملوں گے؟' وہ اسے گھور رہی تھی۔

"احمد ویلا...... لیکن تم پہلے میرے بارے میں مکمل انفارمیشن لے لینا۔ یقیناً تم اپنا ارادہ بدل دو گی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہہ کر گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی تھی۔ ایشال کتنی ہی دیر اس کی گاڑی کو گھورتی رہی تھی گاڑی ایک نقطے میں بدلی اور بالآخر سیاہ نقطہ بھی غائب ہو گیا۔ وہ بھی گھر کی جانب پلٹ گئی۔

☆......☆......☆

وہ ایک درمیانہ ساون تھا۔ نہ تو آسمان پہ بادل تھے نہ ہی دھوپ چمک رہی تھی۔ اجالا تھا مگر بہت شفاف نہیں۔ ایک سفید عمارت میں ایک بچہ اپنی ماں کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور بچے سے زیادہ تیزی سے مناظر بھاگ رہے تھے۔ اگلے منظر میں وہ اپنے باپ کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ پھر کچن میں ماں کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا پھر...... ایک طوفانی رات تھی...... بارش گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی مانند برس رہی تھی وہ ایک آدمی کے کندھے پر جھول رہا تھا۔ مچل مچل کر رو رہا تھا اور اس وحشت ناک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ اسے چھوڑ دے۔ پھر اچانک بادل زبردست انداز میں دہاڑے پورے آسمان پر پھیلے تمام بادلوں میں سوئی بجلی یکبارگی بجا ہوئی اور غضب ناک انداز میں زمین کی طرف لپکی تھی۔ اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی تھی۔

اس کا پورا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ پسینے کے قطرے شفاف فراخ پیشانی پر موتیوں کی صورت چمک رہے تھے۔ اور چہرے پر کسی معصوم بچے کا سا تاثر تھا۔ آنکھوں میں خوف کی لہر گویا ہر مسام میں دل دھڑک رہا تھا۔ یا ہر مسام دل بن گیا تھا۔ یہ خواب...... اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر سوچا۔ یہ خواب اسے اکثر نظر کیوں آتا تھا؟ اس کو نارمل ہونے میں چند منٹ لگے تھے۔ اور ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ چند لمحے اسے خواب پریشان کرتا تھا اور پھر وہ سر جھٹک کر اپنا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ لیکن کون تھا وہ بچہ؟ اور...... اور اسے کیوں دکھائی دیتا تھا؟ اس نے سر جھٹک کر ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر کے میوزک سے لطف اندوز ہونے لگا خواب ایک خواب کی طرح کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

سکندر بخت، بخت خاندان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ حسین بخت کا اکلوتا بیٹا۔ اس سے چھوٹی زینب بخت تھی حسین بخت اور شہرین بخت کچھ عرصہ قبل کہیں

جارہے تھے جب ایک ایکسیڈنٹ میں شہرین کی ڈیتھ ہوگئی اس دن کے بعد حسین بخت گم صم سے ہو کر رہ گئے تھے۔ سکندر بخت باپ کی حالت کے پیش نظر خود ہی سنبھل گیا تھا۔ اسنے نہ صرف بزنس سنبھالا تھا بلکہ حسین بخت اور زینب کو بھی اس نے حوصلہ دیا تھا جہاں وہ اپنوں کے لئے موم تھا وہیں دشمنوں کے لئے فولاد۔

مہروز بخت ان کے چچا تھے۔ اور فیروز بخت اور شہروز بخت چچازاد...... وقار احمد سے انکی خاندانی دشمنی تھی جو کہ سکندر کے ہوش سنبھالنے سے بھی قبل سے چلی آرہی تھی اسامہ وقار، وقار احمد کی واحد اولاد تھا۔ ان کی ایک ہی اولاد تھی مگر کئی پر بھاری......

اسامہ کے نام ہر ایک کو ساکت کر دیتا تھا وہ موت کی علامت تھا۔ موت...... جو ہر رکاوٹ توڑ کر جھپٹا مار کر دبوچ لیا کرتی ہے۔ اور اب...... سکندر بخت اس موم سے ٹکرانے کا عزم رکھتا تھا۔ مہروز بخت اس کا جگری یار تھا۔ اس کا قتل اس پر قرض تھا اور سکندر بخت کسی کا بھی قرض رکھنے کا قائل نہ تھا ان کی ایک ہی پھوپھو تھی۔ کلثوم بخت جو کہ لندن میں ہوتی تھیں ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا...... شہروز ان ہی کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ ان کی چھوٹی بیٹی زیست بخت شہروز کی منگیتر تھی اور سکندر کو اپنا بڑا بھائی کہتی تھی بڑی بیٹی عائشہ بخت سکندر بخت کو پسند کرتی تھی اچھی لڑکی تھی وہ مگر سکندر کے ارادے ابھی کچھ اور تھے۔ زیست نے شہروز کی موت کا بہت اثر لیا تھا وہ اب بھی بہت روتی تھی جب سب کچھ ختم ہو جائے تو ملبے پر بیٹھ کر ماتم تو کرنا ہی پڑتا ہے وہ بھی یہی کر رہی تھی اس کے آنسو سکندر کو تکلیف دیتے تھے جب کسی اپنے پیارے کی آنکھوں میں آنسو آتے ہیں تو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آئیں جوان آنسوؤں کی وجہ ہے سو اسامہ پر دو قرض تھے۔ قرض جو وہ رکھنے کے قائل نہ تھا۔

☆......☆......☆

ایشال دو دن بعد ہی اسامہ کے سامنے تھی۔ وہ لان میں بیٹھا شام کی چائے پی رہا تھا جب چوکیدار نے

ایشال کے آنے [illegible] کے از حد مصروف گزرے تھے وقار احمد کی نشان دہی پر اس نے کئی مزید شکار کئے تھے اور ایشال اس کے دل و دماغ سے محو ہو چکی تھی۔ اب اس کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ایک دھان پان سی، سنہرے بالوں والی اور معصوم چہرے والی لڑکی آ گئی۔ اس نے اسے وہیں بلوایا۔ اس نے اس وقت بلیو جینز پر ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی۔ سنہرے بال چہرے کے اطراف لہرا رہے تھے۔ شولڈر بیگ اس نے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا فضا میں موتیے کی مدھم مگر دلفریب مہک مہکتی تھی۔ ''میں نے کہا تھا کہ پہلے انفارمیشن......'' اس نے بے تاثر انداز میں کہنا چاہا جب وہ اس کی بات کاٹ گئی۔

''کروائی ہے۔ یونو، احسان آفریدی انویسٹی گیشن آفیسر ہیں۔ سوان کی بیٹی کے لئے کسی کے بارے میں انفارمیشن لینا مشکل نہیں۔''

''اوہ......!'' اسامہ نے ہونٹ سکیڑے۔

''پھر بھی تم آ گئیں؟'' اس نے اپنی سیاہ آنکھیں ایشال کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''ہاں...... کیونکہ تمہاری شہرت۔'' لڑکیوں کے بارے میں بری نہیں انفکیٹ، میں نے اسی لئے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔

''او کے رائٹ...... مگر ایک بات واضح کر دوں کہ اگر تم اپنے باپ کی مدد کرنے کے خیال سے یہاں آئی ہو تو تمہارا آنا بیکار ہے۔ اسامہ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔'' ملازم چائے سرو کر رہا تھا۔

''میں کسی کے لئے نہیں اپنے لئے آئی ہوں دوسری بات ہمارے ہاں لڑکیوں کو چارہ بنا کر کسی کے آگے نہیں ڈالا جاتا۔ پپا کی جاب ان کے ساتھ، میری لائف میرے ساتھ۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے چیئر سنبھالی تھی۔

''ہم م م......!'' اسامہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر اسے چائے لینے کا اشارہ کیا تھا۔ ''ویسے اگر تمہیں اس بات سے ڈر لگے کہ تمہیں مجھ سے کوئی

خطرہ ہے تو الگ بات ہے۔" وہ اب چائے کے کپ میں چینی مکس کررہی تھی۔

اسامہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔" اسامہ کبھی خطرات سے نہیں ڈرا۔ آئی ڈونٹ کیئر کہ تم اپنے باپ کے ساتھ ساتھ اس کی پوری ایجنسی کو بلالو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تمہیں موت سے ڈر کیوں نہیں لگتا؟" ایشال نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم بڑے آرام سے وہاں چلے جاتے ہو جہاں پولیس یا کوئی اور خطرہ ہو۔"

"موت بھی کوئی ڈرنے والی شے ہے؟ اور پولیس تو۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

"لیکن کچھ پولیس آفیسرز تو فرض شناس ہوتے ہیں اور پھر جن لوگوں کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے ان لوگوں سے تو خطرات ہیں۔" ایشال نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"دیکھو! موت کا ایک دن ایک وقت مقرر ہے۔ اور جگہ بھی متعین ہے جب موت کا وقت آتا ہے تو انسان خود بخود وہی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ایک شخص حضرت سلیمانؑ سے ملنے آیا اور حضرت سلیمانؑ کے پاس پہلے سے بیٹھا ایک شخص تھا جسے وہ گھورتا رہا۔ حضرت سلیمانؑ سے اس شخص نے دریافت کیا کہ" یہ کون تھا؟"

"آپؑ نے بتایا۔ عزرائیل۔"

اس نے عرض کی کہ" مجھے جلد از جلد ہندوستان پہنچادیں۔ وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

آپؑ نے اسے ہندوستان پہنچادیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد اس کی موت کی اطلاع آئی۔ آپؑ کی جب دوبارہ حضرت عزرائیلؑ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے دریافت کیا۔ تو حضرت عزرائیل نے جواب دیا کہ" مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ اس کی روح ہندوستان میں آج قبض کرنی ہے اور میں حیران تھا کہ یہ تو یہاں ہے اتنی جلدی ہندوستان کیسے پہنچے گا؟" اسامہ نے بات ختم کی پھولوں کی کیاری کو دیکھا۔ جہاں شہد کی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔" مگر یہ واقعہ سچا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت جس طرح برحق ہے اس طرح اس کا وقت اور جگہ بھی متعین ہے۔ نہ اس سے ایک پل آگے نہ پیچھے۔ تو پھر جب سب کچھ طے ہے تو ڈرنے کا فائدہ؟ ہمارے ڈرنے سے کون سا موت کی گھڑی ٹل جائے گی؟ ڈرنا تو موت کے بعد کی زندگی سے چاہئے۔"

ایک چھوٹی سی سیاہ بلی، جس کی آنکھیں سنہری چاند کی مانند دمک رہی تھیں اچانک جست لگا کر کیاری پھلانگ گئی۔ مکھیاں یکلخت منتشر ہوئی تھیں۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" ایشال نے چائے کا سپ لیا۔ چائے ٹھنڈی ہو کر بدمزہ ہوگئی تھی ہر چیز اپنے اصل ذائقے کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ وقت کی اہمیت مسلم ہے بعض اوقات ہم وقت کو اہمیت نہیں دیتے۔ ٹائمنگ کا خیال نہیں رکھتے، نتیجتاً کوئی خوشی کوئی کامیابی بھی ٹھنڈی چائے کی طرح بدمزہ ہوجاتی ہے۔ وقت شاہ ہے دوا بھی اگر وقت پر نہ ملے تو بیکار ہے اوکے! میں چلتی ہوں۔ تم کل سے مجھے پک کرلینا کہیں لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔ اور مجھے ایک کام ہے تم سے۔" وہ شولڈر بیگ ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھ سے کیا کام ہے؟" وہ اٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

"بس ہے۔ ایک لڑکا ہے افروز خان، شاید نام سنا ہو تم نے۔ اس کے پاس میری ایک دوست کی کچھ پکچرز ہیں وہ اسے بلیک میل کررہا ہے۔ فروا کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بہت پریشان ہے۔"

"افروز خان؟" اسامہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"سنا ہے بہت خطرناک ہے وہ۔" ایشال نے اسے بغور دیکھا تھا۔ موت سے کیا خطرناک ہوگا؟ اس نے سر جھکا تھا ایشال شانے اچکا کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اسامہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔

☆......☆......☆

رات گہری سیاہ تھی، آسمان پر بادل منجمد تھے۔فضاء میں خاموشی کا پہرہ بڑا گہرا تھا۔ آسمان نظر نہیں آتا تھا، ستارے تک سہم کر بادلوں کے عقب میں پنہاں تھے۔فضاء میں وحشت میں ملبوس، دہشت کسی دم کٹے اژدھے کی مانند چکراتی پھرتی تھی۔اسے کسی کروٹ، کسی پل چین آ کے نہ دیتا تھا۔اسامہ ولا کی گول سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔سیاہ شفاف چکنی سیڑھیوں پر ابھرتی چاپ اس بات کی گواہ تھی کہ ان پر چلنے والا بھاری بھر کم ہے لیکن بظاہر وہاں کوئی نہ تھا اس جگہ روشنی بکھری تھی اور آنکھیں پھاڑے سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسامہ وقار اوپری منزل پہ تھا۔ اس وقت وہ بیڈ روم میں ہی تھا اور ایک ڈائری کے مطالعے میں مگن تھا۔وہ سیاہ جلد والی ڈائری گورکی کے والد کی تھی جس میں مختلف نوعیت کے عملیات رقم تھے۔ ہر عمل کے نیچے مجرب مجرب درج تھا۔دفعتاً اس کی چھٹی حس چلا اٹھی اس کی تمام حسیات ساکت وصامت ہوگئیں اور نگاہ ایک ہی لفظ پر منجمد۔ایک ہلکی سی...... مبہم سی سرسراہٹ۔کوئی شے شاکر کے اس کی طرف آئی تھی۔وہ ثانیے کے بھی ہزاروں حصے میں اپنی جگہ سے اچھل کر مقابل پر جھپٹا تھا۔

سامنے کوئی ٹھوس جسم نہ تھا بس ایک پرچھائی سی تھی اسی پل خود اسامہ بھی پرچھائی میں ڈھل گیا چند ہی لمحوں میں کمرہ تلپٹ ہوگیا ہر چیز اڑ رہی تھی وہ دونوں کمرے کی ہر چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

اچانک ''شرز'' کی آواز ابھری پھر ایک کربناک چیخ ایک شعلہ سا چمکا اور خاموشی چھا گئی ایک پرچھائی غائب ہوگئی اور دوسری اگلے ہی پل مجسم ہوگئی گورکی وہ غصے سے چلایا تھا اس کی دوسری پکار پر گورکی آ گیا شانوں پر حسب معمول بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک ہرن تھا یہ اور تم کہاں مر گئے تھے؟اس نے گورکی کو گھور کر دیکھا۔

''سر! یہ اسی عمل کا ایک عامل تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی اس عمل میں کامیاب ہو۔'' ایسا کیا ہے اس عمل میں؟ اس کی سیاہ آنکھوں میں سوال ابھرا۔اس نے وہ عمل وقار احمد کے کہنے پر شروع کیا تھا۔

''غیر معمولی بے حد غیر معمولی طاقت اور کشش اس کا عامل ایک انگلی کے اشارے سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرسکتا ہے پتھر پگھلا سکتا ہے پانیوں پر چل سکتا ہے جیسے ٹھوس زمین پر، فضاؤں میں پرواز کرسکتا ہے یہ عمل بے حد روحانی قوت رکھتا ہے اس سے انسان اپنی روح کو تسخیر کرلیتا ہے اور جب روح تسخیر ہوجاتی ہے تو پھر سب کچھ ممکن ہے جسم کسی بھی طور رکاوٹ نہیں بنتا۔ دیواروں کے آر پار جانا بھی ایک معمولی بات ہے اور اس کی غیر معمولی بات اس کی سریع الاثری بھی ہے اب دیکھیں آپ کو یہ عمل شروع کیے چند ہی دن ہوئے ہیں مگر آپ میں جسم کو تحلیل کرنے کی صلاحیت آ گئی ہے۔'' گورکی نے تفصیلاً بتایا۔

'ہم م م...... اکیس دن اور سہی...... لیکن تم اس واقعہ کا ذکر بابا سے نہ کرنا پریشان ہوجائیں گے۔'' وہ کہہ کر ٹیرس کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ گورکی ایک ملازم کو بلا کر کمرہ ٹھیک کرنے لگا۔

☆......☆......☆

سورج کے آگے دھند کا پردہ تنا تھا، ہلکی، مگر گہری دھند...... ہوا ساکت تھی مگر خنکی برقرار تھی۔ وہ ایشال کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔''میں نے تمہیں کل بلایا تھا۔'' ایشال نے شکایت کی۔

''کل میں بیزی تھا۔''

''کہاں؟''

''کچھ لوگوں کو کلمہ پڑھانا ضروری تھا۔'' اسامہ کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔

''کن کو؟'' گاڑی نے موڑ کاٹا۔ رفتار سست تھی۔

''بابا پر انہوں نے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''بہت پیار کرتے ہو اپنے بابا سے؟''

''ہر کوئی کرتا ہے۔''

''ویل! ہم کب تک پہنچیں گے؟'' دھند اب دھندلانے لگی تھی۔ بس پانچ منٹ۔ اس کے بعد ان

کے مابین خاموشی، پھر گاڑی رکی اور ایشال اور اسامہ ایک ساتھ باہر نکلے تھے افروز خان اندر ہے۔ اسامہ نے سر ہلایا اس کی بات پر پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ پکچرز اور سی ڈیز یہاں رکھتا ہے۔

ہاں کئی بار مخبری کی گئی مگر پولیس کبھی کچھ برآمد نہ کروا سکی۔" ایشال کی نظریں دودھیا عمارت پر تھیں۔

"ڈونٹ وری۔ پولیس اور اسامہ وقار کے برآمد کروانے میں فرق ہے۔" وہ اندر بڑھ گیا میرے دشمن ذرا ڈھیٹ تھے لہٰذا انہیں کلمہ پڑھوانا پڑا۔ وگرنہ وہ صرف زخمی کرنے پر اکتفا کرتا تھا راستے میں گارڈ ہے بگا ہے چار لوگوں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور آسمان کی جانب پرواز کر گئے۔

افروز خان اپنے ساؤنڈ پروف بیڈروم میں تھا اور ذرا مصروف تھا۔ اسامہ کی نپی تلی دستک نے اسے ذرا الجھن زدہ کیا۔ آ جاؤ۔ اس نے ریموٹ سے ڈور لاک کھولا تھا۔

خلاف توقع ایک اجنبی کو دیکھ کر افروز خان کے ہاتھ میں وسکی کا گلاس ٹھٹکا۔ تھا۔ "کون ہو تم؟" اس کا سوال کا فطری تھا۔

"تمہاری موت...... کلمہ پڑھ لو۔" اس کے سرد لہجے نے افروز خان کو ششدر کر ڈالا تھا۔ اگلے چند ہی لمحے میں وہ مرحوم ہونے والا تھا۔

اسامہ جب باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں فروا کی پکچرز تھیں یہ کمرہ خاص چند منٹ میں اڑ جائے گا اسامہ وقار کے آگے جو آ جاتا ہے وہ اڑ جاتا ہے بہت کہا کہ اب کلمہ پڑھ لو۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ افروز خان کے واویلے کی پروا کئے بنا باہر نکل گیا۔ ایشال اس کی مستحکم چال سے کامیابی کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اگر میں چاہتا تو انہیں بھی دیگر لڑکیوں کی پکچرز اور سی ڈیز کے ساتھ ہی تباہ کر دیتا۔ مگر تمہاری تسلی کے لئے۔ اس نے لفافہ ڈلیش بورڈ پر رکھا اور اسے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ ان کے جانے کے چند ہی سیکنڈز بعد یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے۔ ایشال نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ غبار...... اڑتے ریزے اس نے سوالیہ

نظروں سے اسامہ کو دیکھا وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔ ایشال کے وجود میں لہر دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

سکندر بخت کب سے انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر اسامہ نمودار ہوا۔ سکندر بخت اسے گھورتا رہا...... "کس لئے بلایا ہے؟" اسامہ کا لہجہ سرد تھا۔

"تمہیں پتہ ہے میں سکندر بخت ہوں تمہارا دشمن۔"

"پتہ ہے۔"

"تم پھر بھی میری پکار پہ دوڑے چلے آئے...... کیا دشمنوں کے پاس بھی خود سے جایا جاتا ہے؟" سکندر بخت کے لہجے میں چبھن تھی۔

"میں کوئی نہیں بلکہ اسامہ وقار ہوں۔" اس نے باور کرایا۔ "ایسی ہمت اسامہ ہی کر سکتا ہے۔" سکندر کا انداز ستائشی تھا۔ "مجھے یہاں میری ہمت کی تعریف سنانے بلایا ہے؟"

"نہیں۔"

تو پھر؟ کس لئے بلایا ہے؟" وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کھڑا تھا۔

"اس لئے۔" سکندر بخت کے پسٹل نے شعلے اگلے۔ اسامہ بے ساختہ اچھلا تھا۔ اس کے دائیں پاؤں کی ٹھوکر سکندر کے ہاتھ پر لگی اور پسٹل اڑ کر دور جا گرا۔ بچتے بچتے بھی ایک انگارہ اسامہ کے بائیں بازو کو "چوم" گیا تھا۔

"جاؤ سکندر بخت! تم بخت خاندان کی آخری چشم و چراغ ہو۔ تم مر گئے تو بخت خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

"جاؤ...... اسامہ یہ قرض۔" اس نے دائیں بازو سے ابلتے خون کو دیکھا تھا۔

"یہ قرض معاف کرتا ہے۔" وہ کہہ کر رکا نہیں۔ سکندر بخت کی نظروں میں عجیب تاثر تھا۔ اور وہ اوجھل ہوتے اسامہ وقار پر جمی تھیں۔

☆......☆......☆

"شرم کرو کچھ اتنے دن کہاں تھیں؟" اسامہ کی بے قراری اس کے لہجے سے مترشح تھی۔

"زیادہ تو نہیں۔ بس پانچ دن ہی تو ہوئے ہیں۔" ایشال کا لہجہ مدھم تھا۔

"بس؟ پانچ دن۔" بس ہوتے ہیں؟" اس نے گلہ آمیز انداز میں کہا۔

"تو اور کیا؟"

"کہاں تھیں؟" وہ اسے دیکھ رہا تھا اور اپنی پیاسی نظروں کی پیاس بجھا رہا تھا ماموں کے گھر تھی۔ آئندہ ایسا مت کرنا ایشال! تمہارے بغیر میری حالت ایسی ہی تھی جیسے پانی کے بغیر مچھلی کی ہوتی ہے۔ اس کی بات نے ایشال کو چونکا دیا تھا۔ اس کا چونکنا اسامہ کو بھی نظر آ گیا تھا۔ جب ہی وہ سر جھکا کر گویا اعتراف جرم کر بیٹھا۔ "مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے ایشال! میں نے بہت سمجھایا دل کو، کہ میں ایک برا آدمی ہوں، کسی بھی لڑکی کی مجھ سے شادی، اس لڑکی کی زندگی برباد کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن یہ محبت...... ایشال! یہ محبت سیلاب کے منہ زور ریلے کی مانند تمام تر آرزوؤں کو خاک میں ملا گئی۔ محبت ہوگئی تم سے۔ اس کے باوجود کہ میں بہت برا ہوں۔"

"تم اچھے بھی بن سکتے ہو۔" ایشال نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی۔

"اب؟" اسامہ کی سیاہ آنکھوں سے حیرت جھلکی۔

"اب کیا ہے؟ اسامہ! تم میرے لئے کیا کرسکتے ہو؟" وہ اسے جانچتی پرکھتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"سب کچھ۔" اسامہ کے لہجے کے آگے سچائی کی تمام تر سرحدیں ہیچ تھیں۔ "تو پھر یہ سب چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دیا۔" اسامہ کے چہرے کے عضلات ایک دم ڈھیلے پڑے تھے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس نے باور کروایا۔ "مگر اسامہ ہمیشہ مشکلات کا عادی رہا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ ایشال کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔

خدا کی قدرت

جب حضرت سلیمانؑ کو مشرق و مغرب اور تمام جہاں کی سلطنت ملی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی۔ "یاالٰہی مجھے آرزو ہے کہ ایک دن سارے عالم کی مخلوق جو خشکی و تری میں ہو بشمول انسان، جنات، چرند، پرند، حیوانات یہاں تک کہ چیونٹی، مکھی اور کیڑے مکوڑوں اور الغرض تمام ذی روح کی ضیافت کروں۔"

غیب سے آواز آئی۔ "اے سلیمان میں سب کی روزی پہنچاتا ہوں میری مخلوقات بے انتہا ہیں تم سب کو نہیں کھلا پاؤ گے۔" حضرت سلیمان نے عرض کیا۔ "اے اللہ تو نے مجھ کو بہت نعمت دی ہے تیری عنایت سے سب کچھ ہے اگر تیرا حکم ہو تو سب کے لئے دعوت کا انتظام کروں۔" حکم ہوا۔ "دریا کے کنارے ایک مکان نہایت عالی شان اور کشادہ بنواؤ تاکہ جس مخلوق کو دعوت دو وہ اس میں با آسانی آسکے۔" اس مکان کی تیاری میں تقریباً ایک سال اور آٹھ مہینے صرف ہوئے۔ دو ہزار سات دیگیں پکوائی گئیں اور صرف ایک دیگ لمبے چوڑے تالاب کی مانند تھی اور اس دور میں کھانے کے لئے بائیس ہزار گائیں ذبح ہوئی تھیں۔ پھر حضرت سلیمانؑ نے ضیافت کا اعلان کردیا چونکہ دریا کے کنارے یہ تمام انتظام ہوا تھا اس لئے ایک مچھلی کنارے پر آئی اور اس نے کھانا مانگا اور تمام کھانا کھا گئی۔ اس کے بعد یوں گویا ہوئی۔ "اے حضرت ہر روز مجھے تین لقمے کھانا چاہئیں۔ ابھی تو میرا ایک ہی لقمہ ہوا ہے کہ سارا کھانا ختم ہوگیا۔ میں تو آج آپ کی مہمان بن کر بھوکی رہی۔ اگر آپ اسی طرح لوگوں کو کھانا نہ دے سکے تو آپ نے ناحق سب کو بلایا ہے۔" یہ سن کر حضرت سلیمان سجدے میں گر کر رونے لگے اور کہا۔ "بس روزی دینے والا اور نعمتوں سے نوازنے والا سارے جہاں کو تو ہی ہے۔"

(ایس امتیاز احمد)

"تم اپنی روح کو تسخیر کرنے والا جو عمل کر رہے تھے؟ وہ...... چھوڑ دو۔"

"او کے...... ایسے تو کوئی بھی عمل ادھورا چھوڑنے سے نقصان لازم ہے۔ مگر یہ عمل روحانی ہے تو...... خیر دعائے رجعت سے کام چل جائے گا۔

"اور کچھ بھی چھوڑ سکتے ہو میرے لئے؟" وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے اسامہ کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"کیا چھوڑوں؟"

"بتاؤں گی ۔ پر ابھی نہیں۔" وہ نظریں چرا گئی۔ "او کے...... جب تم چاہو۔"

"وعدہ؟" سنہری آنکھوں نے سوال کیا۔

"وعدہ۔" سیاہ آنکھوں نے یقین دلایا۔

"تم وعدہ کر چکے ہو اسامہ اور وعدہ قرض ہوتا ہے جو بہر حال چکانا ہی پڑتا ہے قرض ضبط کرنا مردوں کا شیوہ نہیں۔" وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اسامہ ہر قرض چکانے کا عادی ہے۔ وہ بھی سود سمیت۔ چاہے وہ قرض محبت کا ہو، نفرت کا ہو یا پھر وعدے کا۔" اس کا انداز آہنی تھا۔ ایشال مطمئن ہوگئی۔

☆......☆......☆

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟" وقار احمد کو اسامہ نے اچھلنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

"محبت ہوش میں رہنے کب دیتی ہے۔؟" اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "لیکن تم اچانک یہ سب کیسے چھوڑ سکتے ہو؟ وہ بھی ایک لڑکی کے لئے!" ان کے لہجے میں تحیر اور پھر حقارت اتر آئی۔ "وہ صرف لڑکی نہیں، میری زندگی ہے۔" وہ گویا تڑپ اٹھا تھا۔ "اسامہ! تم جانتے ہو کہ یہ سب چھوڑنا ممکن نہیں بیٹا!" اب کے وہ رسانیت سے بولے۔

"بابا! کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ یہ آپ ہی نے سکھایا ہے......" "بابا! اسامہ صوفے پر بیٹھے وقار احمد کے قدموں میں جا بیٹھا۔ "محبت قرض ہوتی ہے بابا اور مرد قرض معاف نہیں کرواتے چاہے وہ قرض محبت کا ہو نفرت کا یا دشمنی کا...... یہ آپ خود ہی کہتے ہیں نا کہ کسی کا بھی قرض نہ رکھو۔" وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بول رہا تھا۔

وقار احمد کی سماعتوں سے ایک کھنکتی آواز ٹکرائی تھی۔ "محبت قرض ہوتی ہے وقار احمد اور قرض چکانا ہی پڑتا ہے۔" اسامہ کے نقوش ایک نسوانی چہرے میں ڈھل گئے تھے۔ "بابا!" اسامہ نے ان کے گھٹنے ہلائے تو وہ بری طرح چونکے۔ "او کے! اگر وہ مقصد ادھورا نہ چھوڑ و جس کے لئے تمہاری ایسی تربیت کی گئی ہے۔ پہلے اپنی ماں...... اور اپنی دادی کی موت کا قرض چکا لو۔ پھر محبت کا قرض چکاتے رہنا۔" یکا یک ایک آگ ان کے لہجے میں نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی جل اٹھی تھی۔

"ماما کا قتل ہوا تھا؟" ان کی بات نے اسامہ کو چونکا دیا تھا۔ اور بری طرح چونکایا تھا۔ "ہاں خون ہوا تھا اس کا۔" وقار احمد کے چہرے پر کرب کے تاثرات تھے۔

"کس نے ماما کا خون کیا؟" اس کی مٹھیاں سختی سے بھینچ گئیں اور چہرے کے عضلات تن گئے۔

"اسے زندگی سے محروم کرنے والا بخت خاندان ہے۔" یہ سن کر اسامہ کی آنکھیں خون رنگ ہوگئیں۔

"میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ گویا دانتوں تلے بخت خاندان کو پیس رہا ہو۔

"نہیں...... ایسے نہیں۔ ایسے نہیں بیٹا!"

"تو پھر کیسے؟"

"حسین بخت کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے سکندر بخت کو مارو...... تڑپا تڑپا کے مارو۔ تاکہ اسے علم ہو کہ جب کوئی اپنا پیارا، آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ہے اور انسان چاہ کر بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر پاتا تو کیا اذیت گزرتی ہے۔ سانسوں پہ...... کتنی تکلیف ہوتی ہے کتنا درد ہوتا ہے۔" ان کی آنکھوں میں یادوں کے کربناک دہکتے انگاروں کی تپش تھی۔

"سکندر بخت۔" اسامہ نے زیر لب نام دہرایا۔ اس کی سیاہ سحر انگیز آنکھوں میں ایک سوچ، ایک عزم کی سیاہ چمک تھی وہ چمک جو اس کے ارادوں کی پختگی کو ظاہر کرتی تھی۔

☆......☆......☆

"سکندر!" حسین بخت کی کھوئی کھوئی آواز پر سیڑھیاں اترتے سکندر کے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ "جی!" وہ فوراً پلٹا تھا...... آج میں ایک حقیقت سے پردہ اٹھانے جارہا ہوں...... ان کے گھمبیر لہجے نے اسے ٹھٹھکایا تھا۔ کیسی حقیقت بابا، وہ ان کے پاس ہی صوفے پر ٹک گیا۔ وقار احمد کی دشمنی کی حقیقت سے۔

"جی بولیں۔" "تمہاری ماں شہرین بخت...... وقار احمد کی منکوحہ تھی۔ انہوں نے گویا اس کے سر پہ بم ہی پھوڑ ڈالا تھا وہ بے اختیارانہ اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں گویا حیرت سے پھیل چلی تھیں۔

"وہاٹ؟" وہ تحیر سے چلایا۔

☆......☆......☆

ممکن ہے اسے میری ضرورت نہ رہی ہو
ورنہ راستے تو کئی آنے کے لئے تھے
چادر کی طرح تو نے ہمیں اوڑھ لیا ہے
ہم لوگ تو فرشوں پہ بچھانے کے لئے تھے
اسٹیج پہ فنکار لہو تھوک رہا تھا
اور لوگ فقط تالی بجانے کے لئے تھے
معلوم نہیں، لوگوں کی آنکھیں تھیں کہ صحرا
دو اشک بہت آگ بجھانے کے لئے تھے
افسوس! انہیں لینے ہوا آئی نہ راحت
بچے میرے تیار تو جانے کے لئے تھے

بابا اور گوری کی دونوں ہی بہت ناراض ہورہے تھے کہ عمل ادھورا نہ چھوڑ۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایشال بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی کی چھت پر دایاں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ "تو نہ چھوڑتے۔"

"کیسے نہ چھوڑتا تم نے جو کہا تھا پھر چھوڑنا تو تھا ہی۔ اس کی سیاہ آنکھیں ایشال کے سنہری بالوں میں الجھی تھیں۔

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" تین دن طبیعت بہت خراب رہی مگر دعائے رجعت اور کچھ گوری نے پڑھ کر پھونکا تو اب سب ٹھیک ہے۔ وہ مسکرایا ایشال اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے۔" اس کی بات پر اسامہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

پرسکون، سرشار، مسکراہٹ۔

"تمہیں پتہ ہے اسامہ! بہترین انتقام کیا ہوتا ہے؟" اس کا لہجہ عجب سا تھا۔

"کیا؟" اسامہ نے اس کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ بس یونہی بے دھیانی میں پوچھ لیا تھا ورنہ اس کے دھیان کی سبب ایشال کے پرکشش چہرے پر مرکوز تھیں۔ بہترین انتقام کسی کو مار دینا، کسی کی جان لے لینا، کسی کو زندگی سے محروم کردینا ہرگز نہیں ہے اسامہ۔" اس کے انداز میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ ایک ایسا تاثر جس نے اسامہ وقار جیسے بے حس بندے کو بھی بری طرح ٹھٹھکایا تھا۔

"بلکہ...... بہترین انتقام، کسی کی مسکراہٹ چھین لینا ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے کسی کو ماردینا تو سزا نہیں کسی کی مسکراہٹ چھین لینا کسی کو اتنا دکھ دینا کہ کبھی پھر زندگی بھر مسکرانہ سکے اور اگر دنیا دکھاوے کو مسکرائے بھی تو وہ مسکراہٹ بس دکھاوا ہی ہو۔ لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں دکھ کی نمی۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر مسکرائی تھی۔

اسامہ چاپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔" وہ پھر مسکرایا تھا۔

"اسامہ! کتنا چاہتے ہو مجھے؟"

"اتنا...... اتنا...... اتنا کہ مجھے لگتا ہے کہ اتنا کبھی کسی نے کسی کو نہیں چاہا ہوگا۔" اس کا لہجہ جذبات سے بوجھل تھا۔ اور سیاہ آنکھوں میں قوس قزح کے سارے رنگ ایک ساتھ جھلملائے تھے۔

"تم جانتے ہو، میں کون ہوں؟" اس نے عجب، بے حد عجیب سے انداز میں دریافت کیا تھا۔

"میری زندگی۔" اسامہ کے لہجے پر ختم تھی۔

"اور تم نے میری زندگی چھین لی۔" وہ زیرلب بڑبڑائی۔ "میں ایشال احسان نہیں بلکہ زیست بخت

ہوں۔" زندگی نے بڑے آرام سے اس پر موت کا بم پھوڑا تھا۔ "زیست بخت...... کلثوم بخت اور سلمان بخت کی بیٹی۔" اس نے دوسرا دھماکہ کیا تھا۔ اس بار زد میں اسامہ کا ذہن آیا تھا۔

"حسین بخت اور مہروز بخت کی بھتیجی۔" تیسرا دھماکہ اس کے دل کو ریزہ ریزہ کر گیا۔ شہروز بخت کی محبت اور منگیتر۔ اس دھماکے نے اس کی روح بھی گویا راکھ کر ڈالی تھی۔ "وہ شہروز بخت جسے تم نے ایک انگلی کے اشارے سے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اور...... میں نے اس کی قبر پر یہ قسم کھائی تھی کہ اس کے قاتل سے انتقام لوں گی اور خدا گواہ ہے اسامہ میں نے تم سے ایک بہترین انتقام لیا ہے۔"

اس بار دھماکے کی زد میں کیا کیا آیا تھا؟ وہ فیصلہ نہ کر پایا اسے بس اتنا علم تھا کہ باقی کچھ بھی نہ بچا تھا۔ بس دور دور تک تڑختے کانچ کی کھنک تھی۔ اڑتے ریزے تھے۔ اس کا پسندیدہ منظر...... بارود کی خوشبو...... اس کی پسندیدہ خوشبو...... وہ ہمیشہ اس سب کو مسکرا کر انجوائے کیا کرتا تھا۔ لبوں پہ ایک سرشاری مسکراہٹ لئے لیکن اس بار وہ مسکرا، نہ پایا تھا اس کی آنکھوں میں جلتے بارود کی ساری جلن، ساری کڑواہٹ اور ساری آگ یکدم سمٹ آئی تھی اور صرف آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ دل اور روح کو بھی جلانے لگی تھی وہ خود اپنے وجود سے اڑتے ریزے بخوبی پہچان سکتا تھا اور اس تکلیف کو بھی بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

"سو، اسامہ وقار! میں نے تمہارا وہ قرض جو کہ مجھ پر قرض تھا بخوبی چکا دیا ہے تم نے شہروز بخت کی زندگی کو موت کی نیند سلایا اور میں نے تمہاری مسکراہٹ کو موت کی نیند سلا دیا۔ تمہارے سکون کو موت کی نیند سلا دیا۔ تم ساری زندگی سکون پانے کو ترسو گے اور موت کی چاہ میں پل پل مرو گے اسامہ وقار پل پل مرو گے۔" وہ سفاکی سے مسکرائی۔

اسامہ کی مسکراہٹ واقعی مرگئی تھی۔ اس کا سکون موت کی نیند سو گیا تھا ابدی نیند، ایشال نہیں بلکہ زیست بخت بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ کر رہی تھی اس کا وہ چہرہ جو ایک دم تاریک پڑ گیا تھا جہاں زندگی کی کوئی رمق کوئی علامت نہ بچی تھی۔ اس کا چہرہ تباہی تھا۔ اس کا وجود بربادی تھا۔

"ایشال، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا بالکل بھی نہیں رہ سکتا۔" اس کے لہجے میں بے قراری بری طرح تڑپ رہی تھی۔

"ایشال نہیں...... زیست بخت!"

"پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔" وہ زندگی کے قدموں میں بیٹھا گڑگڑا رہا تھا۔ مگر بھلا زندگی کب رحم کرتی ہے موت ہی ہے جو رحم کرے تو کرے۔

"میرے دل میں میری زندگی میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں اسامہ وقار! تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک بار وعدہ لیا تھا کہ تم میرے لئے کیا کچھ چھوڑو گے۔"

اسامہ جواباً کچھ نہ بول سکا۔

"وہ وعدہ تم پر قرض ہے۔ اسامہ وقار بولو کیا کہتے ہو؟" وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اسے جانچ رہی تھی۔

"کیا چھوڑوں؟" اسے خود اپنی آواز بہت دور...... کہیں صدیوں کے فاصلے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو۔" زندگی اس سے دامن چھڑا رہی تھی اسامہ کی آنکھوں میں آس مرگئی وہ کرب سے پلکیں میچ گیا۔ چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو پلکوں کی باڑھ نم تھی اوکے...... اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ تھا بھی نہیں...... "زندگی قرض ہوتی ہے اور یہ قرض ہم کو ہر صورت سے چکانا ہی پڑتا ہے یہ ایک ایسا قرض ہے جسے کسی طور ضبط نہیں کیا جا سکتا۔ تم واقعی قرض چکانا جانتے ہو۔" زیست اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسامہ کے لبوں پر ایک زخمی، لہولہو مسکراہٹ آن ٹھہری۔ زندگی اس سے دامن چھڑا گئی تھی اور جب زندگی پاس نہ رہے تو باقی کی زندگی پھر موت سے بھی بدتر ہوتی ہے ایسے میں بے ساختہ دل چاہتا ہے

کہ سانسوں کا گلا حلق سے نیچے ہی گھونٹ دیا جائے اس کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف بڑھا مگر نہیں۔

ابھی اسے ایک اور قرض چکانا تھا۔ قرض اسامہ وقار کے لئے قرض۔ تھا اور اسامہ وقار قرض نبھانا بخوبی جانتا تھا وہ سانسوں کی ڈور توڑ سکتا تھا مگر قرض نہیں...... قرض وہ نہ معاف کرتا تھا نہ ہی کرواتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں قرض قرض ہوتا ہے اور قرض کی معافی نہیں۔

☆......☆......☆

پرندوں نے گواہی میں بیان تبدیل کرڈالے
شجر گرنے سے پہلے آشیا ن تبدیل کرڈالے
مجھے محسوس ہوتا ہے نجانے کون سے لمحے
زمین پیروں کی سرکا آسمان تبدیل کرڈالے
جہاں رت نے کہا ہمراہ چلنے کو وہیں ہم نے
ارادے اور منزل کے نشان تبدیل کرڈالے

آج پہلی بار اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ بھلا کب آیا کرتی ہے؟ جب قدموں سے شکست لپٹی ہوا تب شکست کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ قوی سے قوی انسان کے قدم بھی اس شکست کا بوجھ سہارنے سے انکار کردیتے ہیں اسامہ ابھی لڑکھڑا رہا تھا اس کے قدموں سے گویا دنیا بھر کے پہاڑ بندھے تھے اس کے سر پہ گویا چودہ طباق کا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ محبت کی شکست ہمیشہ ناقابل برداشت ہوتی ہے اس کے لئے بھی تھی لیکن اسے ابھی چلنا تھا۔ ابھی ایک قرض چکانا تھا قرض جو قرض ہوتا ہے۔ قرض جس میں معافی کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔

قرض بس قرض ہوتا ہے اسے لڑکھڑاتا دیکھ کر وقار احمد کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ گیا تھا۔ اسامہ مجسم شکست تھا انہوں نے تو اسے ہمیشہ جیتنا ہی سکھایا تھا ہمیشہ یہی کہا تھا کہ ہار اسامہ وقار کے لئے بنی ہی نہیں۔ اور وہ ہمیشہ جیتتا آیا تھا وہ اسے ہمیشہ فاتح دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ اسامہ وقار کی فتح خود وقار احمد کی فتح تھی مگر آج...... آج وہ شکست خوردہ کیوں تھا؟

”لک...... کیا ہوا اسامہ؟“ اس کے قدموں کی طرح ان کی آواز بھی لڑکھڑائی تھی۔

”بابا؟“ وہ کارپٹ پہ گر کر لٹے پٹے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ اضطراری انداز میں باربار ہونٹ کچل رہا تھا۔ محبت نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے اس کا دل نوچ ڈالا تھا۔ اس نے کرب سے پلکیں میچ لیں۔ دو نمکین، پرتپش موتی پلکوں کی باڑھ سے پھسل گئے۔

”مرد روتے نہیں بیٹا!“ انہوں نے کہا۔

اور انہوں نے ہمیشہ ہی کہا تھا اس سے قبل اسامہ بھی یہی سمجھتا تھا مگر آج۔

”مرد کیا انسان نہیں ہوتے بابا؟“ اس کا بھیگا بھیگا سا شکوہ ان کا دل بھینچ گیا۔

”ہوتے ہیں...... مگر رونے کا مطلب ہوتا ہے ہار مان لینا...... اور مرد کبھی ہار نہیں مانتے کیونکہ وہ بہادر ہوتے ہیں وہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ناقابل تسخیر، ناقابل شکست۔“ ان کی نظر میں ایک مرد کا یہی کردار تھا اور وہ اسامہ کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے اسے ہمیشہ ایسا ہی دیکھا تھا مگر آج۔

”مگر آج اسامہ وقار ہار گیا بابا آپ کا اسامہ وقار محبت سے ہار گیا۔ محبت کی شکست کی چوٹ کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے بابا جو تا قیامت تازہ رہتا ہے کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ وقت کی گرد اسے بھر تو کیا چھو بھی نہیں پاتی۔“ اسامہ بکھرا بکھرا سا خود کلامی کررہا تھا۔ اس کی باتیں سیدھی وقار احمد کے دل پہ لگ رہی تھیں۔

ہاں وہ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی تو غلط نہیں کہہ رہا تھا ان کے دل میں بھی محبت کا وہ گھاؤ آج بھی تازہ تھا۔ اس سے آج بھی خون رستا تھا اور انہیں بخوبی علم تھا کہ یہ ان کی آخری سانس تک تازہ رہے گا۔ بلکہ شاید اس کے بعد بھی۔

محبت بری بلا ہے...... اور کوئی شکست مرد کو رلائے نہ رلائے مگر...... محبت کی شکست ضرور رلاتی ہے۔ یہ ادراک انہیں پہلے سے تھا۔ لیکن انہیں اسامہ کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا۔ یہ

کیفیت، یہ نارسائی کی عزت ان کے لئے ناآشنا نہ تھی وہ خود اس ذائقے اس کرب کے اذیت ناک لمس کو چکھ چکے تھے اور اب تک چکھتے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ......اس ایک ذائقے کے علاوہ ان کے لئے ہر ذائقہ ہر لمس بے حس تھا۔ یا شاید وہ خود بے حس تھے انہوں نے ٹوٹے بکھرے اسامہ کو اپنی آغوش میں بے اختیار بھر لینا چاہا مگر۔

"مجھے فی الحال تنہا چھوڑ دیں بابا پلیز۔"

بھیگی بھیگی التجا انہیں ساکت کر گئی۔ وہ اس کی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ سوئم آنکھیں لئے وہاں سے ہٹ گئے اور اسامہ وقار وہ ناقابل شکست ناقابل تسخیر انسان عالم تنہائی میں مجسم بے بس بنا رو رہا تھا اور بے بسی تو رلاتی ہی ہے۔

روتا رہا میں آپ ہی اپنے نصیب پر
اپنے گلے میں ڈال کے بازو تمام رات

ہوا سرد تھی...... فضا میں اشکوں کی نمی تھی...... بادلوں کے اشک...... خشک پتے، بسکٹس، چاکلیٹس اور کنڈیز کے خالی ریپرز اور خالی شاپرز ادھر ادھر چکراتے پھرتے تھے۔ سکندر بخت سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کی نگاہ ہاتھ میں پکڑے موبائل کی شفاف اسکرین پر مرکوز تھی عین آخری سیڑھی پر اس کی نگاہ نے زاویہ بدلا اور...... اور...... موت کی علامت...... اسامہ کو اپنے سامنے پایا۔ وہ سیکورٹی کے باوجود؟ سکندر بخت کے ذہن میں ابھرنے سے بھی قبل یہ سوال دم توڑ گیا بھلا اسامہ کو کوئی سیکورٹی سسٹم یا فورس روک پاتی؟ حسین بخت!! اسامہ کی دہاڑ پر جہاں سکندر بخت ناگواری اور طیش سے اس پر جھپٹا تھا وہیں ایک بیڈ روم سے حسین بخت نمودار ہوئے تھے۔ "حسین بخت، میں قرض چکانے آیا ہوں۔" سکندر بخت کا ہاتھ جھٹک کر وہ حسین بخت سے مخاطب ہوا تھا۔

"تم نے میری ماں کو مارا...... تم قاتل ہو اور...... میں آج وہ قرض چکاؤں گا۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ کان کا بدلہ کان اور خون کا بدلہ خون۔" اس کے سرد لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ ان کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔

سکندر بخت کا ہاتھ اٹھا جسے اسامہ نے فضا ہی میں کلائی سے جکڑ لیا۔ سکندر کا پاؤں اسامہ کے گھٹنے پر لگا تھا اور جواباً اس کا بھرپور گھونسہ سکندر کے چہرے کی طرف آیا سکندر تیزی سے جھکا تھا گھونسے کی ضرب ہلکی سی اس کے کندھے پر لگی تھی حسین بخت ایک دم ان کے بیچ جا کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

بیچ میں سے ہٹ جائیں اسامہ نے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔ "تمہیں بہت کچھ غلط بتایا گیا ہے میں تمہاری ماں کو کیسے مار سکتا ہوں، میں نے تو کبھی تمہاری ماں کو دیکھا تک نہیں۔"

"بکواس...... اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔" میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔" سکندر بے قابو ہو کر اس پر جھپٹا جواباً اسامہ کیسے چپ رہتا۔ لیکن حسین بخت پھر درمیان آگئے۔

"سکندر تم اندر جاؤ۔"

"مگر پاپا۔"

"یہ میرا حکم ہے اندر جاؤ۔" وہ اسامہ کو گھورتا پیر پٹختا سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اسامہ کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیوں موم بن گیا ہے وہ وہاں قرض چکانے آیا تھا نا کہ حسین بخت کی دروغ گوئی سننے...... مگر پھر بھی نجانے کیوں اس کا دل ان کے لئے پگھل گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں تیرتی نمی اسے اندر سے پگھلا رہی تھی۔ آج رات جی بھر کے اپنے بیٹے کو پیار کر لینا کل اسے دفنانے کی تیاری کر لینا۔

حسین بخت کے چہرے پر سایہ لہرا گیا تھا۔ اور اندر آتی زینب بخت بری طرح ٹھٹکی تھی وہ اس پر ایک بے معنی سی نگاہ ڈال کر پلٹ گیا۔ "پاپا۔" زینب ان کی زرد ہوتی رنگت پہ گھبرا کر ان کی طرف لپکی تھی۔ سکندر بخت بھی فوراً آیا تھا۔

☆......☆......☆

رات بے حد گہری اور مہیب تھی۔ ایک سفید خرگوش اسامہ وقار کے پاس سے گزر کر اندر وقار احمد کے کمرے کی جانب چلا گیا۔ اندر جا کر خرگوش کی ہیئت بدلی اور...... "کام ہو گیا گورکی؟" وقار احمد نے پوچھا تھا۔

"جی......" ہوگیا حسین بخت کا نچلا دھڑ بے جان ہوچکا ہے۔"

"او کے...... جاؤ...... کل اسامہ کے ساتھ رہنا کل پچیس دسمبر ہے......اور......"

دروازے کی چرچراہٹ پران کی بات ادھوری رہ گئی۔"بابا! میں ذرا باہر جارہا ہوں۔" ان کی تاکید کے پیش نظر وہ انہیں بتارہا تھا وہ رات اس نے سڑکوں پرآوارہ گردی کرتے گزاری۔ صبح سورج نکلنے کے بعد وہ گھر آیا تھا اور ڈائننگ روم سے آتی آواز پراس کے لبوں کو ایک تلخ مسکراہٹ نے چھوا تھا۔ وہ اس کے واحد دوست فرحان ہاشمی کی آواز تھی تاہم وہ اس وقت کسی سے بھی ملنا نہ چاہتا تھا اس کے اندر بے قراریاں سر پٹختی تھیں اندر کمرے میں بھی کہاں چین تھا؟ چین کی فصل تو ہمارے اندر اگا کرتی ہے یہ سرسبز فصل جب اندر ہی اندر خشک ہوجائے تو پھر...... باہر بھی فقط خشک پتے ہی اڑتے دکھائی دیتے ہیں وہ رات اس نے کمرے میں بند گزاری تھی۔ نیند تو شاید اس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی تھی۔ نجانے کون لوگ کہتے ہیں ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ جب سانس حلق میں نیزے کی زہریلی انی بن کر چبھتی ہو تو کون سی نیند؟ اور کہاں کی نیند؟ فرحان ہاشمی کی دستک کے جواب میں اس نے استدعا کی تھی کہ وہ اسے کم ازکم آج رات کے لئے تنہا چھوڑ دے۔ اور فرحان ہاشمی نے اس کی بات مان لی تھی۔

اگلی صبح......وہ پھر جا پہنچا تھا حسین بخت کا بخت اجاڑنے۔"کلمہ پڑھ لو سکندر بخت۔"

سیڑھیاں طے کرتا سکندر بخت وہیں ٹھٹکا تھا۔ اس کا ریوالور اس وقت اس کے پاس نہ تھا۔ گو کہ وہ بزدل نہ تھا۔ سکندر کا سا ہی دل رکھتا تھا مگر بہادری اور حماقت میں فرق ہوتا ہے اس وقت اسامہ وقار کا سامنا کرنا سراسر خودکشی ہوتی۔ وہ ریوالور لینے لپکا تو اسامہ پرسکون انداز میں اس کے متعاقب ہولیا۔

موت کا خوف اسے بھی بھی نہ رہا تھا اور......

اسی وقت لاؤنج میں رکھے پی ٹی سی ایل کی گھنٹی بج اٹھی سکندر ریوالور بدست نمودار ہورہا تھا اور...... دفعتاً ہی فضا گولیوں کی زبردست تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی جہاں سکندر کا دایاں پہلو لہو رنگین ہوا تھا وہیں اسامہ کے بائیں شانے کو بھی گولی نے ایک مہلک بوسہ دیا تھا۔ وہیل چیئر دھکیلتے حسین بخت فون سیٹ تک آئے تھے فون پر دوسری جانب نجانے کیسا صور پھونکا گیا تھا کہ ریسوران کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگرا۔ اسامہ کو ایک دم کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس یکلخت زور زور سے چلا اٹھی وہ برستی گولیوں کی پروا کیے بنا فون کی طرف آیا تھا مگر......عین اسی لمحے وہ اچھل کر دور ہٹ گیا فرش پر تڑاخ تڑاخ گولیاں برسی تھیں حسین بخت کے حواس کسی شدید ترین صدمے کے زیر تحت ساکت ہوچکے تھے پھر منجمد کی صورت ساکن۔

اسامہ نے آگے بڑھ کر ریسور اٹھالیا۔ اسے اس پل خود پر برستی گولیوں کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی وہ تو زیست بخت نے سکندر بخت کو روکا تھا۔ ورنہ اسامہ کی جگہ اس وقت اس کی لاش پڑی ہوتی۔

لیکن ...... لاش تو وہ اب بھی بن گیا تھا۔

اور اسے لاش میں تبدیل کرنے والی آواز وقار احمد کی تھی۔ اس کے باپ وقار احمد کی۔

"کیوں حیران ہوگئے حسین بخت؟ اسامہ وقار ہی تمہارا بلند بخت ہے۔ یاد کرو وہ ایک سیاہ رات...... آندھی، بارش اور طوفان...... اسی رات تمہارا بڑا بیٹا بلند بخت گم ہوا تھا ناں؟ اسے میں لے گیا تھا میں نے اپنے عزائم کے مطابق اس کی تربیت کی ہے اور جس دن کے لئے میں برسوں تڑپا ہوں وہ دن بلاآخر آن پہنچا۔ آج تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے دونوں بیٹے ایک دوسرے کو ماردیں گے آج وقت وہ قرض چکائے گا جو تم نے مجھ سے شہرین کو چھین کر میرے روح پر چڑھایا تھا۔"

ایک طویل گڑگڑاہٹ تھی۔ جیسے آسمان ایک ایک کر کے اس پر گر رہے تھے۔ جیسے زمین شدید ترین زلزلے میں ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔"بابا؟ اس کے لبوں

میں سرگوشی کپکپائی تھی اور دوسری طرف وقار احمد کو ایک دم کرنٹ لگا تھا اور...... اسامہ؟" اس کے بے جان ہاتھ سے ریسور چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

"بلند بخت!" حسین بخت نے نہایت پیار سے اسے پچکارا تھا۔ "گولی مت چلانا سکندر! یہ تمہارا بڑا بھائی بلند بخت ہے۔" انہوں نے چلا کر سکندر کو منع کیا اور ہاتھ بڑھا کر اسامہ کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ برسوں کا ترسا ہوا باپ بے قراری سے اپنے بیٹے کے لمس سے سیراب ہونے لگا۔ سکندر بخت، زینب بخت اور زیست بخت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے حسین بخت نے بولنا شروع کیا اور ماضی کے پردے ایک ایک کر کے سرکتے چلے گئے۔

میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم واقف ہو
جس پر مجھ کو پیار آ جائے اس کو پاگل کر دیتا ہوں۔
چھوڑ کے مجھ کو جانے والا، لوٹ کے واپس آئے گا
دائیں بائیں آگ لگا کر سامنے جنگل کر دیتا ہوں

اس نے روٹھ کر جاتی شہرین بخت کو روکا تھا۔

"کیا ہے؟ جانے دو مجھے۔"

"کیوں؟"

"مجھے جانا ہے۔" روٹھی روٹھی سی آواز...... جا کر دکھاؤ۔" وہ اسے چیلنج بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر بکواس کی؟" شہرین کا شکوہ بجا تھا۔

"سوری...... آئندہ ایسی بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی۔

"اوکے...... نہیں کرتا...... اب بیٹھ جاؤ۔"

تالاب کنارے رکھے بڑے سے پتھر پر اس نے شہرین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ "شہری!" وقار کی سنجیدہ آواز نے شہرین کو چونکایا تھا۔ "کیا مہران چاچا ہماری شادی کے لئے مان جائیں گے؟" وہ اسے خوب صورت خوابوں کی دنیا سے ایک دم حقیقت کی سفاک دنیا میں کھینچ لایا تھا۔ "پتہ نہیں۔" وہ بے بسی سے سر جھکا گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں بے ساختہ اُمڈ آنے والے ہر اس نے وقار کو بے اختیار شرمندہ کر ڈالا۔

"اوکے! تم فکر مت کرو۔ محبت اگر سچی ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔" اس کی تسلی پر شہرین محض سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اسے یہ نہ کہہ سکی کہ کیا لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور شیریں فرہاد کی محبت سچی نہ تھی؟ اور اگر سچی تھی تو ان کے لئے کوئی راستہ کیوں نہ نکلا تھا۔

"اچھا، یہ بتاؤ یہ سرخ رنگ ہوتا ہی بہت پیارا ہے یا پھر صرف تم پہ بہت پیارا لگ رہا ہے؟" وقار احمد حسب توقع اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہا تھا۔

"وقار! بابا جان میری شادی حسین بخت سے کرنا چاہتے ہیں۔" بکھرے بال، اڑی رنگت اور چہرے پر خوف واندیشے لئے شہرین اس کے سامنے تھی۔

تم میرا ساتھ دو گی؟" اس نے شہرین کی بے حد سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا مطلب؟" سیاہ آنکھوں نے سوال کیا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو گی؟ میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر۔" وہ مجسم سچائی تھی۔

"تو پھر چلو۔ نکاح کر لو مجھ سے پھر ہمیں کوئی جدا نہ کر سکے گا۔" اس نے باور کرایا تھا اور اسی شام...... اسی شام شہرین بخت، شہرین وقار بن گئی تھی۔

مگر...... چند روز بعد جب شہرین کے گھر والوں کو علم ہوا تو اس کے باپ مہران بخت نے اپنی چادر اس کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ "یہ میری عزت ہے شہرین! اسے اب صرف تم بچا سکتی ہو۔ وقار احمد سے طلاق لے لو اور چاہو تو...... اس پر سے گزر کر اس کے پاس چلی جاؤ۔ "اور وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

اسی لمحے تقدیر نے اس کی سیاہ آنکھوں کی پھٹی پھٹی سی کیفیت کو خوب انجوائے کیا تھا شہرین بخت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔

"مجھے تم سے طلاق چاہئے وقار احمد۔" وہ جملہ نہیں تھا پگھلا ہوا سیسہ تھا جو شہرین نے اس کی سماعتوں میں انڈیلا تھا۔ بلکہ پگھلا ہوا سیسہ بھی اتنا جان لیوا تب

ہوتا ہوگا۔" "یہ کیا کہہ رہی ہو شہری؟" وہ لڑکھڑا کر بے ساختہ درخت کے سہارے ٹکا تھا۔

"محبت کرتے ہو مجھ سے؟" وقار کا سر یوں اثبات میں ہل گیا۔ "محبت قرض ہوتی ہے وقار احمد اور قرض، فرض ہوتا ہے اور فرض کی کسی صورت معافی نہیں اور محبت کا قرض پتہ ہے کیا ہے؟" آج پہلی بار وہ براہِ راست وقار احمد کے چہرے کے گھور رہی تھی ورنہ اس میں تو کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی وہ ششدر سا اسے دیکھے گیا۔ "محبت کا قرض سانس ہوتی ہے یہ قرض ہمیں آخری سانس تک چکانا پڑتا ہے اور میری سانسیں گروی رکھی جا چکی ہیں محبت تم پہ بھی قرض ہے وقار احمد محبوب کی خواہش پوری کرنا محبت کا فرض ہے یہ قرض تم پر بھی فرض ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے طلاق دے دو۔" وہ اسے آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں کود جانے کا کہہ رہی تھی اور...... اس کی خواہش بلاشبہ اس پر قرض تھی جسے چکانا اس کا فرض۔

"لیکن شہری! پلیز۔"

"کچھ مت کہنا وقار!" وہ اس کی بات قطع کرتی چلا اٹھی۔

"لیکن تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر مرجاؤ گی؟" وہ بھینچی بھینچی آواز میں چلایا۔

"تو تمہیں میں زندہ نظر آرہی ہوں؟" وہ زخمی انداز میں ہنسی تھی اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی ویرانی تھی زندگی کی تو رمق تک نہ تھی وہاں ...... شہرین تو مرگئی وقار اور میرا خون میرے اپنوں نے کیا ہے۔ اگر تم نے مجھے اپنے نام سے اپنی محبت سے آزاد نہ کیا تو ...... یہ ظاہری زندگی بھی میں خود اپنے ہاتھوں ختم کر ڈالوں گی۔" اس کی آواز میں ریزے تھے۔ کرچیوں کی چبھن تھی رخصت تھی خالی پن تھا اور صحراؤں کی ریت اور ویرانی تھی۔

"ہوا کیا ہے شہری؟" وقار احمد نے وحشت بھری بے قراری سے دریافت کیا تھا۔ "کوئی وضاحت مت مانگنا وقار! اگر کچھ دے سکتے ہو تو آزادی دے دو۔" اس کی آواز میں صدیوں کا بنجر پن تھا۔

"میں وقار احمد بہ ہوش و حواس شہرین بخت کو طلاق دیتا ہوں۔" آسمان ٹھٹک گیا۔ "طلاق دیتا ہوں۔" زمین کی گردش تھم گئی۔ "طلاق دیتا ہوں۔" زلزلہ سب کچھ تباہ کر کے تھم گیا تھا۔

جو مطمئن تھے کہ دورِ خزاں بیت گیا
ستم کہ ان کو بہاروں نے روند ڈالا ہے
لب و حرف سے میرا اعتبار ہی اٹھ گیا
تیرے بعد مجھ سے کوئی دعا نہ ہوسکی

چند ماہ بعد شہرین مہران بخت، شہرین حسین بخت بن گئی وہ زندہ تھی مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک زندہ لاش ہے ان سیاہ آنکھوں میں زندگی، زندگی مرگئی تھی وہ مسکراتی بھی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ کرب کے لہو میں ڈوبی ہوئی تھی حسین بخت نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے خوش رکھنے کی...... لیکن...... کچھ لوگوں کی خوشیاں میت کی صورت قبر میں جا سوتی ہیں اور ان کا واپس آنا اس قدر ناممکن ہوتا ہے جس قدر کسی میت کا پھر سے زندہ ہو کر واپس اگر دوبارہ زندہ رہنا ...... اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ پہلے بلند بخت، پھر سکندر بخت نے آخر اس کا دل بہلایا تھا۔ مگر...... پھر بھی وہ زندگی کہاں تھی؟ پھر ایک رات جب شہرین بخت بخار کی شدت سے بے ہوش تھی حسین بخت برستی بارش میں ڈاکٹر کو لینے گیا تھا ایسے میں بلند بخت غائب ہوگیا شہرین مزید بکھر گئی اسے زینب بخت کی آمد بھی نہ سمیٹ پائی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ اس نے آخری سانس تک محبت کا قرض ادا کیا تھا۔

دیئے جلائے تھے ہم نے وفا کے راستے میں
نجانے آ گئے کیسے؟ ہوا کے راستے میں
میں آج بھی بیٹھا ہوں وہیں نقشِ پا کی طرح
جہاں گیا تھا وہ مجھ کو بیٹھا کے راستے میں

شہرین کے جانے کے بعد وقار احمد کی زندگی اس ایک مقام پر ساکن ہوگئی تھی...... ایسا اکثر ہوتا ہے کہ باہر وقت سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے موسم بدلتے ہیں حالات بدلتے ہیں مگر...... دل کی ایک وہی کیفیت، وہی

ایک تاثر...... دل ٹھہر جایا کرتا ہے زندگی ٹھہر جایا کرتی ہے ایک اسی مقام پر...... یہاں تک کہ سالوں گزر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت آجاتی ہے وقار احمد کے دل میں بھی محبت امر بیل کی طرح براجمان تھی اس کی ماں بیٹے کے روگ کا روگ لئے عدم آباد چلی گئی۔ اس کی داستان میں اس کے قاتل بھی بخت خاندان کے لوگ تھے نہ وہ شہرین کو اس سے چھینتے اور نہ ہی...... اس نے بلند بخت کو اغوا کیا۔ اسے اپنے عزائم کے مطابق تربیت دی۔

وہ بخت خاندان کو، بلند بخت کے ہاتھوں برباد کروانا چاہتے تھے اور اس میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہے تھے لیکن اب...... اوہ خدایا! وہ حسین بخت سے بات کر رہے تھے مگر دوسری طرف اسامہ کی آواز؟ کس قدر درد، کرب بے یقینی حیرت اور وحشت تھی اس کی آواز میں...... ان پر ایک دم ہی انکشاف ہوا تھا کہ وہ اسامہ وقار کے ساتھ اس سب میں زیادتی کر گئے تھے لیکن...... وہ حسین بخت کا بیٹا تھا...... ان کی محبت اور ان کی ماں کے قاتل کا بیٹا!

☆......☆......☆

''گورکی!'' ان کی آواز پر گورکی ایک دم نمودار ہوا تھا۔ مجھے اسی وقت بخت ہاؤس جانا ہے۔

حسین بخت کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وقار احمد کی آواز ابھری۔ ''اسامہ! مجھے معاف کردو اسامہ! اور واپس چلو۔'' وہ کچھ دیر تک وقار احمد کا چہرہ دیکھتا رہا۔ یہ وہ شخص تھا جسے اس نے ہمیشہ اپنا باپ سمجھا اس کے ہر حکم کو حرف آخر سمجھا۔ لیکن وہ...... اسے استعمال کررہا تھا۔ اس نے صرف قرض اتارنے کے لئے اسے اغوا کیا تھا۔

''بلند بخت!'' حسین بخت بے قراری سے بول اٹھے۔ اسے اس کے باپ اور...... ماں کے پیار سے محروم کرنے والا وقار احمد تھا۔

''بھائی!'' سکندر بخت اور زینب بخت ایک ساتھ پکارے تھے۔ اور وہ...... وہ اپنے سگے بھائی کو ہی جان سے مارنے والا تھا...... اس کی بھٹکتی نظر زیست بخت پر جا ٹھہری اور وہ زندگی سے محروم بھی تو وقار احمد کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔

''آپ سب نے اپنا اپنا قرض ادا کیا...... میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں شہرین بخت کا بیٹا تھا...... وہ شہرین بخت، جس کی روح تک رسموں کی بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا تھا۔'' اس کی بے تاثر نگاہ نے حسین بخت کو دیکھا۔ ''آپ نے میری ماں کو وقار احمد سے چھین کر اپنے خاندان کی روایات کا قرض چکایا۔ وہ وقار احمد کی طرف پلٹا...... اور بابا آپ......؟ آپ نے بھی انتقام کا قرض چکانے کے لئے میری پرورش کانٹوں پر کی۔ جس عمر کے بچے تتلیوں اور پھولوں سے کھیلتے ہیں آپ نے مجھے ہتھیاروں سے کھیلنا سکھایا۔ اس کی بنجر نگاہ زیست بخت پہ آن ٹھہری۔'' اور تم نے میری زندگی میری مسکراہٹ چھین کر اپنا قرض چکایا۔ زیست تڑپ اٹھی بلند بخت...... اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔ ''آپ سب نے اپنا اپنا قرض چکا لیا اور یہ زندگی مجھ پر قرض ہے سو مجھے بھی یہ قرض ادا کرنا ہے۔''

اس کا ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا تو سب ہی اضطراری انداز میں چلا اٹھے۔ ''اسامہ۔''

''بلند بخت!'' پلیز ایسا مت کرو۔'' زیست اس کی طرف لپکی تھی۔

''میں نے آج تک جس کسی کو بھی زندگی سے آزاد کیا اسے کلمہ پڑھنے کا موقع ضرور دیا آپ نے تو پھر میری پرورش کی ہے مجھے کلمہ پڑھنا اور پڑھوانا آپ نے ہی سکھایا ہے سو اس کا موقع آپ کو بھی ضرور دوں گا کلمہ پڑھ لیں بابا۔'' اس کی بات پر ریوالور نکالتے وقار احمد کو گویا کرنٹ لگا تھا۔ وہ حسین بخت کو شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

''تت...... تم مجھے مارو گے اسامہ؟'' بے یقینی سے ان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ ''کلمہ پڑھ لیں بابا!'' اس کی سپاٹ سرگوشی سے مشابہ آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ وہاں موجود ہر ذی نفس نے سن لی۔ اگلے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور...... بارود کی خوشبو سے مہک اٹھی وقار احمد کے جسم میں لاتعداد سوراخ ہو گئے آج پہلی بار

اس منظر سے اسامہ...... نہیں بلکہ بلند بخت نے نظریں چرائی تھیں وہ حسین بخت کی طرف پلٹا...... میرا خیال ہے میں نے سب کا قرض چکا دیا ہے ایک آخری قرض رہ گیا ہے دوسرا جملہ اس نے خود کلامی کے انداز میں ادا کیا تھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس نے وقار احمد کو مار کر اپنے خاندان کا قرض چکا دیا تھا۔ اس نے زیست بخت کا قرض بھی چکا دیا تھا۔ اب صرف زندگی کا قرض باقی تھا اس نے ایک نظر زیست بخت پر ڈالی۔ ان سیاہ آنکھوں کے بنجر پن پر زیست کا دل کسی نے تلوار کی نوک سے گھسیٹا تھا۔ اس نے پھر سکندر بخت اور زینب بخت کو دیکھا...... اتنے خوب صورت رشتوں سے وہ ہمیشہ محروم رہا تھا۔ اس نے حسین بخت کو دیکھا۔ یہ شفیق چہرہ اس کے اپنے باپ کا تھا جس سے اسے چھین لیا گیا تھا اس کی نگاہ لاؤنج میں لگی فیملی پکچر پر پڑی شہرین بخت، حسین بخت اور ان کے بیچ سکندر بخت اور زینب بخت، ان میں بلند بخت کہیں نہ تھا۔ اس کی حسرت زدہ نگاہ شہرین کے مقدس چہرے پر ایک لمحے کو رکی۔ یہ اس کی وہ ماں تھی جس کا لمس بھی اسے یاد نہ تھا۔

میرا نام بلند بخت ٹھیک ہی رکھا گیا۔ اس نے خود کلامی کی۔ وقار احمد کی چھلنی لاش کو ایک نظر دیکھ کر اس نے پھر زیست بخت کو دیکھا وہ لڑکی جو چند ہی دن میں اسے دنیا بھر سے عزیز ہو گئی تھی لیکن وہ تو...... وہ تو قرض چکانے آئی تھی۔

"میں مرحومیوں کا واقعی بلند بخت ہوں۔" وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کا وجود لہولہو تھا کسی پہاڑ تلے آ کر کچلا ہوا۔ "تم میری ایسی ہی مسکراہٹ کی تمنائی تھیں نا؟ یہ قرض بھی میں نے ادا کر دیا ہے اس نے پلکیں سختی سے بھینچی تھیں لبی، مڑی ہوئی پلکوں کی سطح نم تھی۔ ایک آخری قرض باقی ہے تم نے کہا تھا نا کہ مجھے چھوڑ دو۔"

حسین بخت سکندر بخت اور زینب بخت اس کی باتوں سے صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اور تم جانتی ہی ہو کہ تم میری زندگی ہو تم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا اس کے لئے اور وعدہ قرض ہوتا ہے سو میں یہ آخری قرض بھی چکا رہا ہوں۔" بات مکمل کرتے ہی اس کا ہاتھ برقی سرعت سے حرکت میں آیا تھا۔ اس ایک حرکت نے ان مجسمہ بنے لوگوں میں زندگی کی حرکت دوڑا دی تھی لیکن یہ بعد از وقت تھا۔

ایک برسٹ تڑتڑاہٹ بارود کی مہک......

اور سامنے زندگی کا چہرہ اور کیا چاہئے تھا؟ اس کی سیاہ ساحر آنکھوں میں وہ منظر قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گیا اور آنکھیں قیامت تک کے لئے بند ہو گئیں اس کے بے جان وجود سے لپٹ کر رونے والوں میں زیست بخت بھی تھی وہ پتھر کا مجسمہ پل بھر میں موم میں ڈھل گیا تھا لیکن

وہ موم میرے عشق کی تاثیر سے ہوا
لیکن...... یہ واقعہ بڑی تاخیر سے ہوا

محبت اسی پل جھپٹ کر زیست بخت کے دل روح پر حملہ آور ہوئی تھی اور اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا اس کی روح کو ہلا ڈالا تھا۔ حسین بخت دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ان کا وہ بیٹا جس کے ملنے کی دعائیں انہوں نے سانس سانس میں کی تھیں وہ ملا بھی تو فوراً بچھڑنے کو

سکندر بخت اور زینب بخت اپنے بھائی کی موت پر اشکبار تھے۔ اور زیست بخت اس پر اسی پل انکشاف ہوا تھا کہ اس شخص کی محبت تو اس کے خون کی روانی میں شامل تھی۔ اور شاید اس وقت سے جب اس نے فرضی ڈاکوؤں سے بچنے کو اس سے مدد لی تھی محبت واقعی قرض ہوتی ہے اس نے بھی اب آخری سانس تک محبت کا یہ قرض چکانا تھا۔ اور جو مسکراہٹ اس نے اسامہ کے لبوں پر دیکھنے کی خواہش کی تھی وہ مسکراہٹ اب ہمیشہ کیلئے خود اس کے لبوں پر منجمد ہو گئی تھی اور وہ اسامہ جو اصل میں بلند بخت تھا وہ سارے قرض چکا گیا تھا۔

کسی اور دیس کی اور کو
وہ سنا ہے فراز چلا گیا
سب ہی درد سمیٹ کے شہر کا
سب ہی قرض اتار کے شہر کا

نجات دہندہ

طارق محمود-کامرہ اٹک

آواز سنائی دی تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے، اللہ معاف کرنے والا ہے اپنے ایمان کی تجدید کرو اور اللہ سے خوب گریہ وزاری کے ساتھ معافی طلب کرو اور کوشش کرو کہ اب کوئی گناہ نہ ہو۔

شیطانی طاقتیں اہل ایمان کو رانگ در گاہ کر دیتی ہیں ایک عبرت ناک کہانی

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا بس کچھ ہی دیر میں عشاء کی نماز کا وقت ہونے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے شاہ صاحب کے پاس پہنچنا تھا کیونکہ وہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرا میں چلے جاتے تھے اور کسی سے بھی نہیں ملتے تھے۔ یہی سوچ کر میں گاڑی تیزی سے چلا رہا تھا اب کافی لمبی اترائی تھی اور پھر ایک خطرناک سا موڑ تھا میرا اس روڈ پر دوماہ میں یہ پانچواں چکر تھا اسی لئے راستوں کی پہچان بھی خوب ہوگئی تھی۔ لیکن موڑ کاٹتے ہوئے جب میں نے ہارن کا بٹن دبایا تو اس میں سے ٹھس ٹھس کی آواز نکلی، میں اسی اسپیڈ سے موڑ مڑ چکا تھا اس لئے اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

ایک آدمی روڈ کے درمیان آہستہ آہستہ جھومتے ہوئے ایسے روڈ کراس کر رہا تھا جیسے کہ نشہ میں ہو، میرے بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی اس سے جا ٹکرائی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ آدمی قلابازیاں کھاتے ہوئے روڈ کے بائیں طرف ایک ٹیلہ کے پیچھے جا گرا گاڑی بھی ڈگمگاتے ہوئے اسی طرف لڑھک کر اس ٹیلہ سے ٹکراتے ہی بند ہوگئی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے جسم میں جیسے جان نہ رہی اس ٹیلہ کے پیچھے میری گاڑی سے ٹکرانے والا آدمی نہ جانے کس حال میں ہوگا مجھے یقین نہ تھا کہ وہ بچ سکا ہوگا اتنی شدید ٹکر سے تو اس کی ہڈیاں سرمہ بن گئی ہوں گی۔ میں خود کسی بھی قسم کی ٹوٹ پھوٹ یا چوٹ وغیرہ سے بچ گیا تھا اور حیرت انگیز طور پر گاڑی بھی زیادہ نقصان سے بچ گئی تھی میں ڈرتے ڈرتے بوجھل اور افسردہ دل سے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا اور ادھر ادھر دیکھا اس وقت تک وہاں سے کوئی گاڑی نہ گزری تھی ،میں ٹیلہ کے اوپر چڑھا تا کہ اس زخمی شخص کو دیکھ سکوں ،میرا پورا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔

میں دوسری طرف زمین پر غور سے دیکھنے لگا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا یہ نہ تھا کہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ آدمی مجھے نظر نہ آرہا تھا اندھیرا تو تھا لیکن اتنا گہرا بھی نہ تھا کہ چند گز زمین پر پڑا آدمی نظر ہی نہ آئے۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں نے اس آدمی کو خود ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دیکھا تھا اور اس کو گاڑی سے ٹکرا کر ہوا میں اڑتے ہوئے اس ٹیلہ کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا تھا لیکن پھر وہ آدمی کدھر گیا؟" میں یہ سوچتے ہوئے کافی الجھ گیا تھا، اب میں ٹیلہ سے نیچے اتر کر کچی زمین کو دیکھ رہا تھا جہاں اس آدمی کے گرنے کے نشان تھے اور کالے کالے سے نشانات بھی تھے جو کہ یقیناً خون کے تھے، بیٹھ کر غور کرتے ہوئے مجھے ایک طرف گھسٹنے کے نشان بھی



نظر آنے لگے اتنی زوردار ٹکر اور اتنا زخمی ہونے کے باوجود بھی وہ آدمی اپنے پیروں پہ چل کر ایک سمت گیا تھا یعنی کہ بہت ہی قوت مدافعت والا آدمی لگ رہا تھا یا پھر زخمی زیادہ نہ ہوا ہو۔

لیکن نہیں زخمی تو وہ یقیناً بہت زیادہ تھا میں شاہ صاحب کی طرف سے بہت لیٹ ہو چکا تھا اسی لئے میں اس آدمی کے بارے میں جاننے کو بے تاب ہو گیا، مجھے اک تجسس نے گھیر لیا اور میں ان گھسٹتے قدموں کے نشانات پہ چلنے لگا، ان نشانات میں ہلکی ہلکی خون کی جھلک بھی تھی میں نے دور تک سامنے دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ آدمی یا اس کا ہیولہ نظر نہ آیا، مجھ میں اس زخمی آدمی کو تلاش کرنے کا ایک جنون سا آ گیا کیونکہ اتنا زخمی ہونے کے باوجود بھی وہ آدمی کچھ ہی دیر کے اندر غائب ہو گیا تھا میں نے سامنے کی طرف تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا کچھ ہی فاصلہ پہ ایک پہاڑی سلسلہ تھا اور اس کے دامن میں کانٹے دار درختوں کا ایک جنگل سا تھا میں بھاگتے ہوئے اس جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت چاند نے اپنی چاندنی بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہو کر بکھیر دی۔ اس چاندنی میں، میں نے اس آدمی کا ہیولہ دیکھا جو کہ لڑکھڑاتا گھسٹتا ہوا جنگل سے کچھ ہی فاصلہ پہ جا رہا تھا میں نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔

"اوئے رک جاؤ" لیکن وہ نہ تو رکا اور نہ اس نے پلٹ کر دیکھا، جنگل اس کے سامنے ہی تھا اور میں اب اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا تیزی سے اور ساتھ ہی اسے آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا لیکن وہ تو رک نہیں رہا تھا مجھے یقین تھا کہ میں اس کے پاس جنگل سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔

پھر اچانک وہ غائب ہو گیا میں اس کی طرف دیکھ کر ہی دوڑ رہا تھا اس کے اچانک غائب ہوتے ہی میرے قدم یک دم آہستہ ہو گئے اور ساتھ ہی میں پریشان اور ڈر بھی گیا کیونکہ وہ سارا میدان میری نظر میں تھا جانے وہ کیسے غائب ہو گیا میں چلتے چلتے رک گیا عشاء کی نماز کو کافی دیر ہو چکی تھی اسی لئے ہلکے سے ڈر نے میرے دل میں جگہ بنالی پھر تجسس نے مجھے وہاں رکنے نہ دیا میں آگے بڑھنے لگا تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ آدمی واقعی غائب ہو گیا ہے یا......

میں اپنی سوچوں میں کھویا ٹھیک اسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ آدمی چلتے چلتے اچانک غائب ہو گیا تھا پھر کراہ کی دردناک آواز نے مجھے اس کھڈ میں گرنے سے بروقت بچا لیا جس کے اوپر غائب دماغی سے چلتے ہوئے

میں نے ایک پاؤں رکھ چھوڑا تھا جوکہ ہوا میں معلق تھا عین وقت پہ میں نے اپنے آپ کو پیچھے کی طرف گرالیا چند ساعت میں چپ چاپ آرام سے ایسے زمیں پر پڑا رہا جیسے کہ اس کے علاوہ مجھے کوئی کام نہیں اس وقت کی چویشن یاد آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھا وہ آدمی اس گڑھے میں پڑا کراہ رہا تھا۔

میں آہستہ سے اس گڑھے میں اتر گیا خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے اس آدمی کو باہر نکالا اور پھر اس سے بھی کٹھن مرحلہ اسے اپنے ساتھ کار تک لانے کا تھا، کار میں فرسٹ ایڈ بکس تھا جو کہ میرے دوست ایک ڈاکٹر کا تھا جس سے کہ میں کار مانگ کر لایا تھا میں خود ایک اسکول ٹیچر ہوں اور ایک ذہنی الجھن کے علاج کے لئے شاہ صاحب کے پاس جارہا تھا اس سے پہلے بھی تین دفعہ میں ان کے پاس جاچکا تھا ان کے روحانی علاج اور دم سے کافی افاقہ ہوا تھا۔

آج میں خصوصی طور پر ان کے پاس جارہا تھا۔ پچھلی رات ایک عجیب اور ڈراؤنے سے خواب نے مجھے کافی پریشان کردیا تھا اسی لئے آج میں اپنے خواب کے بارے میں شاہ صاحب کو بتانے جارہا تھا لیکن اس حادثہ نے مجھے اپنے آپ میں الجھالیا۔

میں نے جیسے تیسے اس زخمی آدمی کی مرہم پٹی کی اور درد کش انجکشن بھی لگادیا تھا جہاں تک میں نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا تھا اس کا ایک بازو ضرور فریکچر تھا اور دونوں ٹانگیں بہت زخمی تھیں میں نے اسے گاڑی میں ڈالا اور تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد گاڑی کو اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ آدمی پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا میں نے گاڑی احتیاط سے بھگاتے ہوئے سیدھا اسے اپنے دوست ڈاکٹر کے کلینک پہنچایا جو کہ اس وقت اپنے کلینک میں ہی تھا، جب اس نے زخمی کو دیکھا تو اس کے تو جیسے اوسان خطا ہوگئے۔ ”یار نعیم تو دوست ہے اپنا لیکن یہ آدمی اگر مرگیا تو ہم پھنس جائیں گے کیونکہ یہ پولیس کیس ہے۔“ ڈاکٹر اعتزاز نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اچھا تو ٹھیک ہے میں اسے کہیں اور لے جاتا ہوں۔“ میں نے جلدی سے زخمی والے اسٹریچر کو واپس باہر کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں میرا یہ بھی مطلب نہ تھا۔“ دوسری طرف سے اس نے اسٹریچر کو مضبوطی سے پکڑلیا پھر تھوڑی سی گرما گرمی ہوئی اور اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے، دو گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد اس کی ایک ٹانگ اور بازو پر پلستر چڑھا دیا گیا اور زخموں پر پٹیاں ،اس کے علاوہ اس کے جسم پر کچھ ٹانکے بھی لگے تھے، اس کی جان بچ گئی تھی۔

ڈاکٹر اور اس کا چار افراد پر مشتمل عملہ جس میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے کافی تھکے ہوئے اندر سے نکلے ،میرا موڈ ابھی تک اس کی باتوں سے خراب تھا۔

”یار وہ واقعی سیریس تھا شکر کر اللہ کا کہ بروقت تو اسے یہاں لے آیا۔“ اس نے میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”پلیز اپنا موڈ ٹھیک کر اور مجھے جلدی سے بتا کہ یہ کیسے ہوا۔“ ہم باتیں کرتے ہوئے اس کے آفس میں آبیٹھے تھے مجھے بھی احساس ہوگیا تھا کہ اگر بندہ اسپتال میں مرجاتا تو اعتزاز کے لئے ٹھیک ٹھاک مسئلہ بن جاتا اسی لئے میں نے اپنا موڈ ٹھیک کرلیا اور آفس میں پڑا تھرماس میں سے اعتزاز نے اپنے اور میرے لئے چائے نکالی چائے پیتے ہوئے میں اسے اس ایکسیڈنٹ اس کے اس آدمی کے گم ہوجانے اور اتنا زخمی ہونے کے باوجود بھی کتنے دور تک جانے کا بتایا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔

”تم پیے ہوئے تو نہیں ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنا زخمی اور ٹانگ فریکچر ہونے کے باوجود چلتے ہوئے دور نکل گیا ہو بلکہ تمہارے کہنے کے مطابق تیزی سے نکل گیا ہو۔“

”یار تم یقین کرو وہ تو یہ بندہ ایک کھڈ میں گر گیا تھا ورنہ تو اس کا ملنا مجھے بہت ہی ناممکن سا نظر آرہا تھا اگر یہ اس جنگل میں گھس جاتا تو اس کا بچنا بھی شاید مشکل ہوتا۔“ میں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

زخمی کو کمرہ میں منتقل کر دیا گیا تھا اس کی جیب سے کوئی شناختی یا کاغذ وغیرہ نہ نکلا وہ رات مجھے اسپتال میں ہی گزارنا پڑی، ویسے بھی میرے گھر میں ایسا کوئی نہ تھا جسے کہ میرا انتظار یا فکر ہوتی، یہ بات بھی نہ تھی کہ میں گھر میں اکیلا تھا، بلکہ ہمارا گھر تو ایک بڑی سی حویلی تھی جس میں میرے چار بھائی تین بہنیں نوکر چاکر امی اور ابو اتنے لوگ ہونے کے باوجود بھی میں اکیلا تھا کیونکہ ابو میرے سگے جبکہ امی اور بہن بھائی سوتیلے تھے رشتہ کے لحاظ سے بھی سوتیلے اور اپنے رویہ کے لحاظ سے بھی سوتیلے ہی تھے۔

میرے ابو نے جب دوسری شادی کی تو پہلے پہل سوتیلی ماں نے بہت لاڈ پیار دکھایا لیکن جب ان کی اپنی اولاد ہونے لگی تو ان کو مجھ میں سو طرح کے عیب نظر آنے لگے پھر روز ہی ابو سے میری شکایت ہوتی، شروع میں وہ مجھے سمجھانے لگے لیکن آخر وہ بھی سوتیلی ماں کے رنگ میں رنگ گئے کسی طرح کی بھی شکایت پر مجھے دھنک کر رکھ دیتے اتنی بڑی حویلی اور اتنے لوگ ہونے کے باوجود میں اکیلا تھا تب کتابوں ہی نے مجھے سہارا دیا میں نے تعلیم ہی کو اپنا دوست اور دکھ درد کا ساتھی بنالیا اور یوں اتنا عرصہ گزر گیا۔

میں اب ایک اسکول میں ٹیچر ہوں میرے ابو کی دو فیکٹریاں ہیں جن میں پلاسٹک کی مختلف قسم کی چیزیں بنتی ہیں لیکن میرا ان میں شاید کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی ضرورت ہے جو کچھ اللہ نے میری قسمت میں لکھا ہے میں اس پہ شاکر ہوں۔

رات کافی گزر گئی تھی اعتزاز گھر جا رہا تھا اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا کہا لیکن میں یہ رات اس زخمی کے پاس گزارنا چاہتا تھا جو کہ میری وجہ سے شدید زخمی ہوا تھا اس کے بیڈ کے ساتھ ہی ایک آرام دے صوفہ پڑا تھا میں اس پر بیٹھ گیا اس سے پہلے میں نے اس آدمی پر اتنا دھیان نہیں دیا تھا اب میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، کشادہ پیشانی گورا چٹا چہرہ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی عمر کا اندازہ میں نے ساٹھ سے متجاوز لگایا اس آدمی کے پاس سے ہلکی ہلکی بدبو سی آرہی تھی میں نے صوفہ کو پیچھے کرلیا صوفہ پر بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آگئی۔

نرس نے صبح آکر مجھے جگایا اور میں سیدھا باتھ روم میں جا گھسا اس کے بعد ناشتہ کی غرض سے باہر نکلا مجھے اسکول بھی جانا تھا لیکن اس زخمی کو یوں اسپتال میں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا نہ لگا اس لئے میں نے ایک ساتھی ٹیچر کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ میری چھٹی کی درخواست جمع کرادے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں واپس اسپتال آگیا جہاں اب عملہ کچھ زیادہ نظر آرہا تھا۔

صبح کے وقت اس اسپتال میں ایک لیڈی اور ایک مرد ڈاکٹر کی ڈیوٹی ہوتی تھی جبکہ اعتزاز خود سرکاری اسپتال میں جاب کرتا اور چھٹی کے بعد وہ اپنے اسپتال میں آجاتا تھا۔

میں اس لیڈی ڈاکٹر سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے اس زخمی کے روم میں جا پہنچا جو کہ ابھی تک سو رہا تھا یا پھر بے ہوش تھا میں ٹہلتا ہوا ڈیوٹی پر موجود نرسوں کی طرف چلا گیا جو کہ ریسپشن پہ کھڑیں دو آدمیوں سے مسکرا مسکرا کر باتیں کررہی تھیں ان میں سے ایک مجھے دیکھتے ہی میری طرف متوجہ ہوگئی اور احترام سے پوچھا۔ ”جی سر۔“ کمرہ نمبر آٹھ والے مریض رات کا بے ہوش ہے پلیز ذرا اسے چل کر دیکھ لیں۔“ میں نے کہا تو وہ جلدی سے بولی۔

”اب تک تو اسے ہوش آجانا چاہئے تھا۔“ یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی چل دی۔ نرس کمرہ میں داخل ہوکر مریض کے بیڈ کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس کی نبض وغیرہ چیک کرنے لگی، اسی وقت وہ آدمی کسمسانے لگا اور اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلنے لگے۔ ”ملبہ ...... صاحب ...... مجھے معاف کردیں ...... م ...... مجھے ...... معاف کردیں۔“

نرس پہلے ہی سے اس کی طرف متوجہ تھی میں بھی اس کے قریب چلا گیا اور پھر اس کے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں جنہیں دیکھ کر میں جھٹکے سے پیچھے ہٹا، سرخ سرخ خون لئے آنکھیں کھول کر چند ساعت وہ گم صم سا سامنے دیکھتا رہا اور پھر وہ حیران ہوکر اپنے آپ کو ہاتھ لگا کر ٹٹولنے لگا پھر اس نے دیدے گھما کر ادھر ادھر کمرہ کو دیکھا۔

نرس کو دیکھتے ہی وہ بوکھلا سا گیا اور اس نے جلدی سے منہ میری طرف پھیر لیا، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ۔“ میں نے ان کے بالکل قریب جا کر پوچھا اس نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا لیکن اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا اور پھر اس نے آہستہ سے ”پانی“ کہا تو نرس باہر سے اس کے لئے پانی لے آئی جو کہ اس نے آہستہ آہستہ پیا۔

نرس پانی دے کر باہر چلی گئی اب وہ اپنے چہرے سے حیران اور کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر سرسراتی آواز سے پوچھا۔

”یہ اسپتال کا ایک کمرہ ہے آپ میری گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے تھے اسی لئے میں آپ کو یہاں لے آیا۔“

”یہ علاقہ کون سا ہے؟“

”یہ پنجاب کا ایک شہر ہے......“

میں نے اسے شہر کا نام بتایا تو وہ بے چین سا ہو گیا۔

”آپ مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں بتائیں تاکہ میں ان کو آپ کے بارے میں اطلاع دے سکوں۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

”میرا گھر کوئی نہیں...... اگر ہے بھی تو مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی آدمی کا کوئی گھر نہ ہو یا پھر اسے اپنے گھر کا پتہ معلوم نہ ہو۔“ میں نے اس کی بات سن کر حیرانی سے پوچھا۔

”میرا بھی ایک گھر تھا بیوی تھی بچے تھے...... ہاں کچھ تھوڑی سی بے سکونی تھی وہاں...... شاید اس کی وجہ بھی میں ہی تھا۔ بات بہت لمبی ہے اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو میں سناؤں۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر کہتے ہوئے اک دم چونک گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ ”کیا تم میری کہانی سن لو گے۔“

”جی میں سن رہا ہوں آپ سنائیں۔“

”میرا نام ندیم ہے، سندھ کے ایک بڑے شہر میں ہمارا چھوٹا سا دو کمروں پر مشتمل ایک گھر تھا اور اسی شہر کے ایک ہوٹل میں، میں ویٹر تھا تین بچے تھے دو بیٹے ایک بیٹی...... ویٹر بے چارے کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے لوگوں کی ٹپ وغیرہ سے زیادہ تر اچھا گزارہ ہو جاتا ہے میرے تینوں بچے پڑھ رہے تھے لیکن میں انہیں گھر کے خرچہ کے علاوہ ریفریشمنٹ کرانے کا اہل نہ تھا میں رات گئے جب بھی گھر جاتا بیوی اور بچوں کی آنکھوں میں ناپسندیدگی دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی میں اپنی بیوی کا مجازی خدا تھا اور اپنے بچوں کا باپ لیکن وہ مجھے ایسے دیکھتے جیسے کہ میں ان کے گھر میں کوئی غیر داخل ہو جاتا ہوں میں نے شادی کے بعد ایک بار پھر اپنی بیوی سے سخت کلامی تک نہ کی لیکن بچے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہ میں کوئی خونخوار بلا ہوں...... شاید اس میں قصور میرا ہی تھا میں انہیں کچھ بھی سہولت نہ دے سکا۔

دونوں بیٹے بی اے میں تھے کالج کے بعد وہ ٹیوشن پڑھاتے تھے ان دنوں میں چڑچڑا سا ہونے لگا کیونکہ ہوٹل میں ہر ایک ویٹر کو ٹپ ملتی تھی لیکن مجھے ٹپ ملنا بالکل بند ہو گئی تھی یہاں تک کہ مجھے زیادہ تر لوگ اپنی ٹیبل پر سرو کرنے بھی نہیں دیتے تھے اب جبکہ میں اپنی تنخواہ کے علاوہ گھر کچھ نہ لاتا تو گھر سے مجھے باقاعدہ طعنہ ملنے لگا تھا۔

مختصر یہ کہ میرے حالات بہت زیادہ خراب ہوتے جا رہے تھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کہ ایک رات جبکہ میں چھٹی کرنے والا ہمارے ہوٹل میں ایک سادھو آ گیا جس نے اسپیشلی میرا نام لے کر مجھ سے سروس لی اور میں خوشی خوشی بھاگ بھاگ کر اس کا آرڈر پورا کرنے لگا جاتے ہوئے وہ مجھے اچھی خاصی ٹپ دے گیا جس سے کہ میں نے گیس اور بجلی کے بل جمع کروا دیے، اب وہ سادھو ہر ہفتہ کی رات آنے لگا جس کو میں سرو کرتا اور جاتے ہوئے وہ بہت اچھی ٹپ دے جاتا۔

گھر کے حالات جوں کے توں تھے میں اگر گھر میں کوئی بے قاعدگی دیکھتا اور اس کے بارے میں پوچھتا تو بیوی تو بیوی بچے تک مجھے آگے سے جواب دیتے اس کے بعد میں نے گھر کے معاملات میں بولنا چھوڑ دیا، تنخواہ جو ملی وہ چپ چاپ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور آگے سے کڑوی کسیلی باتیں سنتا۔

ایک ہفتہ کی رات جب وہ سادھو ہوٹل میں کھانا کھانے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اپنی پریشانی نہ چھپا سکا اور اس کے پوچھنے پر اپنی پوری کہانی اسے رنجیدہ لہجے میں سنا ڈالی، جس کے بعد اس نے مجھے اتوار کی رات دس بجے تیار رہنے کا کہا۔ ”میرے دو بچے آ کر تمہیں لے جائیں گے۔“

میں نے اس سادھو کی بات پر سر ہلا دیا اور یہ تک نہ پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے کر جائیں گے۔ ”کل تیار رہنا تمہاری ساری پریشانیاں دور بھاگ جائیں گی۔“

اور پھر میں دوسرے دن رات دس بجنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

رات کے دس بجنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی میں ہوٹل کے گیٹ پر کھڑا تھا ٹھیک دس بجے گیٹ کے بالکل سامنے ایک پرانے ماڈل کی کار آ کر رک گئی اور اس میں سے ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا نکل کر ہوٹل کے گیٹ کی طرف آنے لگا جب اس نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آ گیا۔

”آپ کا نام ندیم ہے۔“ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا، میں نے جلدی سے ہاں میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے سادھو مہاراج نے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لئے۔“

اور میں خوشی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس پرانے ماڈل کی کار میں بیٹھ گیا، کار بغیر کوئی آواز نکالے ایسے چلنے لگی جیسے میں کسی جھولے میں بیٹھا ہوں وہ لڑکا میرے ساتھ ہی پیچھے بیٹھ گیا، میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ ڈالی تو اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے ایک ہیولہ سا بیٹھا نظر آیا گاڑی میں کسی قسم کی لائٹ آن نہ تھی، وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

مجھے گاڑی کا ماحول بڑا پراسرار لگ رہا تھا، میرے اندر ایک انجانی سنسنی سی پھیلنے لگی، میں نے ایک دو دفعہ اس لڑکے سے بات کرنے کی کوشش کی تا کہ ماحول کا فسوں کم ہو سکے لیکن میں گنگ سا ہو کر رہ جاتا اس کے بعد میں نے بات کرنے کی کوشش ہی ترک کر دی۔

تقریباً ایک گھنٹہ کار چلتی رہی لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے پوری رات ہم کار میں بیٹھے رہے ہوں۔

یک دم کار رک گئی وہ لڑکا جلدی سے اتر کر میری طرف آیا اور میری طرف کا دروازہ کھول دیا، میں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا جو کہ خالی تھی، مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا کیونکہ اگلے والے دونوں دروازوں میں سے ایک بھی نہیں کھلا اور ڈرائیور غائب تھا۔

مجھے اچانک ڈر کی کیفیت نے گھیر لیا، میں ڈرتے ڈرتے باہر نکلا، میرے نکلتے ہی اس لڑکے نے دروازہ بند کر دیا، ویران علاقہ چاروں طرف ہلکا ہلکا دھواں سا اٹھ رہا تھا جسے دیکھ کر میرے ڈر میں اضافہ ہو گیا ”جلدی چلیں سادھو مہاراج ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور میں خالی ذہن سے اس کے ساتھ چل پڑا، دو تین قدم چل کر میں نے ویسے ہی پیچھے کار کی طرف ایک نظر ڈالی تو میں لڑکھڑا گیا کار اس جگہ تو کیا اس پورے ویرانے میں کہیں نہ تھی، اب مجھ سے مزید قدم اٹھانے دوبھر ہونے لگے۔ ”آپ سامنے دیکھ کر چلیں ادھر ادھر نہ دیکھیں۔“ اس لڑکے نے میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا میں اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بڑی مشکل سے چل رہا تھا کہ مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

ہمارے بالکل سامنے ہی ایک بہت بڑی کوٹھی تھی حالانکہ اس سے پہلے میں نے اس پورے ویرانے میں کوئی کوٹھی تو کیا دیوار تک نہ دیکھی تھی۔

”گھبرائیں نہیں ہماری منزل آ گئی آ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کوٹھی کے بڑے سے گیٹ کو بے آواز کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اس پراسرار ماحول کا اثر لئے بوجھل قدموں اور ڈرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

کوٹھی کا لان بہت بڑا تھا لیکن اس میں اس وقت اندھیرے کا راج تھا جس کے درمیان بنے ایک راستے پر چلتے ہوئے ہم کوٹھی کے اندر پہنچ گئے، جہاں مجھے ہر جگہ ہلکی روشنی والے بلب جلتے نظر آئے جن کی روشنی کونوں کھدروں میں پہنچنے سے معذور تھی، اس لڑکے نے مجھے ایک ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا اور کچھ

کہے بغیر ہی غائب ہوگیا۔

کچھ منٹ بعد ڈرائنگ روم میں کوئی داخل ہوا ،میں کھڑا ہوگیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا،وہ سادھو ہی تھا۔جس سے ملنے کے لئے میں اس پراسرار ماحول میں آیا بیٹھا تھا۔

"ندیم میاں تمہیں آنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" سادھو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم وملائم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن یہ ماحول......"

"کچھ بھی نہیں اس ماحول کو چھوڑو......تم اپنے حالات کے بارے میں بتاؤ ایسے ہی تنگ دستی میں زندگی گزارنا چاہتے ہو یا کبھی اس غربت زدہ ماحول سے نکل کر کوٹھی اور اپنا بینک بیلنس اور نوکر چاکر بھی دیکھنا چاہتے ہو۔" اس سادھو نے میری بات کاٹ کر سسپنس زدہ لہجے میں کہا تو کوٹھی، بینک بالنس اور نوکروں کا سن کر میرا دل زور سے دھڑکا کیونکہ ان سب کی خواہش تو ہر کسی دنیادار انسان کو ہوتی ہے سادھو کی بات ختم کرنے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس کی آواز نے مجھے خیالات سے باہر نکالا۔

"اب سوچوں میں گم رہنے کا وقت نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے یہ سب حاصل کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔"

"جی ہاں......لیکن......اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا۔" میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

"کچھ اتنا بڑا کام نہیں بس ہر اتوار کی رات، اسی کوٹھی میں کچھ دیر کے لئے انجوائے کرنے کے لئے آنا ہوگا۔"

اس کے بعد سب معاملات جیسے خود ہی طے ہوتے چلے گئے اس کوٹھی میں ہر اتوار کی رات میرے جیسے اور بھی کچھ لوگ ہوتے ،ناچ گانے ہوتا شراب ہوتی ،عیاشی ہوتی ،ہم سب لوگوں کے چہرے پر نقاب ہوتے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

اب میری اپنی بڑی سی کوٹھی تھی نوکر گاڑیاں، دو فیکٹریاں اور کروڑوں کا بینک بیلنس بیوی بچے اب مجھ سے بہت خوش تھے میں پہلے بھی کبھی کوئی نماز پڑھ لیتا تھا لیکن اس کے بعد تو میں مسجد کے سامنے سے بھی نہیں گزرتا تھا مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ میرا ہے اور اس کے بدلے میں سادھو نے ابھی تک مجھ سے کوئی کام نہ لیا تھا۔

اور پھر ایک اتوار کی رات میرے اس کوٹھی میں پہنچتے ہی مجھے سادھو کے سامنے لے جایا گیا جہاں اس نے مجھے ایک گلاس کسی سرخ مشروب کا پلایا جس کا ذائقہ انار جیسا تھا لیکن اس میں سے ہلکی ہلکی سی سڑاند کی بدبو آرہی تھی۔

"سناؤ بھائی ندیم کیسا لگ رہا ہے اب یہ سب کچھ حاصل کرکے۔" کافی دنوں بعد سادھو سے میری ملاقات ہورہی تھی میرے ذہن میں آرہا تھا کہ اب مجھے بھی کچھ کرنے کا وقت آگیا ہے۔

"میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔"

"نہیں شکریہ نہیں بس تم مجھے اچھے لگے، میں نے سوچا کہ تم مشکل میں ہو تمہیں اس مشکل سے نکال کر اپنا دوست بنالوں۔" میں سادھو کی بات کے جواب میں خاموش ہی رہا۔

"ہاں اب ایک چھوٹا سا کام ہے اگر تمہارا من چاہے تو۔"

"کیوں نہیں آپ کے لئے تو میں ہر کام کرسکتا ہوں۔" میں نے چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی۔" سادھو نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور میں نے سر کو ہلا دیا۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں......تو پھر وہ چھوٹا سا کام یہ ہے کہ مجھے ایک لاش چاہئے۔" سادھو کی بات سن کر میں اندرونی طور پر لرز کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

"کیا اس نے آپ سے لاش مانگ لی۔" میں نے اس بزرگ سے جلدی سے کہہ دیا۔

"ہاں فہیم میاں یہ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے نظام

پر ہی تو چل رہی ہے۔" اسی وقت اذان کی آواز سنائی دینے لگی جسے سن کر میں چونک اٹھا اس آدمی کی کہانی سنتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور وہ بھی کچھ تھک سا گیا تھا اتنی دیر میں اس کا مریضوں والا کھانا آ گیا اور میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا کہ "اب کھانا کھا کر آپ آرام کریں میں شام کو آؤں گا۔" میں وہاں سے اٹھ کر باہر کھانا کھانے کے بعد آوارہ گردی کرنے لگا اور پھر شام کی نماز پڑھ کر اسپتال کی طرف چل پڑا کیونکہ میرے ذہن میں ابھی تک وہ کہانی چکرا رہی تھی۔

اسپتال پہنچتے ہی اعتزاز سے تھوڑی دیر گپ لگا کر میں اس بزرگ ندیم کے پاس کمرہ میں چلا گیا، وہ بھی جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ شروع میں اس نے جب تعارف کرایا تھا تو میں نے بھی اپنا نام بتایا تھا اسی لئے وہ مجھے فہیم میاں کہتا تھا، شام کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا کیونکہ میں نے بھی ایک لڑکے سے کھانا ادھر ہی منگوالیا تھا۔

"تو فہیم میاں اس سادھو نے مجھ سے ایک لاش لانے کو کہا۔" اس بزرگ نے کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔

"لاش بھی ایسی کہ جو انسان اپنی موت مرا ہو اور اس کے جسم پر ہلکا سا بھی زخم کا نشان نہ ہو...... میں نے سوچا کہ انکار کر دوں لیکن میں انکار نہ کر سکا اور پھر وہ لاش جو کہ لانی تھی میں نے خود بھی بغیر کسی کی مدد کے بہت مشکل سے مردہ خانے اور قبرستانوں کے چکر لگاتے لگاتے ایک لاش حاصل کی اور لا کر سادھو کے حوالے کر دی اور اس کے بعد ایک ماہ تک اور کوئی کام نہ پڑا۔

ایک ماہ بعد سادھو نے ایک ایسی چیز مانگی جس نے مجھے حیران کر دیا لیکن وہ چیز بھی میں نے اپنی بیوی کی مدد سے لا کر اسے دی۔ کیونکہ اس چیز کے لئے ایک عورت مدد کر سکتی تھی اس نے مجھ سے ایک پردہ دار عورت کے سر کے کچھ بال مانگ لئے اور یہ کام ایک عورت ہی کر سکتی تھی، میری بیوی نے یہ کام آسانی سے کر لیا کیونکہ وہ کبھی کبھار فیشن کے لئے ایک پڑھی لکھی عورت کے پاس درس سننے جاتی تھی۔

میں بزرگ ندیم کی کہانی سن کر حیران تھا زندگی عیاشی میں گزر رہی تھی کہ ایک رات مجھے سادھو کی طرف سے حکم ملا کہ نئی ہونے والی آبادی کے ساتھ ایک چھوٹا سا جنگل تھا مجھے وہاں عصر کے فوراً بعد پہنچنا تھا اور پھر میں وہاں پہنچ گیا میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میں ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا، کچھ دیر بعد سادھو اکیلا پیدل مجھے آتا نظر آیا اس کے چہرے پر ایک پراسراری مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

"گھبرائے گھبرائے لگتے ہو۔" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

میں نے ناں میں سر ہلایا۔

"اچھا تو آج تمہیں تھوڑا سا بڑا کام کرنا ہے۔"

مجھے اسی وقت ایک نرم و شفیق آواز سنائی دی۔ "اے نادان انسان یہ تم کس راستے پر چل نکلے ہو یہ راستہ تو سراسر تباہی کی طرف جاتا ہے۔" میں نے پلٹ کر اس آواز کی سمت دیکھا جہاں ہمارے علاقہ کے مشہور علامہ صاحب سفید کرتا پاجامہ پہنے سر پر پگڑی رکھے کھڑے نظر آئے۔ علامہ صاحب کے ہاتھ پر بہت سے غیر مسلم مسلمان ہو رہے تھے مجھ سے بات کرتے ہی انہوں نے اس سادھو کی طرف جلالی نظر سے دیکھا۔ "تم خود تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو اب ایسے کچے سہارے ڈھونڈنے لگے ہو۔" علامہ صاحب کی آواز جیسے پورے جنگل میں گونج اٹھی اور مجھے نیند سی آنے لگی۔

"علامہ یہ تمہارا وقت ہے کر لو جو کچھ ہو سکتا ہے جب ہمارا وقت آئے گا تو ہم دیکھ لیں گے۔" سادھو نے اکڑتے ہوئے کہا اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔

علامہ صاحب ادھر ہی متوجہ تھے کالے بادل آئے ہوئے تھے مجھے لگا کہ میرے عین پیچھے کوئی کھڑا ہو اسی وقت میرے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"علامہ کو قتل کر دو۔ علامہ کو قتل کر دو۔" اس آواز کی گونج دماغ کو جھنجھوڑ رہی تھی لیکن میرا سر ناں میں ہل رہا تھا۔

اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی میرے ہاتھ میں اچانک ایک رائفل آ گئی مجھے خود سمجھ نہیں آیا کہ وہ رائفل کہاں سے آئی، بس مجھے اتنا یاد ہے کہ اس کا رخ علامہ صاحب کی طرف تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا، جب علامہ صاحب میری طرف پلٹے تو میری انگلی نے ٹریگر کو دبا دیا۔ ''ڈز'' کی بھیانک آواز سنائی دی یہ کہتے ہی اس نے ہمارے اوپر ایک چکر لگایا اور پھر اچانک وہ غائب ہو گیا اس کے غائب ہوتے ہی اس کے دونوں چیلے بھی غائب ہو گئے اور اس جگہ میں اور علامہ صاحب کی لاش رہ گئے۔

سادھو اور اس کے چیلو کے غائب ہوتے ہی مجھے اس خطرناک حقیقت کا احساس ہوا کہ علامہ صاحب کا میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے، میرا دماغ چکرانے لگا۔ رائفل ادھر ہی پھینک کر میں جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ میں غائب دماغ پھرتا رہتا تھا لیکن کبھی کبھی ٹھیک ہو جاتا تھا اور اس وقت میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا رہتا جب کبھی میں ہوش میں ہوتا تو میرا دل کرتا کہ کسی گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لوں، کتنی ہی دفعہ میرا ایکسیڈنٹ ہوا لوگ تو مجھے زخمی چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے لیکن میں مرتا نہیں تھا، شاید قدرت کی طرف سے میری یہ سزا ہے اور تم نے تو مجھے اسپتال میں ایڈمٹ کروا لیا اور خدمت بھی کر رہے ہو جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں۔''

ندیم کی طویل کہانی ختم ہوئی تو آدھی رات ہو چکی تھی میرے ساتھ والی کرسی پر اعتزاز آ کر نہ جانے کب بیٹھ گیا تھا ایک ہفتہ تک وہ آدمی اس اسپتال میں ایڈمٹ رہا اس کے بعد میں اسے ایک دوست کے گھر جو کہ ملک سے باہر ہوتا تھا جس کے گھر کی چابی میرے پاس تھی ٹھہرا لیا۔

ان سات دنوں میں مجھے کوئی ڈراؤنا خواب نہ آیا اپنے گھر بھی میں نے اتنا ہی چکر لگایا کہ اپنی ضرورت کا کچھ سامان لے کر دوست کے گھر آ گیا جہاں ندیم صاحب بھی تھے دو دن بعد میں ندیم صاحب کو بھی اپنے ساتھ شاہ صاحب کے پاس لے گیا۔

اور پہلے اپنا وہ خواب سنایا جس میں کہ مجھے تین نقاب پوش عورتیں اور دو نقاب پوش مرد اٹھا کر ایک آگ کے بڑے سے الاؤ میں پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے بیچ ایک مجذوب سا آدمی آ جاتا ہے جس کے آنے کی وجہ سے وہ سب مجھے آگ کے الاؤ میں نہیں پھینک سکتے۔

اس کی تعبیر شاہ صاحب نے یہ بتائی کہ میرے سوتیلے مجھے جان سے مارنا چاہتے ہیں لیکن اس رات چونکہ ندیم صاحب کا میرے ہاتھوں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اسی لئے میں گھر نہ جا سکا تو خواب میں نظر آنے والا وہ مجذوب یقیناً ندیم صاحب ہی تھے، اگر اس رات مجھ سے ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو میں شاہ صاحب سے مل کر گھر چلا جاتا پھر نہ جانے پھر کیا ہوتا، اس کا مطلب تھا کہ ندیم صاحب میرے لئے ایک نجات دہندہ تھے کیونکہ اس کے بعد میں نے اپنا سارا استعمال کا سامان دوست کے گھر رکھ دیا اور ندیم صاحب کے ساتھ اس دوست کے گھر میں رہنے لگا مجھے نہ تو زمین کا لالچ تھا اور نہ ہی اپنے حصہ کا تو پھر میں کیوں ان چیزوں کے لئے اپنی جان گنواتا۔ شاہ صاحب نے ندیم صاحب کی کہانی بھی سنی اور تاسف سے کہا۔

''آپ نے بہت بڑا گناہ کیا ہے...... لیکن اللہ معاف کرنے والا ہے اپنے ایمان کی تجدید کرو اور اللہ سے خوب گریہ زاری کے ساتھ معافی طلب کرو اور کوشش کرو کہ اب کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔''

زندگی بہت ہی تلخ حقیقت ہے اس میں نہ جانے کتنے ہی اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں لیکن ہمیں امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے اور اللہ کی طرف ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے جس نے پیدا کیا ہے وہ رزق بھی ضرور دے گا کیونکہ اس کا وعدہ اس نے خود کیا ہے۔



خوفناک رات

گلاب خان سولنگی۔کراچی

نوجوان سے سامنے والا گویا ہوا، دیکھو مسافر دنیا میں بہت سارے اسرار اور بہت سارے رموز موجود ہیں جس کو کہ انسانی عقل دیکھنے سے حیران ہے مگر ان اسرار کا بغور جائزہ لینا چاہئے۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی عجیب وغریب دہشت ناک کہانی

ٹریفک بری طرح سے جام تھا، پورا رستہ گاڑیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اوپر سے سخت بارش نے ہمارا موڈ بہت زیادہ خراب کردیا۔

میں ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور اپنا بڑا ہیوی ٹرک جوکہ سامان سے لدا ہوا تھا کراچی سے لاہور لے کر جارہا تھا میری گاڑی ضلع نوشہروفیروز میں ہائی وے پر بری طرح پھنس چکی تھی بارش کی وجہ سے ٹائم کا پتہ نہیں چل رہا تھا غالباً مغرب کا وقت تھا میں نے گاڑی سے اتر کر پتا کیا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا سا پل تھا جس کے گرنے کی وجہ سے آگے سے راستہ بند ہے۔ جبکہ راستہ کلیئر ہونے میں کافی وقت لگ سکتا ہے میں نے مقامی ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔

''بھائی صاحب مجھے لاہور جلدی جانا ہے اور میرے ٹرک میں انتہائی قیمتی سامان موجود ہے جس کی

ڈیلیوری میں نے کل صبح ہر حالت میں کرنی ہے اگر آپ کی دانست میں کوئی متبادل راستہ ہے تو بتادیں؟"

وہ بولا۔"سائیں او ویسے تو یہاں نوشہرو فیروز سے سکھر تک کا فاصلہ تین گھنٹے کا ہے اور پھر سکھر سے پنجاب کے لئے ہائی وے موجود ہے۔آپ اس طرح کریں کہ یہاں سے ایک لنک روڈ نکلتا ہے جو کافی طویل اور پر خطر ہے راستہ ہر طرف سے جنگلی پیڑ پودوں سے گھرا ہوا ہے اوپر سے ڈاکوؤں کا بھی خطرہ موجود ہے۔اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو بیشک آپ جاسکتے ہیں ویسے میرا تو مشورہ ہے کہ آپ راستہ کلیئر ہونے کا انتظار کریں۔"

انتظار ہی تو مجھ سے نہیں ہو رہا تھا سو میں نے فیصلہ کیا کہ اس ویران لنک رو سے ہوتا ہوا میں اپنا سفر جاری رکھوں اور ویسے بھی میرے پاس ایک عدد لائسنس یافتہ پسٹل بھی موجود تھا جو کہ ایسے سفر کے لئے میں رکھتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنا ٹرک وہاں سے نکال کر اس لنک روڈ پر لے آیا جو کافی خستہ حال تھا لیکن مجبوری تھی۔

ہوٹل والے کی بات ٹھیک تھی راستے کے دونوں طرف جنگلی پیڑ پودے کچھ زیادہ ہی تھے۔اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آموں کے باغات بھی نظر آرہے تھے بارش تھم چکی تھی کوئی اکا دکا گاڑی روڈ پر نظر آرہی تھی لیکن رات کافی گزر جانے کے بعد وہ سڑک صحیح معنوں میں ویرانی کا منظر پیش کررہی تھی۔

اچانک میری گاڑی خود بخود رک گئی۔"یا اللہ خیر! اس ویرانے میں ٹرک کو کیا ہو گیا؟" میں ٹرک سے نیچے اترا پیٹرول کی ٹنکی بھی فل تھی جبکہ انجن کا بھی معائنہ کیا وہ بھی ٹھیک تھا۔"تو پھر ٹرک رک کیوں گیا؟"

میں نے کافی کوشش کی لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوا۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔"آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔"اب میں کیا کروں۔؟ یہاں موبائل نیٹ ورک بھی کام نہیں کررہا تھا اور دور دور تک کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی تھی جبکہ ہر طرف صرف جنگل ہی جنگل نظر آرہا تھا۔

میں کافی دیر سوچتا رہا میں نے گاڑی لاک کردی اور کسی مدد کے لئے ایک طرف چل پڑا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مترادف شاید کوئی بندہ مل جائے جنگل اتنا گھنا نہیں تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے کافی بھیانک لگ رہا تھا کبھی کبھار جنگلی گیدڑوں کی چیخ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی میں کنفیوژ تھا، مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔

آخر کار چلتے چلتے مجھے امید کی کرن نظر آ ہی گئی ایک بوڑھا شخص آم کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا میں نے جلدی جلدی سے اسے سلام کیا اس نے میرے سلام کا جواب تو نہیں دیا لیکن اپنی بوڑھی آنکھوں سے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔"کون ہو اور کہاں جانا ہے؟"

میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنسنے لگا جیسے کہ میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو میں خاموشی سے اس کی ہنسی سنتا رہا۔

"ٹرک رکا نہیں ہے بلکہ اسے روکا گیا ہے۔"

میں بوڑھے شخص کی بات سن کر چونک پڑا۔

"میں سمجھا نہیں بابا!"

مجھے حیران دیکھ کر وہ گویا ہوئے۔"آؤ میرے ساتھ لیکن خبردار! مجھ سے فاصلے سے چلنا دیکھتا ہوں، ہم آپ کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔"

میں بوڑھے سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔اس نے پورے راستے کوئی بات نہیں کی، چلتے چلتے ہم کافی دور نکل آئے اب ہمارے سامنے ایک شاندار حویلی تھی وہ بوڑھا رکا اور حویلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"یہ رہی آپ کی منزل، حویلی کے اندر ایک آدمی آپ کو ملے گا، آپ اپنی مجبوری اسے بیان کیجیے گا، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی مدد ضرور کرے گا۔"

میں نے حویلی کا بغور جائزہ لیا"شکریہ بابا۔"

میں بابا کی طرف مڑا ہی تھا لیکن بابا کو وہاں نہ پا کر میں شدید حیران ہوا میں نے دائیں بائیں منہ کرکے اسے پکارا لیکن بے سود، نہ جانے وہ اس طرح اچانک کہاں

غائب ہوگیا تھا۔

خیر میں آہستہ آہستہ حویلی کے اندر داخل ہوا ”کوئی ہے......کوئی ہے یہاں پر۔“ میرے پکارنے پر کوئی جواب نہیں آیا وہ کافی پرانی حویلی تھی جس کی در و دیوار اور فرنیچر بوسیدہ اور خستہ حال تھا جبکہ دیواروں پر عجیب وغریب تصویریں چسپاں تھیں۔

حویلی میں مکمل خاموشی تھی اور روشنی کے لئے وہاں پر چند مشعل روشن تھیں، مجھے نہیں لگتا کہ یہاں کوئی ذی روح رہتا ہو تو پھر بوڑھے بابا نے کس کے بارے میں بتایا تھا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں انہیں خیالوں میں گم تھا کہ حویلی کا صدر دروازہ خود بخود بند ہوگیا ”ارے یہ دروازہ کیسے بند ہوگیا۔“ میں نے اسے کھولنے کی کافی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی ڈاکو مجھے ڈرا کر لوٹنے کی کوشش کرے گا اسی لئے میں نے بھی فوراً اپنی جیب سے پسٹل نکالا اور ہاتھ میں لے کر حویلی کی دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر والی منزل میں بھی چار کمرے تھے میں نے باری باری تین کمرے چیک کئے جو کہ خالی پڑے ہوئے تھے۔ جبکہ چوتھے اور آخری کمرے میں مجھے ایک آہٹ سنائی دی جیسے ٹیبل پر نیچے کوئی چیز گری ہو، میں اور بھی زیادہ چوکنا ہوگیا۔ میرے ذہن میں اب تک کسی جن یا بھوت کے وجود کی موجودگی کا اندیشہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ ہم ڈرائیور لوگ پوری زندگی دن ہو یا رات، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

لیکن آج زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انجانے سے خوف کی صدا آرہی تھی میں نے لات مار کر دروازہ کھولا اور پسٹل تان کر اندر داخل ہوا۔ کمرے کے چاروں طرف مشعل روشن تھیں جس کی روشنی میں کمرے میں پڑی ہر شے واضح اور روشن نظر آرہی تھی۔ میرے سامنے ایک بڑا ٹیبل موجود تھا جس کی دوسری طرف ایک کرسی تھی جس پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا جبکہ میرے للکارنے پر بھی اس کا منہ بدستور دوسری طرف تھا۔ ”کون ہو تم؟ ہاتھ اوپر کرو ورنہ پسٹل کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔“ وہ بغیر مڑے بھی جیسے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑے ہی دھیمے لہجے میں مجھے جواب دیا۔

”مسافر بابو! بڑے بے صبر ہو۔ پہلے نوشہرو فیروز ہائی وے پر بے صبری سے کام لیا اور ہوٹل والے کے منع کرنے پر بھی اس ویران لنک روڈ پر چلے آئے پھر بھی صبر نہیں کیا اور گاڑی بند ہونے پر یہاں چلے آئے شاید تم نے سنا نہیں ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ اس کی باتیں سن کر میں شدید حیران ہوا کہ یہ ساری باتیں اسے کیسے معلوم ہوئیں۔ میں نے پھر اسے خبردار کیا کہ تم جو کوئی بھی ہو ہاتھ اوپر کرکے میری طرف دیکھو ورنہ میں گولی چلا دوں گا، لیکن وہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا رہا اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ یہ کوئی انسان نہیں ہوسکتا اور میں نے بھی ٹریگر دبا دیا۔ اس پر فائر کردیا۔

اس وقت مجھے شدید دھچکا پہنچا جب میں نے دیکھا کہ میری کسی بھی گولی کا اس پر اثر نہیں ہوا اور آخر کار وہ کرسی سے اٹھا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا وہ کوئی اور نہیں وہی بوڑھا شخص تھا جو مجھے یہاں تک لاکر غائب ہوگیا تھا۔

”ارے بابا آپ! مجھے یہاں چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے تھے اور معاف کرنا میں نے انجانے میں آپ پر گولی چلائی۔“

وہ مجھے پریشان دیکھ کر بولے۔ ”دیکھو مسافر! اس دنیا میں بہت سارے اسرار اور بہت سارے راز موجود ہیں! تم کو یاد ہے یہاں آتے وقت میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے فاصلہ رکھو دراصل تم خاکی مخلوق ہو اور میں ناری۔ میں ایک مسلمان جن ہوں اگر تم مجھے اصلی حالت میں دیکھ لیتے تو یقیناً ڈر کے مارے تمہارے دل کی دھڑکن بند ہوجاتی اسی لئے میں نے انسانی صورت اختیار کی اور تمہاری رہنمائی کی۔“

میرا خوف اب ختم ہوچکا تھا۔ ”بابا میں بھی تو ایک مسلمان ہوں تو پھر یہ حویلی۔“

وہ بیچ میں بول پڑے۔ ”مسلمان ہو تب ہی

تو زندہ سلامت کھڑے ہو، ورنہ میری جگہ اگر کوئی لادین جن ہوتا تو تمہارا انجام مختلف ہوتا۔" وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے ایک رومال مجھے دیا جس سے میں نے اپنا پسینہ پونچھا دراصل تمہاری دنیا کی طرح ہماری بھی دنیا ہے جو تم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ جس وقت تمہارا ٹرک تیز رفتاری سے آ رہا تھا، اس وقت وہاں سے ایک جن کا جنازہ گزر رہا تھا۔ اسی لئے تمہارا ٹرک خراب ہوگیا اور وہ جنازہ وہاں سے گزر گیا لیکن تم کو وہ سب نظر نہیں آیا اور لاکھ کوشش سے بھی تمہارا ٹرک اسٹارٹ نہیں ہوسکا اور تم مدد کے لئے یہاں آئے اور تمہاری ملاقات مجھ سے ہوگئی۔"

باتوں باتوں میں نہ جانے کہاں سے دو شربت کے گلاس نمودار ہوئے بزرگ جن نے ایک گلاس مجھے تھماتے ہوئے فرمایا۔ "نوش کیجیے یہ حلال شربت ہے۔"

اس شربت کا ذائقہ اور مٹھاس آج تک میں نہیں بھول پایا۔ بزرگ جن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہر مشکل کے بعد آسانی ہے، لیکن انسان اور جنات بہت ناشکرے ہیں، بہت کم لوگ صبر اور شکر سے کام لیتے ہیں۔" بزرگ جن کی باتیں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔

وہ کافی علم والا جن تھا، سو میں نے بھی موقعہ غنیمت جان کر چند سوالوں کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے مسکرا کر مجھے کہا۔ "پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔"

میں شربت پی چکا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے اس سے نجی سوال پوچھا۔

"میرا بیٹا M.A پاس ہے، لیکن بے روزگار ہے، اسے نوکری کب ملے گی؟"

اس نے دلچسپی سے میرا سوال سنا اور کہا۔ "جس ملک میں رشوت، سفارش یا پرچی پر نوکریاں بکتی ہیں وہاں تم جیسے غریب کو نوکری نہیں ملتی۔ اپنے بیٹے کو کسی دوسرے ملک کا ویزہ بنا کردو۔"

بزرگ جن کا جواب سن کر میں پریشان ہوگیا میں نے دوسرا سوال پوچھا۔ "میرے سسر کافی دنوں سے بیمار ہیں، لیکن کوئی بھی دوا ان پر اثر نہیں کر رہی وہ ٹھیک کب ہوں گے؟"

اس مرتبہ وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "جس ملک میں اکثر ڈاکٹر اور دوائیاں نقلی ہوں ایسے میں غریب مریض کہاں جائیں تمہارے سسر چند دنوں میں فوت ہوجائیں گے۔" جواب سن کر مجھے شدید صدمہ پہنچا، مجھے تشویش میں دیکھ کر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"اب تم آخری سوال پوچھ سکتے ہو؟ لیکن وہ نجی نہ ہو بلکہ سیاسی ہو۔"

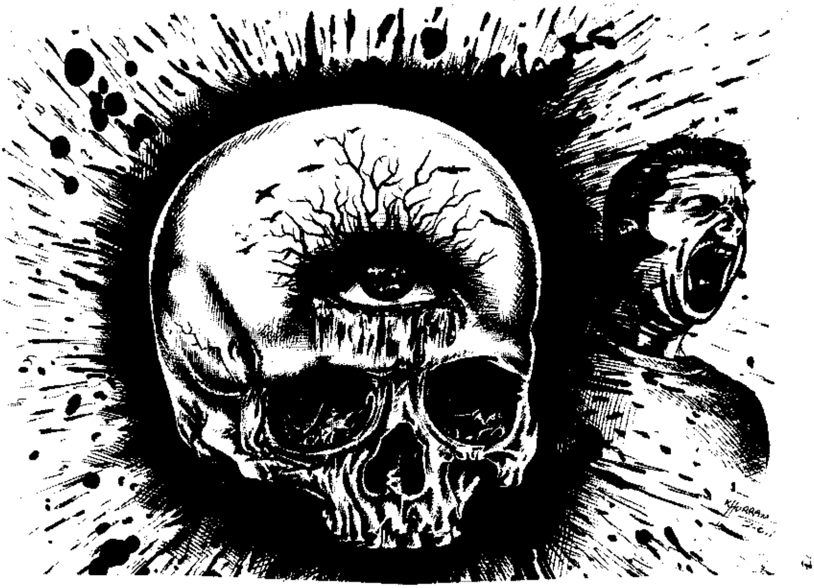
مجھے تو شروع سے سیاست میں دلچسپی نہیں تھی پھر بھی با دل نخواستہ میں نے سوال کیا۔ "کیا ہمارے ملک کے حالات اسی طرح چلتے رہیں گے؟"

میرا سوال سن کر پہلے تو وہ مسکرایا، پھر بولا۔ "اب تم نے کام کا سوال پوچھا ہے تو سنو، جس دن عوام نے ایسے لوگوں کو چنا جو حضرت عمرؓ کی طرح اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھیں اور اپنے آپ کو احتساب کے لئے پیش کریں گے تب ہی تمہارے ملک کے حالات ٹھیک ہوسکتے ہیں ورنہ اسی طرح چلتے رہیں گے۔"

آخری سوال کا جواب سن کر ہم دونوں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے تھوڑے توقف کے بعد وہ اٹھا اور کہا۔ "اب تم جاسکتے ہو میری عبادت کا وقت ہوچکا ہے اور ہاں تمہارا ٹرک ٹھیک ہوگیا ہے اب تم بلاخوف وخطر اپنی منزل تک جاسکتے ہو۔"

فجر کا وقت ہوچکا تھا جانے سے پہلے میں نے بھی اس کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔

ٹرک تک پہنچتے پہنچتے صبح ہوچکی تھی بڑی آسانی سے ٹرک اسٹارٹ ہوگیا جیسے وہ خراب ہی نہیں ہوا تھا اور پھر میں رات والے واقعات پر غور کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔



انگوٹھی

احسان الحق

اچانک دلدوز کان پھاڑنے والی چیخ سنائی دی، جسم کے پرخچے اڑ گئے اور سارے قرب و جوار میں بکھر گئے، درد ناک اور اذیت ناک چیخیں قرب و جوار کو دہلا گئیں اور پھر......

زیادہ، زیادہ اور بہت زیادہ دولت کے دلدادہ ایک شخص کی عبرت ناک حالت زار

میرا نام بنیامین ہے اور میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بات دکھ کے ساتھ بتانی پڑ رہی ہے کہ میرے والدین اس وقت اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے، جب میری عمر فقط سات سال کی تھی۔ ان کے اس جہان سے جانے کے بعد میرے اکلوتے چچا نے میری پرورش اپنے ذمہ لے لی تھی۔ چچا نے بہت بعد میں شادی بھی کر لی تو میری چچی نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ انہوں نے بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ایک یتیم مسکین بچہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا ابھی چچا اور چچی کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عجب منشاء تھی کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ لیکن اس بات کو بھی دونوں میاں بیوی نے کبھی دل پر نہ لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میری موجودگی کے سبب انہیں کبھی بے اولادی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

میرے لئے بھی چچا اور چچی ہی والدین کا درجہ رکھتے تھے مجھے اپنے والدین بخوبی یاد تھے میرے چچا میرے والد کے ہم شکل ہی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ان کی کمی دنیا میں کبھی کچھ خاص محسوس نہیں ہوئی، ہاں البتہ مجھے اپنی امی کی صورت اچھی طرح یاد ہے ان کی کمی میں اکثر بطور ایک علیحدہ وجود ہونے کا محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آیا کرتی تھیں ان دونوں کی موت ایک حادثے میں ہوئی اس دن وہ مجھے چچا کے پاس چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ غالباً وہاں کسی کی فوتگی ہوئی تھی۔ ابو نے کہا تھا کہ بنیا مین تمہیں چچا کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ بچوں کا ایسے موقع پر کام نہیں لہٰذا مجھے گھر پر ہی رہنا چاہئے۔ اور چچا جان بھی ہمارے ساتھ ہمارے ہی گھر پر رکے تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کیا کرتے تھے جبکہ ابو جان ایک نامی گرامی تاجر تھے وہ سونے کا کام کیا کرتے تھے۔ صرافہ بازار میں ان کی ذاتی ایک دکان تھی۔ یوں میرے والد صاحب کافی دولت مند تھے۔ پھر اس رات، رات کے گیارہ بجے کے قریب پولیس والوں نے جب گھر آ کر بتایا تھا کہ حادثہ پیش آ گیا ہے تو چچا جان مجھے ہمسایوں کے پاس چھوڑ کر اسپتال سے میرے والدین کی بے جان لاشیں لئے گھر لوٹ آئے تھے۔ محلے میں اس وقت کہرام مچ گیا تھا، سب ملنے والوں کو خبر کی گئی تو اگلے روز ہمارے گھر میں ایک دنیا کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔

اب مجھے اٹھارہ سال کا ہوئے پورے چار دن گزر چکے تھے اور چچا جان نے مجھے اپنے مطالعہ والے کمرے میں تنہا بلایا تھا، میں اب ایف، اے کر چکا تھا اور آگے بی، کام کرنے کی تیاریوں میں مجھے مشغول ہونا تھا۔ میں جب چچا جان کے مطالعہ والے کمرے میں داخل ہوا جہاں انہوں نے تین دیواروں پر بڑی سی الماریاں بھی رکھی ہوئی تھیں جن کے خانوں میں کتب کو انتہائی نفاست کے ساتھ سجا رکھا تھا چونکہ میرے چچا مطالعے کے شوقین تھے اسی لئے گھر میں بھی انہوں نے نہایت ادبی ماحول رکھا ہوا تھا مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پیار اور نرمی سے کہا۔ ”آؤ بیٹا! مجھے آج تم سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں خاموشی سے سر جھکا کر پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بیٹا! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے امی ابو ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے اور آپ کے ابو ایک نامی گرامی تاجر و صراف تھے۔ ان کی دولت اور دکان سب کچھ ان کے مرنے کے بعد میری ذمہ داری میں آ گیا تھا یوں آپ اٹھارہ سال کے ہو چکے ہیں اس لئے میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ کو ان کا کل ورثہ واپس کر دوں یہ فائل ہے۔ اسے اچھی طرح سے پڑھ لینا کچھ دنوں کے بعد دونوں باپ بیٹا مل کر اس پر کام کریں گے۔“

میں نے میز پر سے وہ فائل اٹھالی جو صفحات میں کافی بھاری تھی۔ ”جی ابو جی!“ میں چچا کو ابو جی ہی کہتا تھا وہ فائل ہاتھ میں تھام کر میں سیدھا اپنے کمرے میں واپس آ گیا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر وہ فائل پڑھنا شروع کی تو اس میں میرے مرحوم ابو جان کی کل جائیداد کے کاغذات تھے۔ ساتھ میں دکان، زمینوں، زیورات، نقدی کی مقدار کا تمام حساب کتاب اس میں درج تھا۔ میں نے جب تخمینہ لگایا تو ابو جان کی فوتگی پر ان کی جائیداد کی کل مالیت ڈیڑھ کروڑ تھی جبکہ اب وہ پورے دس کروڑ کی ہو گئی تھی۔ نقدی کو تو بینک میں ڈپازٹ کی وجہ سے ضربی پر لگ گئے تھے گیارہ سال قبل جمع کروایا سو روپیہ آج کے آٹھ سو یا ہزار روپے کے برابر ہو چکا تھا۔ ان گیارہ سالوں میں میرے چچا جان نے ابو جی کی جائیداد میں سے ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر یا مجھ پر نہیں لگایا تھا۔ میں نے وہ فائل بند کر دی تھی آنکھوں میں اشک اس بات کی غمازی کر رہے تھے۔ میں افسردگی کے عالم میں رو رہا تھا میں بستر پر دراز ہو کر چت سیدھا لیٹ گیا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ ان گیارہ سالوں میں مجھ پر چچا جان نے بے دریغ پیسہ لگایا تھا کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی مگر اتنی بڑی جائیداد اور نقدی کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ایک روپیہ بھی

ابو جان کی چھوڑی میرے لئے وراثت سے کلیم نہیں کیا تھا اور آج جبکہ میں بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا تھا تو وہ یہ سب مجھے تھما کر بری الذمہ ہو جانا چاہتے تھے میرے دل میں نہ جانے ایک عجیب سی کسک نے جنم لیا تھا میرا جی کر رہا تھا کہ اب میں اپنے ان منہ بولے والدین کے لئے ضرور کچھ کروں جنہوں نے یوں بے لوث ہو کر میری تعلیم وتربیت پر بے دریغ خرچ کیا تھا۔ نہ صرف خرچ ہی کیا تھا بلکہ جب جب میں بیمار ہوتا یا مجھے ان کی ضرورت ہوتی یہ میرے سر پر سایہ رحمت بن کر اسی آن حاضر رہا کرتے تھے یہی تمام خیالات اپنے قلب کے پنہاں گوشوں میں سمیٹتے ہوئے مجھے نیند آ گئی تھی اور میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر سو گیا تھا۔

☆......☆......☆

تھوڑے دنوں کے بعد مجھے بی کام میں داخلہ مل گیا تھا۔ میں نے کالج آنا جانا شروع کر دیا تھا چچا جان نے کاغذات پر دستخط کروا کر ساری قانونی کارروائیاں نپٹا دی تھیں انہوں نے اپنی طرف سے بھی بیس لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے تھے۔ ساتھ میں انہوں نے مجھ سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ میں اپنی پڑھائی کے ساتھ کسی طور سے سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انسان کے پاس چاہے لاکھ دولت ہو جائیداد کا انبار لگے ہوں لیکن اصل دولت جو ہوتی ہے علم ہوتا ہے انہوں نے مجھے یہ یاد کروایا تھا کہ انسان کا اصل زیور تعلیم ہے اور اصل دولت علم ہے اور علم وہ دولت ہے جو ہم سے کوئی چرا نہیں سکتا، چھین نہیں سکتا۔ میں نے بھی اپنے باپ سمان چچا سے اس بات کا عہد کر لیا تھا کہ میں کسی قیمت پر بھی تعلیم نہیں چھوڑوں گا۔

بی کام کے پہلے سال ہی میری ملاقات نئے دوستوں سے ہوئی جن میں عقیل، وسیم سرفہرست تھے۔ ایف اے کے دوست تقریباً نہ ہونے کے برابر ہو چکے تھے۔ کچھ نے ملازمتیں اختیار کر لی تھیں اور کچھ بی اے کرنے لگ گئے تھے جبکہ کچھ پڑھائی چھوڑ کر محنت مزدوری کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جو لوگ بی اے کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ محض اسناد حاصل کر کے ایم اے کر لیں گے یا کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں انہیں کوئی عام سی نوکری مل جائے گی۔

جو لوگ پڑھائی چھوڑ کر کاروبار کے معاملات میں الجھ گئے تھے ان میں سے اکثر کی کوئی نہ کوئی گھریلو مجبوری آڑے آ گئی تھی یا پھر پیسے کی ہش بش نے وقت سے پہلے انہیں اپنی جانب کھینچ ڈالا تھا۔ وہ لوگ جو تعلیم یکسر چھوڑ بیٹھے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن کی انگریزی جیسے مضمون میں کوئی اٹک گئی تھی یا جنہیں کسی مضمون میں فیل کر دیا گیا تھا اور دوسری قسم ان عامیوں کی تھی جو بے چارے ازل سے تعلیم کو ایک بوجھ سمجھ بیٹھے تھے۔ شاید والدین اور معاشرے سے وقتی طور پر جان چھڑانے کے لئے یا شیخیاں گپیں مارنے کی غرض سے لوگوں کو جتلانے کے لئے کہ ''جی! ہم بھی پڑھ رہے ہیں۔'' اپنے ساتھ زندگی بھر کا عظیم ترین مذاق کر رہے تھے۔ جو مستقبل قریب میں انہیں اور ان جیسوں کو بہت مہنگا پڑنے والا تھا وقت کی بہتی دھارا کتنی ظالم ہوتی ہے شاید ان جیسے ''افلاطون'' کی مری ہوئی عقل کے احاطہ میں فی الوقت یہ بات نہیں سما رہی تھی۔ وہ محض وقت گزاری کر رہے تھے اور آوارہ ہی پھر رہے تھے۔ اس کے برعکس بہت کم لیکن ہنوز معاشرے میں ایسے باپ بھی موجود تھے جو اچھے بھلے قابل بچوں کو آگے پڑھانے کے روادار نہ تھے۔ وجہ اس کی جو بھی رہی ہو لیکن اگر وطن عزیز میں نظام درست ہوتا تو حکومت اپنے ایک ایک شہری پر نگاہ رکھتی اور اس انسانی وسیلے Human Resourse کو ضائع نہ ہونے دیتی۔ لیکن حکومتی سیاست دانوں کو اپنی پیٹ کی دوزخ اتنی گہری تھی کہ سرکاری خزانے سے وہ بھی نہ بھرتی تھی۔ وہ اس اہم ترین شعبے پر کیا نگاہ رکھتے۔

☆......☆......☆

''یار! آج کلاس روم میں میرا دل سڑ گیا۔'' ناصر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ میں عقیل اور وسیم بھی برا سا منہ بنا کر کھڑے تھے۔

"اب دیکھو نا! اسر نے کتنے آرام سے کہہ دیا ہے کہ ہم تعلیم کے شعبے پر نوٹ لکھ کر لائیں گے۔ اعداد و شمار بھی ہمیں خود ہی بتلا دیئے۔" وسیم نے بھی برا سا منہ بنا کر کہا جس پر میں نے اس سے کہا۔" یار! فارمولیٹی ہی ہے نا! اب اتنے بھی محب وطن بننے کی ضرورت کیا ہے کاغذ کا ٹکڑا لینا ہے ہمیں، بی کام کی سند ملنی چاہئے ہمیں..... اور ہمیں کیا چاہئے۔"

"میں تو یہ کاغذ کا ٹکڑا ضرور لوں گا بھائیو! چاہے اس ٹکڑے کی وطن عزیز میں کوئی قدر و قیمت ہو یا نہ ہو یہ کاغذ کا ٹکڑا تو میں لے کر رہوں گا۔" عقیل نے سینہ تان کر کہا۔"باقی کام میرے ابو کا ہے وہ کریں گے میری سفارش اور مجھے لگا دے گا کسی نہ کسی راہ پر۔"

"ابے تیرا ابا تو تجھے لگا دے گا۔ باقی آبادی میں کتنے ابو ہوں گے جو اپنے سپوتوں کو سفارش کر کے لگائیں گے میرا تو ابا کہتا ہے کہ بی کام کے بعد کلرکی کر لینا وہ تو ابھی سے ہی اپنے کسی دوست سے بات کر کے چین کی نیند سو رہا ہے۔" وسیم نے اس کی بات پر کہا تھا۔

"اور میرے تو ابو جی کہتے ہیں کہ بی کام کے بعد ایم بی اے کرنا پڑے گا۔ نا جانے اور کتنا مجھے پڑھنا پڑے گا۔" ناصر نے اپنا منہ لٹکا کر کہا تھا اور میں ان کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ مجھے تو بس اپنے چچا جان اور چچی جان کو ہر حال میں خوش کرنا تھا۔ انہوں نے جو کرم و احسانات میرے اوپر کیے تھے، میں ان کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا کہ چچا جان اور چچی جان نے میری شخصیت کو مکمل کرنے کی غرض سے جو مجھ پر وقت اور اپنا پیسہ لگا کر محنت کی تھی اب کچھ عرصہ بعد میں انہیں دل و جان سے راضی کرنے کی نیت باندھے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دنیا، یہ ملک، یہ لوگ، مجھے کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ کون کیا کر رہا ہے؟ کیا سوچ رہا ہے؟ کس ڈھنگ میں سوچ رہا ہے؟ میں تو فقط ایک بات جانتا تھا کہ میری ذات کا محور صرف میرے چچا جان اور چچی جان تھے۔ وہ میرے بزرگ تھے اور میرے موجودہ والدین، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اب وہی میرے والدین تھے تو یہ بھی غلط نہ تھا۔

تھوڑی دیر ہم دوست یونہی کھڑے باتیں کرتے رہے اور پھر ہم اپنے اپنے گھروں کی جانب لوٹ آئے۔ میں جب گھر لوٹا تو چچی جان نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔"بی کام میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آ رہی بیٹا! تمہارے ابو بھی پوچھ رہے تھے۔ اگر مشکل ہے تو ٹیوٹر رکھوا دیں گے۔"

میں نے امی جان کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں امی جان! اللہ کا بڑا احسان ہے۔ آپ والدین کی دعائیں ہیں۔ مجھے سب کچھ سمجھ آ رہا ہے۔"

"بس تمہارے ابو جان فکر مند تھے۔ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی انہوں نے مجھ سے کہا کہ بچے سے پوچھ لینا۔ کیونکہ ایف اے میں اس کے مضامین اور تھے اور اب تو بالکل ہی بدل چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہے کوئی مشکل ہو تو فوری بتانا۔"

"میں اپنی پڑھائی میں سنجیدگی سے سے وقت لگاتا ہوں تھوڑا تھوڑا کر کے وقت کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہوں امی جان! اس طرح مجھے مشکل نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور آپ کی دعاؤں سے وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔"

"بس بیٹا! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے۔ والدین اولاد کے لئے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

میں زمین پر ہی ان کے قدموں پر بیٹھ گیا۔"امی جی! والدین اولاد کے لئے جو بھی کریں چاہے کسی کی نگاہ میں تھوڑا ہی دکھائی دے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس تھوڑے میں بھی وہ خلوص اور سچی محبت و شفقت ہوتی ہے جو پوری دنیا میں کسی کے بہت کچھ کر دینے سے بھی عیاں نہیں ہوتی۔ بھلا والدین کا نعم البدل بھی پوری کائنات میں کہیں موجود ہے؟"

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔" اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔ ہدایت یافتہ رکھے۔ برکات

سے نوازے۔"

☆......☆......☆

زیورات کی صندوقچی جو میرے والد مرحوم نے میرے نام کررکھی تھی۔ اس وقت چچا جان نے بینک لاکر سے لاکر مجھے میرے ہاتھوں میں تھمادی تھی۔

"بیٹا! یہ کل زیورات ہیں۔ اس میں سونا بھی موجود ہے چاندی بھی موجود ہے۔ میں نے گن لئے ہیں اب تم بھی گن لو۔ اور اس کے بعد اگر بینک لاکر میں واپس رکھنے ہیں تو وہاں رکھ دو ورنہ اگر ان کو بیچ کر نقدی کی صورت میں تبدیل کروا کر اپنے ذاتی بینک اکاؤنٹ میں رکھوانا ہے تو ایسا کرلو۔ مطلب اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے صندوقچی کھول کر وہ تمام زیورات بغور دیکھے ابو کی ہدایت کے مطابق میں نے سب کو کاغذات میں درج تفصیل کے مطابق دیکھ لیا۔ "ابو جان! سب ٹھیک ہے۔"

"بس پھر اب فیصلہ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے کہو گے تو بینک لاکر میں رکھ دیں گے تا کہ بوقت ضرورت کام آجائیں ورنہ اگر تم چاہو تو انہیں فروخت کر کے نقد رقم بینک میں جمع کروا دو جو منافع کے ساتھ تمہیں بڑھ چڑھ کر مل جائے گی۔" اب میں ابو جان سے اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کہ منافع اور سود کا فرق کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے کچھ سوچتے ہوئے چچا جان سے کہا۔ "ابو جان کیا واقعی ان زیورات پر میرا کلی حق ہے؟"

"ہاں بیٹا! یہ بھائی جان نے اپنی عمر بھر میں کمائے تھے اور تمہارے لئے ہی کمائے تھے۔"

"کیا میں اپنے مکمل اختیارات سے انہیں استعمال میں بھی لاسکتا ہوں۔"

"ہاں! بیٹا یہ تمہارے ہی ہیں۔"

"پھر میں نے چچا جان کی جانب بہت ادب اور پیار سے دیکھ کر کہا۔" یہ میں آپ کو اور امی جان کو تحفہ کرتا ہوں۔" میری یہ بات سن کر وہ ایک لحظہ کے لئے سکتہ کی حالت میں وہیں پر منجمد کھڑے رہے۔ نہ ان کی صورت میں خوشی کے آثار تھے اور نہ ہی کسی اور طرح کا تغیر میں نے ان کے چہرے پر دیکھا وہ بہت آہستہ سے چلتے ہوئے اپنی مطالعہ گاہ کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ عینک انہوں نے آنکھوں سے اتارلی۔ خاموش ہو کر انہوں نے اپنے دونوں بازوؤں کی کہنیاں میز پر ٹکادی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے دائیں بائیں گال ڈھانپ کر کچھ سوچنے میں محو ہوگئے۔ میں تیزی سے ان کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ابو جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں! ہونہہ!" انہوں نے میری جانب سنجیدگی سے دیکھا ایک پھیکی مسکراہٹ تھی جو ان کے چہرے پر آئی اور آ کر واپس کہیں غائب ہوگئی۔

"پھر آپ کیا سوچ رہے ہیں ابو جی؟" کیا ایک بیٹا باپ کو...... ماں کو اپنے والدین کو تحفہ نہیں دے سکتا۔" انہوں نے میری اس بات پر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل دے سکتا ہے ٹھیک ہے چلو دیکھیں کہ اس صندوقچی میں ہے کیا۔" وہ اٹھے اور پھر اس صندوقچی کو کھول کر اس میں سے ایک نیلے رنگ کی انگوٹھی نکالی۔

"یہ دیکھو بیٹے۔" میں دلچسپی سے اس انگوٹھی اور ابو جان کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ انگوٹھی میں نے بھائی جان کی موت کے بعد ان کی انگلی سے اتارلی تھی اور پھر اس صندوقچی میں ڈال دی تھی تا کہ جب تم اس صندوقچی کی بضاعت کے اہل ہو جاؤ گے تو تمہیں تمہارے باپ کی آخری نشانی بھی مل جائے گی۔" میں نے دیکھا کہ ابو جی یہ کہتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے تھے۔ شاید وہ گیارہ سال پیچھے اس دن کو یاد کر کے رو پڑے تھے جب ان کے بڑے بھائی اپنی جان کی بازی ہار گئے تھے اور یہ تن تنہا ان کا بے جان جسم لینے روانہ ہوئے تھے وہاں انہوں نے میرے حقیقی ابو کی بے جان انگلی سے یہ انگوٹھی نکال لی تھی۔ یہ خیال ہی میرے لئے بڑا اذیت ناک بن گیا۔ میں اپنے چچا کے ساتھ جڑ گیا تھا وہ بھی مجھے اپنے ساتھ یوں جڑا دیکھ کر سنبھل گئے۔ "بیٹا! یہ دیکھو! غور سے! اس انگوٹھی کو ہارڈ

پلاسٹک سے بنایا گیا ہے اس کے اندر آسمانی فیروزے کا پتھر ہے۔ اور یہ پتھر صحیح سے تراشا نہیں گیا۔ فیروزے کے پتھر کو گولائی کی صورت دینے کی بجائے تکون کی صورت دی گئی ہے میرا خیال ہے کہ یہ بھی بھائی جان نے ہی اپنے ہاتھ سے تراشا ہوگا۔ کیونکہ وہ ان قیمتی پتھروں کو با آسانی تراش کر انگوٹھیوں، بالیوں اور ہاروں میں پرونے کا فن جانتے تھے۔ چلو! ایسا ہے کہ تمہاری دل جوئی کے لئے اور اپنے بھائی کی آخری نشانی کے طور پر میں یہ انگوٹھی تمہاری اور بھائی جان کی طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہوں۔" میں نے انگوٹھی کو بغور دیکھا۔ ہارڈ پلاسٹک کی تو کوئی خاص قیمت نہیں تھی۔ اور رہا فیروزے کا وہ چھوٹا سا پتھر۔ اس کی بھی کوئی خاص قیمت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ابو جی نے زیورات اپنی ذات کے لئے لینے سے اس انداز میں مجھے انکار کر دیا تھا میں نے اپنے چہرے پر کسی طرح کا کوئی تاثر قائم نہ کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ابو جی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔" پھر زیورات تو عورتوں کے لئے ہی بنتے ہیں ابو جی! ایسا کرتے ہیں کہ انہیں امی جی کو دے دیتے ہیں۔"

"ہاں! یہ رائے قابل قبول ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ انہوں نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ جیسے ہی انہوں نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی تو باہر آسمان پر بجلی شدت سے کوندی تھی۔ ہم دونوں باپ بیٹا تقریباً ڈر ہی گئے۔ ہم تو چونک ہی اٹھے تھے۔ اور ساتھ ہی آسمان پر بادلوں کے زور سے گرجنے کی آواز سنائی دی۔

"لو! لگتا ہے بارش آنے والی ہے۔" ابو جی نے کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت زور کا بادل گرجا ہے ابو! امی ڈر گئی ہوں گی۔ ہمیں ان کے پاس جانا چاہئے۔ لائیں! میں صندوقچی امی جان کے حوالے کر کے آؤں۔"

"چلو!" یہ کہہ کر دونوں گھر کے بڑے سے مہمان خانے کی طرف آ گئے جہاں امی جان عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے خوف کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے رحمت کی بارش کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ وہ پوری آبادی کی حفظ وامان کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے ہاتھ منہ پر پھیرے اور ہماری طرف متوجہ ہوگئیں۔

"آپ دونوں اس بڑے سے گھر میں خود تو اکٹھے جانے کہاں بیٹھ جاتے ہیں اور مجھ غریب کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔" یہ سن کر ابو جان نے امی جان کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بیگم! یہ دیکھو! تمہارا بیٹا تمہارے لئے تحفہ لایا ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے صندوقچی امی کے قدموں میں رکھ دی۔ ابو جان مسکراتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ امی نے صندوقچی کو حیرت سے دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ میں نے صندوقچی کا اوپر والا ڈھکنا کھول دیا۔ اتنے سارے زیورات دیکھ کر امی جی کا منہ مارے حیرت اور خوشی کے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"خزانہ؟" وہ بولیں۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"یہ اسے اس کے باپ کے ترکے میں ملا ہے اور اب اس کا یہ کہنا ہے کہ یہ تمہیں تحفہ کرے گا۔ سو تم اب یہ تحفہ بخوشی قبول کر لو۔" ابو جان نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ انہوں نے امی کی جانب دیکھتے ہوئے ہنس کر اپنی آنکھوں سے ایسا اشارہ بھی کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہے بغیر اسے قبول کر لیں۔ میں نے خود ان کو اشارہ کرتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ امی نے فوراً صندوقچی کا منہ بند کر دیا اور ڈھیروں دعائیں مجھے دیں۔

ساتھ میں مجھے اپنے سینے سے لگا کر ماتھے کو چوما اور پھر آسمان کی طرف ہاتھ کر کے دعائیں دیتی رہیں۔ میرے دل میں سکون وطمانیت کی وہ لہریں دوڑیں جو شاید کبھی زندگی میں مجھے پہلے نصیب نہ ہوئی تھیں۔ میں وہاں سے یہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب خوش دلی سے لوٹا تھا۔ "میں نے ابھی کالج کا ہوم ورک کرنا ہے ابو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں مہمان خانے سے باہر نکل آیا تھا لیکن دروازے کی ٹوہ لے کر کھڑا ہو گیا تھا تا کہ اپنے والدین کو خوش ہوتا دیکھ

سکوں۔ لیکن میری خوشی اس وقت ہواؤں میں تحلیل ہوگئی جب میں نے امی ابو کو آپس میں یہ کہتے سنا۔

''اب تم ان زیورات کا کیا کروگی بیگم؟'' ابو جان نے امی جی سے پوچھا تھا۔

''میں انہیں، اپنے بنیامین کی دلہن کے لئے سنبھال لوں گی۔'' وہ خوش دلی سے بولیں۔ ''یہ زیورات پہن کر وہ کتنی پیاری لگے گی۔ یہ میرے بنیامین کا حق ہے میرے لال کا۔ میرے بچے کا۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی بیگم۔'' میرے ابو جی نے امی کے کاندھوں سے اپنی ایک بازو کا حصار بنا کر انہیں اپنے ساتھ جوڑ لیا تھا۔

''تو اور کیا؟ میں بڈھی کھاڑی کیا ان زیورات کو پہن کر پھرتی اچھی لگوں گی؟ اور پھر آپ ہی تو میرا زیور ہیں جی۔ !میرا آپ کے اور بنیامین کے سوا دنیا میں ہے ہی کون؟''

میں دل ہی دل میں ایک بات سوچتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ کالج کا ہوم ورک تو میں نے کیا خاک کرنا تھا۔ میں بستر پر دراز ہو کر ایک ہی بات سوچتا رہا۔

''ماں باپ سے بڑھ کر دنیا میں بھلا کوئی ہوسکتا ہے جو اتنا مقدم ہو۔ یہ ہوتے ہیں ماں باپ! تمام عمر اپنا آپ بھلائے بیٹھے فقط اپنی اولاد کا سوچتے جاتے ہیں۔''

باہر بارش بہت تیزی سے، زور وشور کے ساتھ شروع ہوچکی تھی۔ اور میں تمام رات آنکھوں میں آنسو لائے فقط یہی دعا پڑھتا رہ گیا۔

''اے میرے پالنے والے ان کے ساتھ ایسے ہی رحم فرما جیسا کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا جب میں چھوٹا تھا۔''

☆......☆......☆

بی کام میں نے امتیازی نمبروں سے مکمل کرلیا تو ابو جی نے مجھے آگے ایم بی اے میں داخلہ لینے کا حکم دیا۔ اب وہ اکثر دفتر سے چھٹی لے کر گھر پر رہنے لگ گئے تھے انہیں کوئی مرض لاحق ہوگیا تھا لیکن ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کون سا مرض لاحق ہوچکا ہے امی جان نے بھی ان سے کتنی بار دریافت کیا تھا کہ کہیں نہیں کوئی سوچ تو نہیں ہے کوئی پریشانی تو نہیں ہے لیکن ابو جان نے دل کی کشادگی اور سچائی کے ساتھ ہم دونوں ماں بیٹا پر واضح کردیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ خود بھی اس مرض کے آگے بے بس تھے۔

انہیں تو خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مرض ہے کیا؟ کبھی کھانسی کا ایسا دورہ ان پر لاحق ہوتا کہ ٹلنے کا نام نہ لیتا تو کبھی شوگر اتنی ہائی ہوجاتی کہ لاکھ ادویات کے استعمال پر نہ سنبھلتی۔ کبھی غشی کے دورے پڑتے تو کبھی بلڈ پریشر اتنا ہوجاتا کہ چڑھتا تو نیچے آنے کا نام ہی نہ لیتا۔ ہر ٹیسٹ کروا چکے تھے لیکن رپورٹ سب

نقصان

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک فرانسیسی ہوا باز اپنا جہاز رن وے پر اُتارتے ہوئے بہت خوش تھا۔ نیچے عملے نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ایئر مین اس کی وردی اور ہیلمٹ اُتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اس نے بڑے جوش سے کہا۔ ''آج میں نے جرمنوں کا بہت نقصان کیا۔ دو طیارے گرائے، ایک آبدوز تباہ کی اور ایک بحری جہاز تباہ کیا۔''

''لیکن سر آپ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔''

''وہ کیا بھئی۔''

ہوا باز نے جواب دیا۔ ''وہ یہ کہ آپ غلطی سے جرمنوں کے ہوائی اڈے پر ہی لینڈ کر گئے ہیں۔''

(شہباز احمد۔ایبٹ آباد)

ٹینشنوں کی ٹھیک آتی۔ شوگر کا مستقل عارضہ بھی انہیں نہ تھا۔ یہ بھی کبھی کبھار جز وقتی ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے فقط احتیاطی تدابیر بتادی تھیں لیکن میں نے عمیق نگاہوں سے جب ابوجان کے روز وشب پر ان کے معمولات زندگی۔ خوراک واٹھک بیٹھک پر غور کیا تو مجھے ایک بات نے ذہنی پراگندگی میں مبتلا کردیا تھا میرے مشاہدے میں یہ بات آئی تھی کہ ویسے تو ابوجی وہ فیروزے والی انگوٹھی ہر وقت نہیں پہنے رکھتے تھے لیکن جب وہ یہ انگوٹھی ایک وقت مقرر تک پہنے رکھتے تو پھر ان کی صحت پر عجیب سے اثرات مرتب ہونے لگتے تھے۔

میں ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اب میری عمر بھی بائیس سال تھی میں تو ہم پرست تو نہ تھا لیکن ابوجان کی گرتی ہوئی صحت اور اس واہمے نے کہ یہ سب ہونہ ہو اسی انگوٹھی کی وجہ سے ہو رہا ہے میرا سوچنے کا انداز یکسر تبدیل کردیا تھا بالآخر میں نے اس بات کا ذکر اپنے دوستوں سے کرنے کی ٹھانی تھی۔ میں ابھی یہ بات ابوجان یا امی جان سے نہیں کرنا چاہتا تھا میرے قابل اعتماد دوستوں میں صرف ناصر ایسا دوست تھا جو میرا راز دار بھی تھا کالج میں بی کام کے بعد وہی ایک تھا کہ جس سے میری ملاقات کا سلسلہ ہنوز جاری وساری تھا۔ ہم دونوں اکٹھے ایم بی اے میں بھی ساتھ ساتھ پہنچ چکے تھے۔ جب کیمپس سے ہم فارغ ہوکر باہر نکلے تو میں نے اسے چائے پر مدعو کیا۔ ہم دونوں یونیورسٹی کے کیمپس سے ملحقہ ایک کینٹین میں آمنے سامنے کرسیوں پر جا بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان چھوٹی سی میز حائل تھی جس پر کینٹین والے نے دو کپ چائے کے رکھ دیئے تھے۔

"یار! میں آج کل ایک عجیب سی پریشانی میں مبتلا ہوں۔" میں نے بات کا آغاز کیا تو اس نے بغور میری جانب دیکھ کر پوچھا۔

"کیسی پریشانی؟" اور پھر میں نے اپنے دل کے سارے خدشے کو صاف صاف بیان کردیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ اور پھر اس نے میری طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ یہی بات تم میرے والد صاحب سے کرو، کیا تم کرسکو گے؟"

میں اس کے یوں پوچھنے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں یہ راز اگر اس کے والد سے بانٹوں تو از خود بات کر کے ان کی صلاح لے سکتا ہوں۔ شاید وہ خود اس معاملہ کی حقیقت تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

"ہاں یار ناصر! میں تیار ہوں۔" میں نے اس سے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ اور ویسے بھی میں جانتا تھا کہ ناصر کے والد صاحب کا درویشی و پیری کی طرف جھکاؤ بھی بہت تھا وہ ایک خانقاہی انسان تھے۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ میں کئی مرتبہ ان سے مل چکا تھا اور ہر ملاقات میں، میں ان سے کافی متاثر ہوا تھا۔

"تو پھر یوں کرو کہ دیر نہ کرو۔ ابھی میرے ساتھ گھر چلو اور ابوجی سے مل لو۔ وہ دفتر سے پورے گھنٹے بعد واپس ہوں گے۔ تم اپنے گھر اطلاع کردو تاکہ تمہارے امی ابو تمہارے لئے پریشان نہ ہوں۔" اس نے میری طرف اپنا سیل فون بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں بھی اپنا سیل فون یونیورسٹی آتے ہوئے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اور نہ ہی ابھی تک کوئی سواری ہی ابوجی نے مجھے لے کر دی تھی ان کا کہنا تھا کہ پہلے مجھے پڑھ لکھ کر زیور تعلیم سے آراستہ ہونا چاہئے تھا اور اس دوران عام لوگوں کی طرح معاشرے میں رہنا چاہئے تھا۔ وہ میرے اندر امیرزادوں والی شان نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو دوسروں کی کسی طور سے دل آزاری کا سبب بنے۔ وہ تو اکثر کہا کرتے تھے کہ "جو بات عام ہونے میں ہے وہ خاص ہونے میں نہیں ہے بیٹا...... عام ہونے میں ہی تو دراصل خاص بات پوشیدہ ہے۔" ان کی باتیں ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ تھیں اور میں اندھے ہوکر ابوجی کی ہر بات کو نہ صرف غور سے سنتا تھا بلکہ فوری ان پر عمل پیرا بھی ہوجایا کرتا تھا ایک دفعہ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا "بیٹا! جس راہ سے باپ ٹھوکریں کھا کر گزر چکا ہے اس پر جب بیٹا چلنا شروع کرتا ہے تو باپ اسے اس راستے کے ہر پتھر سے پیشگی مطلع کردیتا ہے تاکہ بیٹا ٹھوکر نہ

www.urdusoftbooks.com

کھائے۔ بلکہ احتیاط سے وہاں سے بلا ٹھوکر کھائے نکل جائے۔ اس لئے بڑوں کے تجربے کی روشنی سے سیکھنا چاہئے۔ اس طرح وقت بھی بچ جاتا ہے اور تم لوگ ہم سے بھی آگے بڑھ سکو گے۔" وہ اکثر باتیں کر کے مجھے رہنمائی دیا کرتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ناصر کے ہمراہ اس کی گاڑی میں سوار ہو کر اس کے گھر پر تھا اور پھر کچھ منٹوں کے بعد اس کے ابو بھی گھر واپس آ گئے تھے۔ لباس تبدیل کر کے ناصر نے جب یہ بتایا کہ میں بھی ساتھ ہوں تو وہ مہمان خانے تک آ گئے تھے۔ ہم تینوں ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ وہ ہم دونوں کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں نے پورا معاملہ ان کو سنا دیا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "میرا نہیں خیال کہ یہ تمہارا وہم ہو گا بیٹا کیونکہ ہم اپنی زندگی میں اکثر باتوں کو غیر سنجیدگی سے لے لیتے ہیں۔ بالخصوص جب بھی ذکر دین کا ہو۔ ہم غیر سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں جب ذکر شادی بیاہ کا ہو۔ ہم غیر سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں اور محض ٹھٹھے بازیوں میں معاملہ کو اڑا رہے ہوتے ہیں حالانکہ دو زندگیوں کا معاملہ ہوتا ہے تعلیم کا معاملہ لے لو۔ ہم غیر سنجیدہ ہیں حتیٰ کہ زندگی کے ہر شعبے میں غیر سنجیدگی کے اس رویے نے ہمیں دنیا کی باقی اقوام سے دو سو سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔"

میں خاموشی سے انہیں سنتا رہا۔ وہ نہایت دھیمے لہجے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اب بھی وہ سپاٹ دھیمے لہجے میں مجھ سے بات کر رہے تھے۔ "میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ کل دوپہر کا وقت نکال کر ایک مرتبہ میرے حضرت کے پاس چلے چلو! وہاں یہ مخصمہ بیان کرنا، ہو سکتا ہے کہ کوئی خاطر خواہ جواب وہاں سے مل جائے اور پھر ہو سکتا ہے کہ یہ محض تمہارا وہم ہی ہو۔"

"جی ضرور انکل۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کل میں دو پیریڈ چھوڑ دوں گا آخری والے۔"

"یہ تو کرنا پڑے گا۔" انہوں نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی مسکراہٹ بہت دلنشین تھی۔

"میں بھی دفتر سے جلدی آ جاؤں گا بلکہ ناصر! تم بھی بنیامین کے ساتھ چھٹی لے کر آ جانا۔" تینوں اکٹھے ہی نکل چلیں گے۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"ایسا کرو کہ کل کے لئے صرف...... اپنے ابو جان سے وہ انگوٹھی مانگ لو۔ اور ہو سکے تو وہ انگوٹھی بھی پیر صاحب کو دکھا دینا یہ زیادہ مناسب رہے گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا میرے خیال میں بھی یہ عین مناسب بات تھی۔ اس طرح انگوٹھی دیکھ کر بھی حضرت صاحب اس بات کی نشاندہی کر سکتے تھے کہ آیا اس انگوٹھی میں کوئی بد اثرات ہیں۔ یا یہ محض میرا وہم ہی ہے کہ یہ انگوٹھی میرے ابو جی پر برے اثرات مرتب کر رہی ہے۔

☆......☆......☆

حضرت صاحب کے آستانے پر جب ہم اگلے روز دوپہر کے وقت پہنچے تو وہاں کچھ صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ حضرت جی نے ہمارے مقرر کردہ وقت پر ہی ہمیں اندر مہمان خانہ میں بلا لیا تھا۔ ہم تینوں زمین پر قالین کے ساتھ لگائے گئے گاؤ تکیوں کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ ناصر کے ابو نے تفصیلی بات پہلے سے ہی ان بزرگوں سے کر دی تھی۔ میں ان حضرت کو دیکھنے سے قبل یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی چھوٹی سی داڑھی والے اونچی ٹوپی یا پگڑی والے چوغا پہنے گلے میں ہندو جوگیوں کی مانند موٹے دانے والی مالائیں پہنے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں سجائے کوئی پیر صاحب ہوں گے لیکن یہاں تو ایک باشرع، چار لباس والا سادہ سا انسان بیٹھا تھا۔ سفید شلوار کرتا۔ اور سفید ٹوپی، مکمل ایک مشت برابر کی ریش تھی ان کی چہرہ نورانی اور مسکراہٹ دل نشین لبوں پر سجائے وہ اپنی ہیرے جیسے چمکتی آنکھوں سے میری جانب دیکھ کر بولے تھے۔ "کیا آپ انگوٹھی ساتھ لائے ہیں؟" میں نے جیب سے وہ نیلے رنگ کی انگوٹھی نکال کر ان کی طرف بڑھا دی تھی۔ انہوں نے اس انگوٹھی کو ہر جانب سے دیکھا اور پھر نیلے آسمانی فیروزے کی

جانب وہ کافی دیر تک اپنی عمیق نگاہوں سے گھورتے رہے۔ پھر وہ انگوٹھی میری جانب واپس لوٹا کرانہوں نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”بیٹے! آپ اپنے ابوجان سے کہیں کہ سات دن یہ انگوٹھی نہ پہنیں اور اگر اجازت لے لیں تو یہ انگوٹھی اس فقیر کے پاس سات دن کے لئے چھوڑ دیں۔ بندہ استخارہ کرکے اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کرلے گا۔“

مجھے ان کی یہ بات دل کو بھاگئی تھی۔ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے تھے۔ مجھے امی جان نے یہی بتایا تھا کہ حضور نبی کریمؐ نے استخارہ کا جو مسنون طریقہ بتایا ہے وہ سات دن تک نفل استخارہ پڑھ کر سونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے کسی معاملہ پر مشورہ یا سوال کا جواب طلب کرنا۔ میں نے ان سے حامی بھرلی کہ اگر میرے ابوجان نے اجازت دے دی تو میں یقیناً یہ انگوٹھی ان کے حوالے کردوں گا تاکہ وہ میرے اس وہم کو دور کرسکیں کہ یہ انگوٹھی میرے ابوجان کی صحت پر برے اثرات مرتب کرنے کا کوئی سبب ہے۔

ہم تینوں وہاں سے واپس ہولئے تھے۔ میں ناصر اور اس کے ابوجان کا شکریہ ادا کرکے واپس گھر آگیا تھا۔ اب مجھے ابوجان کا انتظار تھا۔ ویسے میں نے گھر آکر امی جی کو آج دن بھر کا احوال کہہ سنایا تھا تاکہ وہ ابوجان سے اصرار کرسکیں کہ سات دن کے لئے یہ انگوٹھی وہ حضرت صاحب کو دے دیں۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ ابوجان اپنے مرحوم بھائی کی آخری نشانی دینے سے انکار نہ کردیں۔ لیکن جب ابوجان گھر لوٹے تو جب انہیں امی جان نے ساری تفصیل اور میری دلی کیفیت کے بارے میں تمام حال احوال بتایا تو وہ سوچوں میں گم ہوگئے۔ انہوں نے اس معاملہ میں کوئی سدراہ کھڑی نہ کی۔ بلکہ الٹا مجھے بہت زیادہ پیار و محبت کے ساتھ اپنے سینے سے لگالیا تھا۔ مجھے ان کے سینے سے اٹھتی ہوئی وہ پدری شفقت کی گرمی بہت پرسکون لگی تھی۔ میں دنیا و مافیا کو اس شفقت بھری حرارت کے لئے قربان کرسکتا تھا۔

☆......☆......☆

پورے سات دن بعد جو انکشافات میرے سامنے آئے وہ دل کو چھلنی کردینے کے لئے کافی تھے۔ یہ انگوٹھی دراصل شیطانی چھلا تھا اس انگشتری کے فیروزے میں نظر آرہا تھا۔ لیکن دراصل یہ شیطان کی مہر تھا۔ میرے لئے یہ انکشافات بہت حیران کن تھے۔ پھر حضرت نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی پر پہنے بغیر محض اس کے چھلے کو پکڑتے ہوئے وہ انگوٹھی ایک سادہ کاغذ پر دبائے رکھی اور پھر جب وہ کاغذ ہمارے سامنے کیا تو اس پر عجیب سا نقش ابھرا۔

یہ ایک ایسی صورت تھی جس پر ایک چہرے کی پھیلی ہوئی نوک دار آنکھیں بنی ہوئی تھیں اس کے دو بیل نما سینگ تھے۔ دونوں کان چونچ دار تھے۔ دانت باہر کی جانب نکلے ہوئے اور منہ کے کونوں سے نہایت نوکیلے اور بڑے بڑے سے۔ اس کی بھنویں اوپر کی جانب اٹھتی ہوئی سی تھیں۔ اس کاغذ پر یہ خوفناک صورت دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ فیروزے کی اوپری سطح کھردری کیوں تھی اسے بہت گہرائی والی نظر سے دیکھ کر ہی کوئی یہ جان سکتا تھا کہ تکون کے اندر دراصل ایک شبیہ ہے۔ اور یہ شبیہ واضح طور پر شیطان کی شبیہ تھی۔

ناصر اور اس کے ابوجان بھی یہ سب اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ ناصر کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں میری حالت بھی اس کی حالت سے مختلف نہیں تھی۔ البتہ ناصر کے ابو نہایت سنجیدگی سے اس شبیہ کو دیکھ رہے تھے۔ میں تو آگے کچھ بول نہیں پارہا تھا کیونکہ میری سمجھ میں ابھی تک یہ معاملات نہیں آرہے تھے۔ ویسے بھی میں روحانی دنیا کا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یوں سوچوں میں گم سم دیکھ کر ناصر کے ابوجان نے حضرت صاحب سے دریافت کیا۔ ”حضرت! کیا اس انگوٹھی پر شیطانی اثرات ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر ان کو زائل کرنے کا کوئی طریقہ؟“

پھر حضرت نے ہم تینوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے۔ ”بات یہ ہے کہ اس انگوٹھی کو شیطان نے

خاص طور پر انسانوں کو اپنے دام میں جکڑنے کی غرض سے بنا رکھا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جو لوگ کسی وجہ سے حرص وہوس زر، زن یا زمین میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بنائی تقدیر سے راضی نہیں ہوتے یوں وہ الٹے ہتھ کنڈے استعمال کرکے اپنی تقدیر کے ساتھ کھلیان کرنے لگتے ہیں تو زندگی کی راہ میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں ابلیس ان سے ملتا ہے۔ وہ ان سے معاہدہ کرتا ہے یہ لوگ جو حارص ہوتے ہیں اس کے جال وفریب میں پھنس جاتے ہیں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام بائیاں ہاتھ استعمال کرنے سے بن جائے گا لیکن دراصل وہ لعین ان سے زندگی کی برکات کو چھین لیتا ہے اور یوں یہ کچھ لوگ زر، زن اور زمین ان سے ترمتفذ کے حصول جس کے لئے بھی یہ سب کر گزرتے ہیں۔ اسے حاصل کرکے بھی خوش نہیں ہوتے اور عجیب النوع طرح کی زندگی میں مبتلا کردیے جاتے ہیں اور عجیب انداز میں اچانک موت کا شکار بھی ہو جاتے ہیں دراصل یہ لوگ شیطان لعین کے لئے بنائی ہوئی دوزخ کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ جبکہ ابتداء میں دوزخ صرف شیطان کے لئے بنائی گئی تھی۔ لیکن پھر جب اس نے کہا کہ اے اللہ میں اپنے کالے کرتوتوں میں انسانوں کو بھی اپنے ساتھ ملالوں گا تو پھر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیا کہ ٹھیک ہے! ملالینا! جو تیرے ساتھ ملیں گے، میں انہیں بھی تیرے ساتھ دوزخ کا ایندھن بنادوں گا۔''

''کیا شیطان بنفس نفیس انسانوں کو بہکاتا ہے؟'' میرے ذہن میں سوال آیا تو میں نے حضرت سے کردیا تھا کیونکہ ان کی یہ باتیں میرے لئے بالکل نئی تھیں میں نے بھی کورس کی حد تک اسلام پڑھ رکھا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ پوری قوم کی طرح اسلامیات اور مطالعہ پاکستان جیسے متفذ مین کبھی سیر حاصل وقت میں نے بھی نہیں لگایا تھا۔

میرے اس سوال پر انہوں نے نفی میں سر ہلادیا۔ ''ایسا ممکن ہو بھی سکتا ہے لیکن عمومی طور سے ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ شیطان کا کام عقل پر اور دل پر حملہ کرنا ہے۔ یہ صرف دور سے ہی تصرف کرتا ہے۔

''اللہ تعالیٰ کی چاروں کتب میں موجود ہے کہ شیاطین تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ یہ انسانوں میں سے بندوں کو چنتے ہیں۔''

''کن بندوں کو چنتے ہیں، حضرت؟'' میں نے دوبارہ سوال کیا۔ تو انہوں نے وضاحت پیش کی۔ ''جن بندوں کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا ہوتا۔'' پھر انہوں نے وہ انگوٹھی میری طرف بڑھا کر کہا۔ ''اپنے ابو جان سے کہنا کہ یہ انگوٹھی وہ کسی دریا میں بہادیں۔ اسے قطعی نہ پہنیں۔ کیونکہ جو شخص اس انگوٹھی کو پہنے گا، وہ یقیناً ناگہانی موت مرے گا۔'' یہ سن کر میرے دماغ میں فوری میرے آنجہانی والدین کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ مجھے دل کی بے چینی نے گھیر لیا تھا میرے بے چین چہرے کے تاثرات کو غالباً حضرت جی نے پڑھ لیا تھا وہ میری جانب مسکرا کر بولے۔ ''کیا ہوا بنیامین بیٹا؟ تمہارے چہرے پر بے قراری کیوں آگئی ہے؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے ان کو جواب دیا۔ ''حضرت! ایک سوال میرے دل میں کہیں اٹک گیا ہے۔ جس کا جواب اگر مرحمت فرمادیں۔''

''ہاں...... پوچھو...... یہاں آکر کوئی ہچکچاتا نہیں۔ جو تمہارے دل میں ہے پوچھو۔'' وہ نہایت دوستانہ انداز میں گویا ہوئے تھے۔ تب میں نے اپنے دل کا ہیجان دور کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

''حضرت! میں اس انگوٹھی کی نحوست کی وجہ سے آج اپنے والد اور والدہ کے سایہ رحمت سے محروم ہوا ہوں۔ وہ شیطان صفت درندہ نما انسان کون ہے جس نے یہ انگوٹھی بنائی اور انسانوں میں پھیلا کر ان کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے؟ کیا یہ راز معلوم ہوسکتا ہے؟'' وہ میری بات سن کر قدرے سنجیدہ ہوگئے تھے ناصر کے ابو جان بھی میری طرف سنجیدگی سے دیکھے تھے۔ ناصر بھی میری طرف مغربی تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ وہ دل وہی دل میں میرے سوال پر مجھے داد دے رہا تھا۔

حضرت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اپنے والدین سے اجازت لے کر روزانہ مغرب کے بعد سے صبح فجر تک میرے ساتھ چالیس دن رہو۔ تمہارے سوال کا جواب اللہ تعالیٰ تمہیں خود دے دے گا۔ طریقہ میں بتادوں گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اللہ کی کتاب پڑھائی جاتی ہے اور اللہ کا ذکر کروایا جاتا ہے۔ بس! ایک بات کا خیال رہے کہ سفید رنگ کے لباس میں آنا۔ باقی اگر اللہ پاک نے قبول کیا اور اس کی رضا شامل حال رہی تو آگے کے معمولات تمہیں یہ فقیر بتادے گا۔'' اور پھر انہوں نے ناصر کے ابوجان کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے کہا۔

''صوفی صاحب! آپ بھی اگر چالیس ایام اپنی معروف زندگی سے نکال لیں تو کیا خواب ہوجائے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔'' پھر حضرت میری جانب دیکھتے ہوئے ہولے سے ہنس کر دوبارہ بولے۔ ''دو نہیں بلکہ اس مرتبہ دیوانے تین ہوں گے۔'' ان کی یہ بات سن کر ناصر کے ابوجان نے ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''حضرت! اسے بھی قبول فرمالیتے۔'' میں نے ناصر کی طرف دیکھا تو وہ قدرے پھیکا سا منہ بنا کر رہ گیا تھا۔ حضرت نے ناصر کے ابوجان سے فقط اتنا کہا تھا۔ ''دین میں جبر نہیں۔ اور یاد رہے کہ ہمارا کام فقط دعوت حق دینا ہے۔ ہدایت مانگنے والے کو عطا ہوتی ہے۔ بنا مانگے محبت الٰہی کا جام دربار پاک سے کبھی عطا نہیں ہوتا۔''

☆......☆......☆

میں نے حضرت سے اپنی ساری ملاقات کی تفصیل ابوجان اور امی جان کو گھر واپس آ کر من وعن سنا دی تھی جس پر ابوجان نے مجھے کاندھے پر ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے داد و تحسین دی تھی میں نے انہیں بھی ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بولے۔ ''میں دفتر سے کافی چھٹیاں کرچکا ہوں ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ وہاں چالیس دن اللہ کی یاد میں مشغول ہوجاتا۔ اب تو دفتر والے مجھے چھوڑیں گے بھی نہیں۔'' انہوں نے مجھے حضرت کے ساتھ مغرب سے فجر تک رہنے کی اجازت دے دی تھی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ابوجان نے اپنے طور پر حضرت کے بارے میں بہت سی تفصیل معلوم کرلی تھی ان کے دفتر میں بھی حضرت جی کے دو تین عقیدت مند موجود تھے۔

ایسا انہوں نے اس لئے کیا تھا کہ آج کے دور میں بزرگی، پیری، فقیری کے نام پر اکثریت نے دکانداری سجا رکھی تھی۔ یہ آج ہی کے دور کا المیہ نہیں بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تو باقاعدہ اس راہ کے ملاوٹیوں اور بہروپیوں کے خلاف اپنے وقت میں علم جہاد بھی بلند کر رکھا تھا۔ یہ باتیں علمی سطح پر ہی ان لوگوں کو معلوم تھیں جو علماء اسلام ہیں ورنہ اعوام تو اس حقیقت سے ہی دور تھی کہ جس خوش نصیب امت کے بیچ میں اللہ کی کتاب موجود ہو تو پھر ان کے مسائل کا حل سوائے کتاب اللہ کی مکمل پیروی کے اور کہاں مل سکتا تھا۔ بہر حال والدین کی اجازت سے میں نے حضرت کی صحبت میں مغرب تا فجر وقت گزارنا شروع کردیا۔ حضرت نے اس دورانیے میں مجھ پر کوئی خاص پابندیاں نہیں لگائی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر نماز کی پابندی کرنے پر زور دیا۔

چونکہ نماز کی پابندی تو میں یوں بھی کرتا تھا تو انہوں نے مغرب کی نماز کے بعد مجھ پر چھ نوافل اوابین کے پابندی سے پڑھنے کا حکم دیا ان چھ نوافل کے بعد مختصر بیان دے کر حضرت ذکر الٰہی جو کہ اللہ کے ذاتی نام پر مبنی ہوتا تھا وہ کراتے۔ ہم صفوں میں بیٹھتے سیدھی قطاروں میں اور عشاء کی نماز سے تھوڑا پہلے تک ''اللہ ہو...... اللہ ہو۔'' کی ضربیں اپنے قلب پر لگاتے اور اس پاک ذات کا نام دل ہی دل میں لیا کرتے تھے۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے ایک بات سیکھی کہ حضرت کے قلب کی اصلاح اور اخلاقیات پر بھرپور زور دیا جاتا تھا۔ حضرت تہجد کے وقت سب کو اٹھا دیا کرتے تھے اور فجر کی اذان تک ایک ڈیڑھ گھنٹہ پھر ذکر الٰہی میں مشغول کرتے۔ تہجد کی نماز بھی اس

عرصہ میں باقاعدگی سے پڑھائی گئی تھی یہاں تین باتوں کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ قلیل کلام، قلیل طعام اور قلیل آرام۔ ہمیں ہر وقت دل ہی دل میں جی حضور پیدا کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ یعنی اس طرح سے ہر سانس لو کہ ہر سانس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری ہو۔ بلکہ توجہ تو اس بات کی دی گئی تھی کہ دنیا کے ہر لمحے ایسے زندگی گزارو جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر بالغرض نہیں دیکھ رہے جیسا کہ واقعی میں نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم اتنا ہی سوچ کر زندگی گزاروں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تو تمہیں دیکھ رہی ہے۔

یہ چند باتیں میں نے ان دنوں میں حضرت کے پاس رہتے ہوئے سیکھی تھیں مجھے صبح اذان اور نماز فجر کے دوران دو سنتوں کے بعد خصوصی طور پر تاکید کی گئی تھی کہ میں سورۃ یٰسین شریف کی تلاوت کروں۔ البتہ عشاء کی نماز کے بعد مجھے ایک وظیفہ پڑھنے کی تلقین کی گئی تھی جو بمشکل پندرہ منٹ میں، میں پڑھ کر سو جایا کرتا تھا۔

پھر دن یونہی گزرتے رہے۔ مجھے نہ تو خواب میں کوئی اشارہ ہوا اور نہ ہی کسی مافوق الفطرت ذریعہ سے ہی میں اس شخص کے متعلق جان سکا جس کی وجہ سے شیطانی انگوٹھی کی نحوست کی بداثر نے میرے والدین کی جان لے لی تھی۔ پھر چالیس دن بھی مکمل ہوگئے ناصر کے والد صاحب و بہت خوش ہو رہے تھے انہیں نا جانے دنیا ومافیا کی کون سی دولت نصیب ہوگئی تھی۔ ان کا چہرہ لال سرخ ہوا جاتا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ چمک میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھی۔ چہرے کا نور بھی دوگنا ہو چکا تھا جن حضرات نے اس دوران حضرت کے ساتھ یہ وقت گزارا تھا وہ سب ہی تقریباً خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے سب ملاقاتی جب وہاں سے رخصت ہوگئے تو میں حضرت کے پاس آخری ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ میرے دل میں یہ شکوہ تھا کہ میری جھولی نہیں بھری تھی، میں نے جس مقصد کے لئے یہ چالیس دن کی ریاضت کی تھی مجھے اس مقصد میں ابھی بھی کامیابی نہیں ملی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بہتر نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس شخص کے متعلق مجھے آگاہی دیتا جس کی شیطانی تیار کردہ اس منحوس انگوٹھی کی بدولت میرے سر سے میرے حقیقی والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں جب مجھے ان کی ہر طرح سے ضرورت تھی۔ حضرت نے مجھے اپنے سینے سے زور سے بھینچا اور کہا۔

”عزیزم! آپ اس انگوٹھی کو عشاء کی نماز کے بعد تہجد کی نماز ہونے تک بغور دیکھ کر بغیر گنے کثرت سے وہی وظیفہ پڑھتے ہوئے (جو اللہ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام کا وظیفہ تھا) اپنے سامنے رکھ کر گھورتے رہیں گے۔ پلکیں جھپکیں یا نہ جھپکیں اس کی کوئی بندش نہیں اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ پلکیں نہیں جھپکانی ہیں تو یہ انسانی فطرت کے خلاف بات ہے اسی لئے آپ کو واضح کر رہا ہوں۔ کل ملاقات کریں پھر باقی کی باتیں انشاء اللہ کل ہوں گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا میں نے کوئی اور سوال حضرت سے نہیں کیا تھا۔ بس خاموشی سے ان کے آشیانے سے اپنے گھر واپس لوٹ آیا تھا۔

رات عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد میں نے گھر آکر اسی عمل پر اپنی توجہ کو مرکوز کر دیا تھا۔ گھر والے بھی رات کو عشاء کے بعد جلد سو جانے کے عادی تھے۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے زیرو واٹ کا بلب کمرے میں روشن کیا انگوٹھی میں نے اپنے پاس الماری میں رکھی ہوئی تھی وہ میں نے نکال کر اپنے سامنے میز پر رکھی اور جاءِ نماز میں نے اس انداز میں بچھالیا کہ انگوٹھی پر میری نظر پڑے تو سامنے میں کعبہ رخ بھی رہوں۔ اور پھر میں نے اول گیارہ مرتبہ درود پڑھ کر وظیفہ شروع کر دیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا وہ صفاتی نام دل ہی دل میں اس امید کے ساتھ لیتا رہا کہ شاید آج اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آجائے اور وہ میری میرے مقصد میں رہنمائی کر دے۔ مجھے اس بات کا کامل یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مانگو تو وہ ضرور عطا کرتا ہے انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ پھر تقریباً آدھی رات کا پہر ہوگا کہ میرے

سامنے انگوٹھی کا وہ منظر یکدم تبدیل ہوگیا میں نے اپنے پرانے گھر کو دیکھا جہاں میں نے اپنی امی جی کو دیکھا میں نے دیکھا تھا کہ میں اسکول سے لوٹا ہوں۔ میں سیدھا امی جی کے گلے لگ گیا ہوں۔ امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ وہ مجھ سے کھانے کا پوچھ رہی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ گھر میں ابو جی بھی داخل ہوئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کوئی بات کی تھی۔ میں نے وہ بات سن لی تھی۔ ”اور سناؤ پہلوان ،اسکول کیسا جارہا ہے؟“ وہ مجھے پیار سے پہلوان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا، میں انہیں غور سے محض گھورے جارہا تھا۔ میں ان کے قریب آیا۔ ”ابو جی!“ میں نے پکارا لیکن وہ امی سے اسی طرح بات کرنے میں مصروف رہے۔ ”ابو جی! میری بات سنیں!“ میں نے دوبارہ پکارا تھا میری آواز مجھے دور سے آتی محسوس ہورہی تھی وہ اب بھی امی سے باتیں کیے جارہے تھے۔ پھر انہوں نے کھانے کی میز کی طرف ہنس کر دیکھا اور بولے تھے۔“ اور پہلوان! واپسی پر تمہارے لئے چپس لاؤں یا چاکلیٹ؟“ میں نے حیرت سے اس جانب دیکھا جس جانب ابو نے دیکھتے ہوئے مجھ سے ہی پوچھا تھا جب میں نے اس طرف نظریں دوڑا کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کھانے کی میز کی کرسی پر ایک اور میں بیٹھا تھا۔ وہ میں ہی تھا جو کھانا کھا رہا تھا۔ اس بینا مین کی عمر سات سال کی تھی۔ وہ چہک کر بولا۔ ”چاکلیٹ!“

میں نے ابو کی طرف دیکھا تو وہ دور سے اس بنیا مین کو فضائی بوسے دے رہے تھے میرے ابو جان مجھے بہت چاہتے تھے وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے میں ان کا لاڈلا تھا اکلوتا بیٹا تھا۔

میں اس وقت ابو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ابو جی! مجھ سے بات کریں۔ میں یہاں ہوں۔“ لیکن انہوں نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے امی جان کو مخاطب کیا تھا وہ باورچی خانہ میں جا کر امی سے کچھ کہنے لگے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی ان دیکھے نرم و نازک ہاتھ نے میرے شانوں سے پکڑ کر مجھے باورچی خانہ کی طرف دھکیلنا شروع کردیا۔ میں غیر دانستہ طور پر اس جانب بڑھنے لگ گیا تھا۔ اس مرتبہ ابو جان کی آواز مجھے واضح سنائی دی تھی۔ لیکن اس آواز کی کیفیت یوں تھی جیسے ابو جان کسی خالی کمرے میں بات کررہے ہوں۔ کیونکہ آواز میں چاروں طرف سے گونج سنائی دے رہی تھی۔ ”بیگم آج میں گیا تھا ملنگی بابا کے پاس وہ مجھے ایک انگوٹھی دیں گے اس انگوٹھی کو میں اور تم چالیس دن باری باری پہنیں گے تو کاروبار میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوگی۔“

”اچھا؟“ میری امی چہکتے ہوئے بولی تھی۔ کیا کوئی جادوئی انگوٹھی ہے؟“

”ہاں! اس پر سمندر کی رحمت ہے۔“ ابو نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”بھئی...... آپ بھی انوکھی بات کہہ رہے ہیں۔ اللہ کی رحمت تو سن رکھا ہے لیکن سمندر کی رحمت کیا ہوتی ہے؟“

اتنی گہرائی میں، میں نہیں گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ”تم تین ہو۔ اسی لئے انگوٹھی بھی تکون میں ہی بنا کریں گے۔“

”کون کہہ رہے تھے؟“ امی نے حیرت سے دریافت کیا۔

”ملنگی بابا! اور کون؟“ ابو جی نے قدرے اونچے بولتے ہوئے بتایا تھا۔ تو امی نے چائے ایک کپ میں ڈال کر ابو جی کی طرف دیکھا۔ ”یہ بابے شابے تو بس ان کے چکروں میں پڑنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ زندگی میں کون سی چیز کی کمی ہے جو آپ کو مزید اور کچھ چاہئے؟“ وہ چائے کا کپ ابو کو تھماتے ہوئے بولی۔ ”اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس!“

میں نے آگے بڑھ کر اسی وقت امی جان کی بات کی تائید کرتے ہوئے ابو جی سے کہنا شروع کردیا۔ ”امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ابو جی! آپ کو خدا کا

واسطہ ہے امی جان کی بات سن لیں۔ یہ ملنگی بابا کی انگوٹھی مت لیں وہ ملنگی بابا شیطان کا گماشتہ ہے اور شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ ابو جی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ کریں ابو جی پلیز وہ انگوٹھی مت قبول کرنا اس ظالم سے۔" لیکن میرے ابو جی تو امی کی طرف مسکرا کر دیکھ کر چائے پیتے رہے۔ انہوں نے میری ایک بات پر بھی توجہ نہ کی۔ وہ میری ہر بات کو ساان سنا کیے دے رہے تھے میں نے ابو جان کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مرتبہ امی جان کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہاں امی جان نہیں تھیں پھر میں نے دوبارہ مڑ کر وہاں دیکھا جہاں ابھی کچھ دیر قبل ابو جان چائے پی رہے تھے لیکن اب وہ بھی باورچی خانے میں نہیں تھے۔ میں بھاگتے ہوئے باہر کھانے کی میز پر آیا جواب وہاں موجود نہیں تھی کمرے میں اجاڑ پڑا ہوا تھا میں چلایا۔ "ابو! امی، ابو جی آپ کہاں ہیں؟

"امی جی! آپ کہاں گئیں؟" لیکن وہاں کوئی نہیں تھا کمرہ خالی تھی پھر کمرے کا دروازہ کھلا ہمارے گھر کا مرکزی دروازہ تھا۔ ایک عجیب سا منحوس صورت شخص گھر میں داخل ہوا۔ اس نے ایک تھیلا کاندھے پر لٹکا رکھا تھا ساتھ میں اس کے ایک اور آدمی بھی تھا وہ شخص بوڑھا تھا اس کی عمر یہی کوئی ساٹھ سے دو سال زیادہ اوپر کی رہی ہوگی۔ البتہ اس کے ساتھ والا نوجوان چھبیس سال کا تھا۔

"تم دونوں کون ہو...... اور یہاں میرے گھر پر کیا کر رہے ہو؟" میں انہیں دیکھ کر غیض و غضب کے عالم میں چلایا تھا وہ دونوں ایک چٹائی کی جانب بڑھے تھے میں انہیں قہر آلود نگاہیں ڈالے گھور رہا تھا۔ اس بوڑھے نے چٹائی پر دراز ہو کر اپنی ایک ٹانگ نوجوان کے سامنے کر دی تھی۔

"لے بیٹا! تیرا مستقبل تو بن گیا۔ آج پورے بیس لاکھ کا ہاتھ صاف کیا ہے۔" وہ بوڑھا جوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ جوان بوڑھے کی ٹانگیں دبانے لگ گیا تھا۔ "کل اس تھیلے میں موجود رقم اپنے ذاتی بینک اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا! بس چند سال میں ہی تیرے اکاؤنٹ میں کروڑوں روپے ڈالوا دوں گا۔" وہ بوڑھا تھکاوٹ کی وجہ سے چور دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب کبوتر کے پروں جیسی داڑھی تھی اس کی وہ نوجوان اس کی ٹانگیں دباتا ہوا ساتھ میں ہلتا جا رہا تھا لیکن خاموش تھا۔

"تو خوش کیوں نہیں ہے؟" بوڑھے نے اس جوان سے پوچھا۔

"ابا جی! آپ اب آرام کریں میں آپ کو کب سے ملنگی بابا کے روپ میں اتنی محنت و اداکاری کرتے دیکھ رہا ہوں۔ اب تو بس کر دیں۔" میں نے قہر آلودہ نگاہوں سے اس ظالم کو دیکھا۔ "اچھا تو تو ہے ملنگی بابا! ظالم انسان خبردار جو تو نے میرے ابو جی کو وہ انگوٹھی دی تو۔ ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچنے کی بجائے دائیں بائیں جانب کو ہو جاتے۔ ساتھ میں، میں بھی دائیں بائیں جانب ہو جاتا۔ جب میں اس تک دسترس رکھنے پر قادر نہ ہوا تو میں نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہیں بغور سننا شروع کر دیا۔

"کل میں نے کالا علم پڑھ دیا تھا انگوٹھی پر۔ وہ شیطانی مہر ہے۔ وہ اس لالچی صراف کے حوالے کر دینا اور دو لاکھ روپے لے لینا۔" وہ بوڑھا اپنے نوجوان بیٹے سے مخاطب تھا۔

"ابا جی! اب تو آرام کر لو۔"

"اوہ نہیں...... اب آرام تو کرے گا۔ یہ انگوٹھی میں نے تیرے سر کا صدقہ چکانے کے لئے ہی خاص طور سے بنوائی ہے بس میرے مرنے کے بعد اب تجھ پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ یہ لالچی صراف مرے گا اور اس کی بیوی اور بچہ دیکھ تو دنیا میں سب کچھ ہو کر بھی پیٹ اور نفس نہیں بھرا اس کا۔ اس لئے یہ قربانی کے لئے جائز ہیں۔"

یہ باتیں سن کر مجھے شدید طیش آ گیا میں دشنام طرازی کرتے ہوئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور اس جانب کو بڑھا جہاں باورچی خانہ تھا۔ تاکہ وہاں سے کوئی چاقو یا چھری اٹھا کر اس ملنگی بابا کو قتل کر سکوں لیکن میری

حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے آپ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پایا۔

''ندیم ملک صاحب بہت بھلے آدمی تھے۔ معلوم نہیں اچانک کیا ہوا۔ بڑی جواں سالہ موت ہے۔'' سامنے اسٹیئرنگ والی سیٹ پر ابو جی گاڑی چلا رہے تھے۔ ساتھ والی اگلی نشست پر امی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' امی جان نے ابو کی بات کا جواب دیا تھا۔

''ابو جی! گاڑی روکیں۔'' میں پچھلی نشست پر تھا میں زور سے چلایا تھا۔ ''پلیز ابو جی گاڑی روکیں، لیکن میری ایک بھی آواز نہ ابو جی کو اور نہ ہی امی جی کو سنائی دے رہی تھی۔ وہ آپس میں ہی گفتگو کئے جا رہے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس وقت ان کے عقب میں بیٹھا ہوں۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔ نہ میری آواز ان کے کانوں تک جاسکتی تھی اور نہ ہی وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ جبکہ میں ان کو دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ جانے کون سی برزخ مجھ میں اور ان میں حائل ہوگئی تھی اور یہ سب کس قانون قدرت کے تحت ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں اب خاموشی سے ابو جان اور امی جان کو باری باری گھور رہا تھا۔

میرا دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ گاڑی کا یہ سفر جاری رکھیں۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اپنے آخری سفر کو ہی نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ رات تھی جب وہ کسی کی فوتگی سے واپس لوٹ رہے تھے اور پھر اچانک حادثہ پیش آگیا تھا اور اس منحوس رات کے بعد مجھے میرے امی ابو کبھی دکھائی نہ دیئے تھے۔ میں نے بغور دیکھا تو ابو جان نے وہ انگوٹھی اب بھی اپنی انگلی پر پہن رکھی تھی۔

''ابو جی! پلیز سن لیں مجھے، یہ انگوٹھی اتار دیں ابو جی! ابو جی خدا کے لئے یہ شیطانی چھلا اتار دیں۔'' میں نے ابو جی کی منتیں سماجتیں کرتے ہوئے رونا شروع کردیا تھا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ اگلے ہی لمحے ایک سیاہ چوغے والا اونچا لمبا تڑنگا شخص گاڑی کے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی صورت بالکل اسی انگوٹھی کے نقش سے ملتی جلتی تھی اس نے ایک آن کے لئے اپنے بازو دائیں بائیں جانب پھیلائے جن کے ساتھ ہی چمگادڑ کے پروں جیسے بڑے بڑے پر اس کے عقب سے پھیل کر دائیں بائیں کی جانب پھیلتے چلے گئے۔ اور پھر امی ابو دونوں کی بلند بانگ چیخیں گاڑی میں گونجی تھیں اور اگلے لمحے گاڑی زور سے ایک درخت سے جا ٹکرائی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے امی ابو جان کی چیخیں دور ہوتی ہوئی سنائی دی تھیں وہ مدد کے لئے پکار رہے تھے اس مرتبہ ان کی چیخوں میں میرا نام میں نے واضح سنا تھا۔ ''بنیامین...... بیٹے ہماری مدد کرو۔'' یہ آوازیں و چیخ پکار میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ میرے والدین ہی تھے۔

اور پھر ابو جان نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے ہوش کرو۔ یونیورسٹی کا وقت ہوگیا ہے۔'' میں نے قدرے ہوش میں آتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا اور پھر اپنے شفیق چچا جان کو دیکھا جنہوں نے تمام عمر مجھے باپ بن کر پالا پوسا تھا میں ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

''یہ انگوٹھی تم نے میز پر کیوں رکھی ہوئی ہے؟'' انہوں نے انگوٹھی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو میں نے جلدی سے ان کا بازو پکڑ کر کہا۔

''ابو جی آپ یہ انگوٹھی نہیں چھیڑیں گے میں آج دوبارہ حضرت کے پاس جاؤں گا۔''

''بیٹا! تم پسینے میں شرابور ہوئے جاتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟'' ابو جان نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔

''ابو جی اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوگیا ہے، اس رب تعالیٰ نے میری رہنمائی کی ہے۔'' اور میں نے اپنے مشاہدے میں آئی ہر واقعہ کی تفصیل ابو جی کو سنا دی وہ مجھ سے ہر واقعہ کی تفصیل سن کر حیران و ششدر ہوئے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے امی جان سے بھی وہ تفصیل کہہ سنائی تھی امی جان بھی یہ سب سن کر پریشان ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ابو جی سے تاکید کی تھی کہ وہ بھی آج حضرت کے پاس میرے ہمراہ جائیں

اور اس سارے معمے کا حتمی حل دریافت کریں۔

☆......☆......☆

''دراصل اسے کشف کہتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ تو اس نے حقیقت کا انکشاف تمہارے آگے کردیا ہے۔ چونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حضور اخلاص کے ساتھ دعا کی تھی اور اسے حضوری قلب کے ساتھ پکارا تھا تو اس نے تمہارے آئینہ قلب میں تمام حقیقت کا اظہار کردیا۔'' حضرت کے سامنے میں اور ابو جان نے سارا احوال بیان کیا تو وہ ہمیں دلاسہ دیتے ہوئے بولے تھے۔''اب گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ ذات جو بھی کرتی ہے، انسان کے بھلے کے لئے ہوتا ہے آپ یوں کیجیے کہ وہ انگوٹھی اب دریا میں پھینک دیں اس طرح اس کا وبال خود ہی ٹل جائے گا اور اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کریں۔''

میں نے حضرت کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ ابو جان بھی ان کے انتہائی مشکور نظر آرہے تھے پھر یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے حضرت سے سوال کیا۔''حضرت کیا یہ ملنگی بابا اب بھی زندہ ہوگا؟''

حضرت میری جانب مسکرا کر بولے۔

''نہیں اس کی موت آٹھ سال قبل ہوگئی تھی وہ اس شہر کا سب سے بڑا عامل تھا اس نے ایک مخلوق کو گمراہ کیا تھا۔ وہ زیادہ تر دولت مندوں کو اپنے دام میں پھانسا کرتا تھا اور پھر اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا اس شہر میں ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر ہوگیا تھا۔

''اب وہ کس علاقے میں رہائش پذیر ہے؟''

اس مرتبہ ابو جان نے سوال کیا تھا ان کے اس تشویش بھرے سوال پر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی کیونکہ ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ ابو جان محض میرا دل رکھنے کے لئے اور امی جان کے کہنے پر یہاں آگئے تھے حضرت نے اپنی دلنشین مسکراہٹ چہرے پر قائم رکھتے ہوئے کہا تھا۔''وہ آدمی نوجوانی میں ہی چل بسا تھا اس کی موت بڑی پراسرار طریقے سے ہوئی تھی وہ شہر سے باہر جارہا تھا کہ مین جی ٹی روڈ پر اچانک پیچھے سے ایک بھاری مال بردار ٹرالر اس کی نئی نویلی گاڑی پر چڑھ دوڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بھاری بھرکم مال بردار ٹرک کی بریکیں فیل ہوگئیں تھیں۔ بہرحال ملنگی بابا کے اس اکلوتے بیٹے کی لاش پچک گئی تھی ہڈیوں تک کا چورا چورا ہوگیا تھا لاش پہچانی ہی نہیں جاتی تھی جو مال ناحق ظلم وجبر سے اس ملنگی بابا نے اپنی اکلوتی اولاد کے لئے اکٹھا کر رکھا تھا وہ سب نہ اس کے اور نہ اس کے اکلوتے بیٹے ہی کے کام آیا قدرت کے اپنے قوانین ہیں جب آدم کو رزق ممنوعہ راس نہیں آیا تھا تو آدم کی اولاد کو کیسے آتا۔

یہ کلیہ تو پروردگار نے ازل سے بتادیا تھا کہ ''اے آدم! ہر پاک شے کو کھاپی لو مگر اس ممنوعہ رزق کے قریب نہ جانا۔ ورنہ زیر عتاب آجاؤ گے یعنی گھاٹے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔''

انسان کو اس خمیر سے بنایا ہی نہیں گیا کہ ظلم وجبر سے کھائے اور رحم وکرم کی امیدیں بھی رکھ لے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں نہ پہلے ایسا کبھی ہوا نہ اب ہورہا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی بات سے نہیں پھرتا ہاں! ہم انسان اس کے احکامات سے منہ پھیرتے ہیں۔

ہم تھوڑی دیر بعد وہاں سے گھر لوٹ آئے تھے واپسی پر ابو جان نے دریا کنارے کھڑے ہوکر وہ انگوٹھی مجھے دریا میں پھینکنے کا حکم دیا میں نے جیب سے وہ منحوس انگوٹھی نکالی اور ایک زوردار جھٹکے سے دریا سپرد کردی میری آنکھوں میں میرے حقیقی ابو اور امی کی صورتیں ابھر آئی تھیں دریا اپنی مکمل روانی میں بہہ رہا تھا انگوٹھی دور اس میں جاکر گری تھی میرے ابو کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کردی تھی وہ میرے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔

''چلو گھر چلیں بیٹا! اللہ نے جو دیا اس کا بھی شکر ہے۔ اور جو نہیں دیا اس پر بھی اللہ کا شکر ہے سچ تو یہ ہے بیٹا انسان کو اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے لاکھوں کروڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔



جل پری

شکیل نیازی-میانوالی

جل پری نے نوجوان کو چشم زدن میں اپنی بانھوں میں بھرلیا اور دوسرے ھی لمحے نوجوان کو لئے ھوئے پانی کی اتھاہ گھرائی میں اترتی چلی گئی اور پھر دیکھتے ھی دیکھتے ایک عجیب منظر سامنے آیا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ نادیدہ قوتیں بھی انسان کی خواہش کو سمجھتی ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

1875ء بحرالکاہل میں برٹش اور فرانسیسی جہاز آمنے سامنے تھے اور ایک دوسرے پر آہن و آتش کی بارش کر رہے تھے، فرانسیسی بھاری پڑ رہے تھے کیوں کہ ان کے پاس تین بحری جہاز تھے جبکہ مقابلے میں برٹش فوج کا ایک ہی جہاز تھا جو توپوں کے گولوں سے جگہ جگہ سے تباہ ہو گیا تھا اور ان ٹوٹی ہوئی جگہوں سے پانی اندر آ رہا تھا۔

"کپتان جہاز ڈوب رہا ہے اگر ہم نے فوری طور پر اسے نہیں چھوڑا تو ہم سب مارے جائیں گے۔" ایک فوجی چلا کر بولا۔

"نہیں جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنا ہے۔" بوڑھے کپتان نے اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"سر پلیز جہاز کو چھوڑ دیں اس میں اب کچھ نہیں رہا۔" ایک خوبصورت نوجوان نے کہا۔

"اپنے بارے میں نہیں تو اپنی بیٹی کے بارے

میں سوچیں میں اسے کیا جواب دوں گا کہ میں نے تمہارے ڈیڈ کو مرنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا۔" نوجوان کی بات سن کر کپتان جہاز چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ اور باقی سپاہیوں کے ساتھ چھوٹی کشتی میں سوار ہوگیا اور سپاہی تیزی سے چپو چلاتے وہ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک ایک گولا سنسناتا ہوا آیا اور اس نے کشتی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے تھوڑی دیر بعد نوجوان لیفٹیننٹ ولسن کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک لکڑی کے تختے پر سوار ہے اور سمندر میں ہل چل ہونے کی وجہ سے لہریں اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی ہیں اس نے دیکھا کہ اسی تختے پر کپتان بھی سوار تھا۔ "شکر ہے کیپٹن کہ آپ بچ گئے۔" ولسن نے پھولے ہوئے سانس سے کہا۔

"میری بات غور سے سنو نوجوان میں یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ میری بیٹی کیرین تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے اور تم بھی اسے چاہتے ہو میں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے بہت کچھ کیا ہے اب میں تمہیں یہ زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ یہ تختہ ہم دونوں کا وزن نہیں برداشت کرپائے گا۔ تم اپنا اور میری بیٹی کا خیال رکھنا۔" یہ کہہ کر کپتان نے تختہ کو چھوڑ دیا۔

"کپتان......" ولسن کے منہ سے چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا۔

پھر ولسن کی آنکھیں کھلنے کی وجہ سرسراہٹ تھی جو اسے اپنے گال پر محسوس ہوئی اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو اس کی انگلیوں میں ایک بڑا سا سمندری کیکڑا آ گیا جسے اس نے کراہیت کے مارے جلدی سے دور اچھال دیا اور خود کھڑا ہوگیا اس نے اردگرد دیکھا تو وہ ایک سمندری چٹان پر پڑا تھا دس مربع فٹ کی ناہموار چٹان کے اردگرد تاحد نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا اسے وہ تختہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جس پر سفر کرکے وہ یہاں تک پہنچا تھا پھر اسے کیپٹن کی یاد آئی جس کی قربانی کی بدولت وہ ابھی تک زندہ تھا اس کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس مقام پر ہے اسے وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کیونکہ آسمان پر گھنے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے ان کی گرج سنائی دے رہی تھی گرج چمک دیکھ کر وہ اور پریشان ہوگیا کیونکہ وہ باخوبی جانتا تھا کہ سمندر میں بارش کا مطلب طوفان کے آثار ہیں اس نے اپنا جائزہ لیا تو اس کے پاس ایک بھاری پستول اور 18 کارتوس تھے اس کے علاوہ ایک بڑے سائز کا چاقو تھا اور وہ کپڑے جو اس نے پہن رکھے تھے اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔

وہ طوفان سے بچاؤ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بارش کی بوند اس کے سر پر آن گری اس کے بعد تیز ہوا کے ساتھ سمندر بھی موجیں مارنے لگا اس نے اپنا فوجی اوور کوٹ کو اپنے سر پر اوڑھ لیا اندھیرا اتنا پھیل چکا تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اسے چٹان چھجے کی طرح نظر آئی تو وہ چٹان کے نیچے آ گیا اس طرح وہ بارش سے محفوظ ہوگیا وہ اس جگہ بیٹھ گیا اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی پھر وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

پھر اس کی آنکھ ایک سریلی آواز کی وجہ سے کھلی کوئی بہت ہی خوب صورت آواز میں گا رہا تھا پہلے اسے خواب سا محسوس ہوا آسمان پر ستارے چمک رہے تھے جس کا مطلب ہے کہ رات ہوگئی تھی وہ کافی دیر تک سوتا رہا تھا موسم بالکل صاف تھا اور بادل کا دور دور تک نشان نہیں تھا وہ اٹھ بیٹھا اور حیرت سے اردگرد دیکھنے لگا اس نے آواز کے تعاقب میں دیکھا تو حیران رہ گیا ایک لڑکی اس سے کچھ فاصلے پر ہی پانی میں کھڑی تھی اس کا آدھے سے زیادہ جسم پانی کے اندر تھا گھنے سیاہ بالوں نے اس کے جسم کے اوپری حصے کو ڈھانپ رکھا تھا سرخ و سفید رنگت بھرے بھرے گال اور پھول کی پتیوں کی کی طرح اندر ہونٹ دیکھ کر ایک بار تو وہ ہوش کھو بیٹھا۔

وہ لڑکی مسلسل گانا گائے جارہی تھی اور ولسن جیسے

کسی سحر کا شکار ہو کے بے خودی کے عالم میں اس کی جانب بڑھتا چلا گیا وہ جیسے ہی اس کے قریب گیا اس لڑکی نے اپنی مدھ بھری آنکھیں کھولیں اور ولسن کے چہرے کو اپنے نازک سے ہاتھوں میں بھر لیا اور آہستہ آہستہ نیچے پانی میں جانے لگی اور ولسن مدہوشی کی کیفیت میں جھکتا چلا گیا۔

وہ لڑکی اس وقت تک گاتی رہی جب تک اس کا چہرہ پانی میں نہ ڈوب گیا اور اس کے پیچھے جاتے ولسن کا چہرہ جیسے ہی پانی کی سطح سے ٹکرایا تو اسے جیسے ہوش آ گیا اس نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر اس لڑکی نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا، ولسن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کندھے کو کسی بڑے درندے نے پکڑ لیا ہو ولسن نے تڑپ کر لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ مارے خوف کے کانپ کر رہ گیا کیوں کہ اب اس لڑکی کے سائیڈ والے دونوں دانت بڑے ہو کر باہر آ گئے تھے اور جب ولسن کی نظر نیچے کی طرف گئی تو اس کی سانس حلق میں اٹک کر رہ گئی کیوں کہ لڑکی کا نچلا دھڑ انسانی نہیں بلکہ ایک مچھلی کا تھا۔

”جل پری۔“ ولسن کے ذہن میں گونجا اور وہ زور لگا کر اس کی آہنی گرفت سے نکل گیا اور اس چٹان کے درمیان آن گرا، اس نے دیکھا کہ اب سمندر کی سطح سے بہت سے سر باہر آ رہے تھے ایک سے بڑھ کر ایک حسین چہرہ مگر اب وہ ان کی حقیقت جانتا تھا وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور وہ سب اسے بھوکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”شاید یہ مجھے کھانا چاہتی ہیں۔“ ولسن نے دل میں سوچا اور پھر اپنا بھاری ریوالور نکال لیا۔ ”اگر تم میں سے کوئی میرے قریب آئی تو اسے اڑا کر رکھ دوں گا۔“ ولسن نے چیخ کر کہا کیونکہ وہ سب اب آہستہ آہستہ چٹان کے قریب آ رہی تھیں اور وہ انہیں اپنے قریب آتا دیکھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے قریب آنے والی جل پریوں میں سے ایک نے اس پر چھلانگ لگا دی، اگر وہ تیزی سے نیچے بیٹھ نہ جاتا تو وہ اسے لیتے ہوئے دوسری طرف سمندر میں جا گرتی، وہ ابھی پورا اٹھا بھی نہیں تھا کہ اسے دوبارہ بیٹھنا پڑا کیونکہ ایک اور جل پری اس پر چھلانگ لگا چکی تھی اب تو وہ سب باری باری اس پر چھلانگیں لگانے لگیں اور وہ کبھی بیٹھ کر کبھی اچھل کر ان کے وار سے بچنے کی کوشش کرتا ان کے لمبے ناخن اور دانتوں نے اسے بری طرح گھائل کر دیا تھا اور اس اچھل کود میں اس کا ریوالور نہ جانے کہاں گر گیا تھا، وہ بری طرح سے تھک چکا تھا، ”شاید میں زندہ نہیں بچوں گا۔“ اس نے سوچا۔ ”لیکن میں ایک فوجی ہوں اور آخری سانس تک لڑوں گا۔“ یہ سوچ کر وہ ایک بار پھر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی ایک جل پری نے اس پر چھلانگ لگائی تو اس نے اپنا فولادی مکا اس کی گردن پر زور سے دے مارا اور وہ بجائے آگے پانی میں گرنے کے وہیں چٹان پر گر گئی۔ اور پھر ولسن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیوں کہ اس کا نچلا دھڑ جو کہ مچھلی کا تھا انسانی جسم میں تبدیل ہو گیا اور دانت بھی عام انسانوں جیسے ہو گئے۔

ولسن نے ایک اور مکا اسے رسید کرنا چاہا تو اس نے ڈر کے مارے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور ولسن چاہتے ہوئے بھی اسے نہ مار پایا کیوں کہ وہ اب اٹھارہ انیس سال کی لڑکی دکھائی دے رہی تھی جو بری طرح سے سہمی ہوئی تھی۔

اچانک ولسن کو خیال آیا کہ اس لڑکی کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں تو اس نے فوراً اپنا اوور کوٹ اتارا اور اس کے بدن کو ڈھانپ دیا ولسن نے نوٹ کیا کہ اب جل پریاں اسے دیکھ کر غرا ضرور رہی تھیں مگر حملہ نہیں کر رہی تھیں۔

ولسن ان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا وہ پوری طرح سے تیار تھا پھر جب صبح کے آثار نظر آنے لگے تو جل پری نے ایک دم سے پانی میں چھلانگ لگائی مگر ولسن اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا اس نے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے واپس کھینچ لیا وہ دوبارہ چٹان پر گری اور ولسن کے کھینچنے کی وجہ سے وہ بری طرح زخمی ہو گئی۔

ولسن نے دیکھا کہ سمندر میں موجود جل پریوں کی بے قراری بڑھنے کے ساتھ ساتھ روشنی بڑھتی جا رہی تھی اور پھر جیسے ہی سورج کی پہلی کرن نظر آئی وہ سب گہرے پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہو گئیں۔

ولسن نے دیکھا کہ وہ بھی زخمی ہونے کے باوجود سرک سرک کر وہاں سے جانا چاہتی تھی جہاں باقی جل پریاں گئی تھیں لیکن ولسن نے اس کا نازک پیر سختی سے پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پائی، ولسن کو لگا اس کی آنکھوں میں مایوسی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر ولسن مسکرایا۔" اچھی بات ہے یعنی تم جانوروں کو بھی دکھ ہوتا ہے۔" اس نے کہا اور پھر اس نے اپنی شرٹ اتار کر اس کی رسی بنائی اور اسے ایک ابھری ہوئی چٹان کے ساتھ اسے بیٹھا کر کس کے باندھ دیا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"واہ کون یقین کرے گا تمہاری معصومیت دیکھ کر کہ تم ایک ایسی حیوان ہو جو کسی انسان کو لمحوں میں کھا سکتی ہو۔" ولسن نے کہا۔

تو وہ اسے غصے سے گھورنے لگی۔" تم حیوان ہو اور مجھے گھور رہی ہو۔" ولسن کو غصہ آ گیا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ اسے رسید کر دیا۔

تھپڑ کے نشان اس کے سفید گال پر ثبت ہو گئے اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن چہرے پر کوئی رونے کے آثار نہیں تھے بس آنسو ہی بہہ رہے تھے۔

ولسن کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کرنا چاہے مگر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔" دیکھو میں مانتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا اور اس میں میرا قصور نہیں ہے کیوں کہ تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور حملہ دشمن کیا کرتے ہیں ہمارے ہاں تو دشمنوں سے اس سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔" ولسن نے کہا تو وہ اسے معصومیت سے دیکھنے لگی جیسے اس کی بات کے معنی سمجھ رہی ہو یا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اگر تمہیں میری باتیں سمجھ آ رہی ہیں تو اپنا سر ہلاؤ۔" ولسن نے کہا تو بھی وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

یعنی تم مجھے نہیں سمجھ پا رہی۔" ولسن نے مایوسی سے کہا۔ اب دن کافی چڑھ آیا تھا اور ولسن کا مارے بھوک کے برا حال تھا اس نے بڑی مشکل سے ایک چھوٹے سائز کی مچھلی پکڑی اور اسے اپنے چاقو کی مدد سے اسے صاف کر کے کھانے کے قابل بنایا مچھلی کھا کر اسے نیند آنے لگی اور وہ ایک چٹان سے ٹیک لگا کر سو گیا اور پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا جبکہ جل پری ویسی کی ویسی بیٹھی تھی جیسے وہ اسے دیکھ کر سویا تھا نہ جانے کیوں وہ اسے اچھی لگنے لگی۔

وہ آہستہ سے چل کر اس کے پاس جا بیٹھا اور اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر بولا۔" مجھے نہیں پتہ تم کون ہو اور پتہ نہیں تمہارے سینے میں دل بھی ہے کہ نہیں مگر میرے سینے میں دل ہے اور مجھے لگتا ہے تم آہستہ آہستہ میرے حواس پر سوار ہو رہی ہو، میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ غلط کروں لیکن ہم دونوں یہاں اکیلے ہیں اور میں نہیں چاہتا تمہاری معصومیت دیکھ کر میں بہک جاؤں اور اپنی منگیتر سے دھوکہ کروں۔"

ولسن یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا اس نے دیکھا کہ وہ اب بھی اسے بچوں کی طرح پلکیں جھپکا کر دیکھ رہی تھی شاید اسے ولسن کی کوئی بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں آزاد کرنا موت کو دعوت دینے والی بات ہو گی مگر میں انسان ہوں اور انسان موت تو قبول کر لیتے ہیں مگر انسانیت پر داغ نہیں لگنے دیتے۔" یہ کہہ کر ولسن نے اس کے ہاتھ کھول دیئے تو اس نے دوسرے ہی لمحے پانی میں چھلانگ لگا دی، وہ جیسے ہی پانی میں اتری اس کا نچلا دھڑ پھر مچھلی جیسا ہو گیا۔

ولسن کا کوٹ ابھی تک اس نے پہن رکھا تھا اس نے وہ کوٹ اتارا اور ولسن کی طرف ایک ادا سے بڑھایا، ولسن کوٹ لینے کے لئے جیسے ہی پانی میں اترا جل پری نے کوٹ پھینک کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔

ولسن کچھ نہ کر سکا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اسے لئے گہرے پانی میں اترتی چلی گئی۔

اسرار

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

قسط نمبر 5

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

اچانک وہ سرکش لاش آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگی اور میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تا کہ فرار کی کوئی راہ تلاش کرسکوں۔ مگر فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک کھڑکی تھی وہ بھی پشت پر اور دوسرے میرے دائیں ہاتھ کی طرف وہ دروازہ تھا۔ جو تیسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ کھڑکی کی راہ میرے لئے یوں مسدود ہوگئی تھی کہ اس کے آگے وہ سرکش لاش کھڑی تھی اور دوسرے میری دائیں ہاتھ والے دروازے کا تصور ہی مجھے لرزہ براندام کردینے کے لئے کافی تھا۔

کیونکہ تیسرے کمرے سے متصل چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکتی ہوئی لاش اور اس سے چمٹی ہوئی وہ ہزاروں خون خوار آدم خور مکھیاں موجود تھیں۔ ادھر سرکش لاش میری طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے فلک شگاف قہقہے مجھ پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہے تھے۔ میری مدافعت کمزور پڑتی جارہی تھی کیونکہ ان واقعات نے میری حالت بہت بری کردی تھی۔ اس وقت موت نے مجھے جس طرح دو طرف سے گھیرا تھا وہ تو میرا دل ہی جانتا تھا۔

اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو خود اس قسم کے حالات میں کبھی گھرے ہوں۔ لہٰذا اس خوف ناک اور جان لیوا صورت حال کا اندازہ میں ہی کرسکتا ہوں کہ اب میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس دہشت ناک صورت حال کا مقابلہ میں نہیں کرسکتا تھا لہٰذا میں ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ ''رک جاؤ۔ رک جاؤ میرے قریب نہ آنا ورنہ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا قتل کردوں گا رک جاؤ، بچاؤ بچاؤ، کوئی ہے بچاؤ بچاؤ۔''

یہاں تک پہنچ کر شریم کی آواز رک گئی۔ شریم نظر تو نہیں آ رہا تھا پر شدت جذبات سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ پھر وہ گویا ہوا۔

''ہاں تو شاہان بھائی اور ناگن بہن میں اس وقت بری طرح چیخ رہا تھا مگر وہ خون آشام بدروح قدم بہ قدم میری طرف بڑھ رہی تھی اس خوف ناک بدروح کو یوں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر میں اچھل کر پیچھے ہٹا۔ اچھلتے وقت اچانک میری کوٹ کی جیب میں پڑی ہوئی کوئی بھاری چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی۔ تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس میرا حفاظتی پستول بھی ہے۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اور یکے بعد دیگرے اس سرکش بدروح پر تین فائر کئے۔

لیکن اس وقت میں نے عجیب منظر دیکھا۔ کہ تینوں گولیاں اسے لگیں اس کے جسم میں سوراخ بھی ہوئے لیکن ان سوراخوں سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا



www.urdusoftbooks.com

اور وہ برابر آگے بڑھتی رہی۔ البتہ اس کے قہقہوں میں اب اور شدت پیدا ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میں نے وہ گولیاں کسی اور پر چلائی ہوں اس پر گولیوں کا ذرا برابر بھی اثر نہ ہوا۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ اس وقت میرا سارا وجود لرزہ براندام تھا۔

اس وقت مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو پستول جیب میں رکھ کر میں تیزی سے آگے بڑھا اور اپنی قریب کی کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے اس زندہ لاش پر دے ماری۔ وہ بھاری کرسی سمیت الٹ کر پچھلی سمت جا گری اور اس کے شیطانی قہقہے یکا یک رک گئے۔

جونہی وہ گری میں دائیں طرف والے دروازے کی طرف بھاگا اور اسے کھول کر تیسرے کمرے میں آ گیا اور جلدی سے اسے بند کردیا اور پھر تیسرے کمرے کے باہر والے دروازے کی طرف بھاگا اور اسے بھی بند کرکے اندر سے کنڈی چڑھادی تاکہ وہ آدم خور بلا اندر نہ آنے پائے۔ فوری طور پر تو میں نے خود کو اس سے اپنے آپ کو بچالیا تھا۔ لیکن آخر کب تک جلا دیا بدیر وہ مجھے بھی پکڑے گی۔ ظاہر ہے ان بدروحوں کے لئے بند دروازے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔

پھر نہ جانے کس طرح وہ دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔ یہ کمرہ میں پہلے ہی روشن کر چکا تھا۔ یہ تیسرا کمرہ تھا۔ اور وہ دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ جو چوتھے کمرے میں کھلتا تھا وہ ناقابل یقین، تعفن اسی طرح اسی رسی سے لٹکتی ہوئی لاش سے اٹھ رہا تھا۔ مگر مجھ میں وہ دروازہ بند کرنے کا بھی حوصلہ نہ رہا تھا۔ میرا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کررہی تھیں۔ چاروں طرف موت گھوم رہی تھی۔ بلا موجود تھی جو کہ میرا خون پینے کو بے چین تھی۔ چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکتی ہوئی گھورتی لاش اور آدم خور کھیاں نیچے وہ خوف ناک سانپ جو یقیناً مجھے جکڑنے کے لئے بے قرار ہوگا۔ اس بھیانک عمارت کی ایک ایک چیز میری دشمن تھی۔

چاروں طرف سے نظریں مجھ پر گاڑے ہوئے تھی اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں دیواروں کا ایک ایک پتھر مجھے گھور رہا تھا۔ تاکہ مجھے جکڑ سکے۔

یہاں بہرحال تھوڑی دیر کے لئے میری زندگی محفوظ ہوگئی تھی لیکن اس بدبوں اور تعفن نے میرا دماغ الٹ کررکھ دیا تھا اب میرے اعصاب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑتے جارہے تھے۔ ادھر بھوک پیاس بھاگ دوڑ خون اور دہشت نے میری جان تک نکال دی تھی۔ لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس تعفن کا تھا جس سے میں کسی طرح بھی نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا اس وقت میں بے بسی کی انتہا پر تھا۔

موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ مگر اس وقت موت بھی مجھ سے دور بھاگ رہی تھی۔

ویسے اذیت کی موت مجھے پسند نہیں تھی۔ ادھر زندگی مجھ سے کوسوں دور تھی۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ نہ میں جی رہا تھا اور نہ ہی مر رہا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اب اس دماغ پاش بدبوں سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس لاش کو کس نے یہاں لٹکایا ہے۔ یہ عورت کون ہے۔ اتنا تو پتہ چل رہا تھا کہ اس عورت کو پھانسی دی گئی ہے۔ مگر کیوں کیا یہ عورت بھی میری طرح نادانستگی میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ یا اس نے خودکشی کی تھی میرا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔

اس مخصوص عمارت کی ہر بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اور زندہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور میں حالات کے آگے بالکل بے بس ہوچکا تھا۔ اگر کوئی انسان ہوتا تو میں مقابلہ بھی کرسکتا تھا۔ لیکن ان بدروحوں سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں اپنے پستول کو بے اثر ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ بھلا ان شیطانی قوتوں سے ٹکراتا مجھ جیسے عام آدمی کی بات کہاں تھی۔ اور پھر حقیقت یہ تھی کہ اب نہ مجھ میں ہمت تھی نہ حوصلہ کہ میں اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرسکتا ہو، میں ان بلاؤں میں بری طرح گرفتار ہوچکا تھا۔ ایک

بار تو جی میں آئی کہ میں پچھلی سمت کی کھڑکی کھول کر نیچے چھلانگ لگا دوں۔ چاہے ہاتھ پیر ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے میں کوشش کے باوجود بھی ایسا نہ کرسکا اتنا میں جانتا تھا۔ کہ تیس فٹ نیچے کودنا اور پھر ہاتھ پیروں کا سلامت رہ جانا بے حد مشکل تھا اگر میں ایسا کرتا تو پھر ساری عمر معذوری کی زندگی بسر کرنی پڑتی اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ نیچے گرنے اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے بعد اگر وہ آدم خور بلا یا سانپ یا وہ سرکٹی بدروح مجھے پکڑ سکتی تو نہ میں بھاگ سکتا اور نہ ہی مقابلہ کرنا میرے بس میں ہوتا۔ لہٰذا میں نیچے کودنے کی ہمت نہ کرسکا۔

میری حالت ابھی تک خراب تھی جس کے چاروں طرف خون خوار بلیاں کھڑی غرا رہی ہوں۔

اس آسیب زدہ عمارت میں میرا ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا۔ اور مجھے کسی بھی پل قرار نہیں آرہا تھا۔ ہر آن یہ دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ وہ بدروح یا خون خوار بلا یہاں نہ آن پہنچے۔ ادھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ ابھی تک جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ آدم خور مکھیاں اگر مجھ سے چمٹتیں تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ ادھر بدبوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میرے چاروں طرف موت ہی موت تھی۔ جبکہ زندگی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

مصیبت کے ایسے لمحات میں ہر انسان کو خدا یاد آتا ہے۔ یہی حال میرا بھی اس وقت یہی تھا۔ ایسے ہولناک حالات میں پھنس کر جب میں زندگی سے مایوس ہوگیا۔ تو بے اختیار مجھے خدا یاد آیا۔ لہٰذا میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ سے پناہ مانگنے لگا۔ کہ ”یا اللہ مجھے ان شیطانوں سے بچا اور اپنی امان میں رکھ۔“ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میری وحشت میں کچھ کمی سی آگئی بے شک یہ اسی اللہ کا نام ہے جو دلوں کو سکون دیتا ہے میرے دل سے کچھ دہشت بھی کم ہوگئی۔ اور میں از سر نو اپنی جان بچانے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ مگر میں دماغ صحیح طور پر اب کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا۔ اس لئے جان بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

اچانک ایک اور خیال میرے دل میں آیا کہ اگر میں پچھلی کھڑکی کھول کر مدد کے لئے چلانا شروع کردوں تو شاید کوئی نہ کوئی راہ گیر آجائے۔ پھر دل میں آیا کہ میں پہلے بھی چیختا چلاتا رہا ہوں پر کوئی بھی نہ آیا تو اب کون آئے گا مدد کو۔ ”یا اللہ اب میں کیا کروں۔“ میں نے خود کو کبھی اتنا بے دست و پا محسوس نہ کیا تھا۔ جتنا اس وقت کر رہا تھا بے بسی کے شدید احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں بے دم ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔ اب میں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ادھر شدید بدبوں نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا اور آہستہ آہستہ میرے ہوش وحواس میرے ساتھ چھوڑنے لگے۔

اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور میں اچھل کر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں اس منحوس مکان میں اس پگڑ والے سے ڈر کر داخل ہوا تھا اور اندر پہنچ کر میں نے دیکھا تھا کہ دو زینے مجھے نظر آئے تھے ایک دائیں جانب اور ایک بائیں جانب میں بائیں جانب والے زینے سے چڑھ کر اوپر آیا تھا تو پہلے کمرے تک پہنچا تھا اس کا مطلب ہے کہ دائیں جانب زینہ چوتھے کمرے تک پہنچتا ہوگا۔ مگر مشکل یہ تھی چوتھے کمرے میں وہ بھیانک لاش چھت سے لٹکی ہوئی تھی جس پر ہزاروں لاکھوں آدم خور مکھیاں چمٹیں ہوئی تھیں جن کی بھنبھناہٹ کی خوف ناک آواز میرے اعصاب کو ابھی تک جھنجھوڑ رہی تھیں مجھ پر اس کمرے کے تصور سے ہی کپکپاہٹ طاری ہو رہی تھی۔

پھر یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اگر میں نیچے پہنچ بھی گیا تو وہ سانپ مجھے ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا اور پھر کیا پتہ کہ وہ خوف ناک بلا بھی نیچے ہو۔ پھر یہ خیال آیا کہ سانپ تو کمرے میں بند تھا۔ لیکن وہ بلا بھی تو کمرے میں بند تھا پھر وہ کیسے باہر آگیا۔ جبکہ بلے کی نسبت سانپ آسانی سے باہر آسکتا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔

بالآخر میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے

کا فیصلہ کرلیا۔ جس دوہرے تہرے عذاب میں، میں یہاں گرفتار تھا کم از کم مجھے اس سے تو نجات تو ملے گی۔ پھر اگر یہ زندگی نہ سہی موت ہی سہی۔ کم از کم اس جان لیوا صورت حال اور دماغ پاش بدبوں سے جان تو چھوٹے گی۔

یہ سوچتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب چاہے موت ہی کیوں نہ آجائے لیکن رہائی کی آخری کوشش ضرور کرنی چاہئے یہ سوچ کر میں اس کھلے ہوئے دروازے کے قریب آیا جو چوتھے کمرے میں جاتا تھا وہاں کھڑے ہوکر میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور روشن کرکے اس کا رخ اس کونے کی طرف کیا۔ جہاں میرے اندازے کے مطابق دروازہ ہونا چاہئے تھا۔ ٹارچ کی روشنی لمبی لکیر کی طرح اس جگہ پر پڑی تو یہ دیکھ کر دل کو تسلی سی ہوئی کہ وہاں دروازہ واقعی موجود ہے میں نے ایک ہاتھ ناک پر رکھا ہوا تھا اور بھاگتا ہوا چوتھے کمرے میں داخل ہوگیا اور لٹکتی ہوئی لاش سے بچتے ہوئے تیزی سے اس دروازے تک پہنچا۔ اور اسے کھول کر باہر نکلا تو خوشی سے میرے دل بلیوں اچھلنے لگا۔

سامنے ہی لکڑی کا زینہ نظر آرہا تھا میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں وہ بلا یہاں سرکٹی بدروح قریب نہ ہوں مگر کوئی نہ تھا۔

لہٰذا میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر زینہ پر پیر رکھتا ہوا اترنے لگا زینہ چونکہ شکستہ تھا اس لئے بری طرح ہچکولے کھانے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں زینہ ٹوٹ کر نیچے نہ گر پڑے۔ یا اس کے ہلنے سے کہیں میں ہی نیچے نہ گر پڑوں مگر خدا کا شکر ہے ایسا نہ ہوا اور آخرکار میں نیچے پہنچ ہی گیا۔ جلتی ہوئی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی لیکن نیچے پہنچ کر جونہی میں نے ٹارچ کی روشنی راہداری کی طرف ڈالی تو مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ راہ داری کے درمیان وہی سیاہ ناگ زمین سے تین فٹ اوپر اپنا خوف ناک پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا آخر وہی بات ہوئی وہ بار بار اپنی زبان جو چار انچ کے قریب لمبی تھی باہر نکال رہا تھا۔ میرے قدم زمین پر گڑ کررہ گئے اور جسم جیسے پتھر کا ہوگیا اس خوف ناک عفریت کو باہر جانے والے واحد راستے پر موجود دیکھ کر میری رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اس وقت خون کا دباؤں جیسے میری کنپٹیاں پھاڑنے لگا۔

اس سانپ کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ میرا ذہن جیسے اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ موت کو اتنے قریب پاکر میری ہر حس بیدار ہوچکی تھی جسم کے سارے مساموں نے پسینے اگلنا شروع کردیا تھا۔ میرے حواس جواب دینے لگے تھے۔ کہ اسی وقت فضا میں ایک ہیبت ناک قہقہہ گونجا اور مکان کے درودیوار تھرا کررہ گئے آواز میرے پیچھے زینہ کی طرف سے آئی تھی میں نے بے اختیار سر گھما کر زینے کی طرف دیکھا تو دہشت سے میرا سارا وجود لرز کررہ گیا زینہ کے اوپر آخری سیڑھی پر وہی عورت کی ہیبت ناک سرکٹی لاش کھڑی تھی اس کا سر اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور اس سرکٹی لاش کے برابر ہی وہ آدم خور بلا کھڑا اپنی خوف ناک آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس کی آنکھیں دہکتے انگاروں کی مانند روشن تھیں۔ جن میں قہر وغضب کے جیسے شعلے لپک رہے تھے۔ میرے حلق سے کربناک چیخ نکلی اور میرے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی۔ میں نے ٹارچ اٹھائی تو میری نظر سامنے پڑی مجھ سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر وہ خوف ناک سانپ تھا جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے غافل پاکر نہ جانے کب وہ اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف بڑھا تھا اگر میرے ہاتھ سے ٹارچ نہ گرتی تو وہ خوف ناک سانپ بےخبری میں مجھے ڈس لیتا۔

اب موت مجھ سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھی۔ کہ اسی لمحے پیچھے سے بلے کی خوف ناک غراہٹ سنائی دی ساتھ ہی عورت کے سر سے ہیبت ناک قہقہہ گونجا اور میں نے سوچے سمجھے بغیر سانپ کے اوپر سے چھلانگ لگا دی اور راہ داری میں بھاگنے لگا۔

راہ داری عبور کرتے ہی سامنے دروازہ آ گیا جو ڈھانچے والے کمرے میں کھلتا تھا دروازہ اندر آتے

وقت میں نے کھولا تھا وہ اسی طرح کھلا ہوا تھا میں نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں ڈھانچہ رکھا ہوا تھا اس وقت موت کے خوف سے میرا دم سمٹ کر ٹانگوں میں آ گیا تھا۔ میرے پیچھے بلے کے غرانے کی اور عورت کے قہقہوں کی مسلسل آوازیں گونج رہی تھیں۔ مگر میں نے کسی طرف دیکھا تک نہیں اور بھاگ کر اس کھڑکی تک جا پہنچا۔ اور نہایت تیزی سے اسے کھول دیا۔ جہاں سے گزر کر میں اس شیطانی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی مجھے اپنے پیچھے اسی ڈھانچے والے کمرے میں بہت نزدیک اس بلے کے غرانے کی آواز آئی۔ مگر میں نے مڑ کر دیکھنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرے منہ سے ہذیانی انداز میں چیخیں نکل رہی تھیں۔

باہر گرتے ہی میں اٹھ کر گاؤں کی طرف دوڑا۔ اور دوڑتا چلا جا رہا تھا مجھے اپنے عقب میں اسی سر کٹی لاش کے قہقہے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ مگر میں اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اندھا دھند دوڑتا چلا گیا کئی بار میں گرتے گرتے بھی بچا تھا۔ مگر میرے پاؤں ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر جیسے تیسے گرتا پڑتا میں بالآخر اپنے گھر پہنچا۔ اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا ذرا دیر بعد ہی میرے ابا نے دروازہ کھولا۔ مجھے ہانپتا کانپتا اور اس وقت اپنے سامنے پا کر وہ بہت پریشان ہو گئے میں بدحواسی کے عالم میں اندر داخل ہوا اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ اور دروازہ سے لگا چند ثانیے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"شریم بیٹے تم اس وقت خیریت تو ہے کیا تم نے ......" اور ابا پرتشویش انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

میں ان کے ادھورے جملے پر چونک سا گیا تھا۔

"چل آ...... اندر آ جا۔" پھر انہوں نے جیسے میری کیفیت بھانپ لی۔ اور مجھے سہارا دینے کے انداز میں اندر کمرے میں لے آئے۔ اس عرصے میں میری والدہ بھائی عثمان اور چھوٹی بہن ماہی بھی جاگ کر میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ لوگ کیسے یک دم جاگ پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے سوئے نہ تھے۔ ان سب کے چہروں پر بھی بے نام سی سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ میری حالت کے پیش نظر ان کی یہ کیفیت رہی ہو۔ میں نے ذرا دیر بعد اپنے گھر والوں کو ان پراسرار واقعات کے بارے میں بتا دیا جو میرے ساتھ بیتے تھے۔ مگر اپنے آنے کا مقصد اور قاری ندیم صاحب کے پیغام کے بارے میں بتانا گول کر دیا۔

میری باتیں سننے کے بعد ان سب کے چہروں پر چھائی ہوئی سراسیمگی کے تاثرات میں اضافہ ہو گیا والدہ میری بلائیں لیتے ہوئے دعائیہ لہجے میں بولیں۔ "ہے ربا تیرا شکر ہے تو نے میرے بچے کو بچایا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہمیں یہ گاؤں چھوڑ دینا چاہئے۔"

میں اماں کی بات پر ذرا چونک پڑا۔ اور ان سے پوچھا۔ "کیا مطلب اماں...... کیا پہلے بھی یہاں یہ واقعہ کسی کے ساتھ پیش آیا ہے۔"

"ارے بیٹا کسی ایک کے ساتھ نہیں بلکہ پورے گاؤں کے لوگوں کے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آ رہے ہیں بلکہ دودھ والے پہلوان نے تو باقاعدہ سر کٹا بھی گاؤں میں گشت کرتے دیکھا ہے۔ جس نے اپنا سر خود اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔"

"کیا!" میں نے خوف سے جھرجھری لی۔ مجھے وہ پراسرار عمارت والی سر کٹی بدروح یاد آ گئی۔

"ارے نیک بخت تو چپ کر مجھے بات کرنے دے۔" ابا نے اماں سے کہا۔ پھر الجھن آمیز پریشانی سے مجھے مخاطب کر کے بولے۔ "شریم بیٹے کیا تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تھا۔"

"ہاں ابا میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا۔"

"میرا مطلب ہے بیٹا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سب تمہارا وہم ہو۔"

"نہیں ابا، یہ میرا ہرگز وہم نہیں تھا۔" میں نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ کیونکہ اس سے پہلے

آج تک میرے ساتھ ایسے واقعات اور حالات پیش نہیں آئے تھے۔

"حیرت ہے ماہی کے ابا اپنے شریم بیٹے کے ساتھ بھی بالکل ویسے ہی واقعات پیش آئے جو گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آتے رہے ہیں اور تم ہو کہ یقین ہی نہیں کررہے۔" اماں کے لہجے میں اس بار حیرت کے ساتھ تھوڑی سی جھلاہٹ بھی در آئی تھی۔

ابا کے چہرے پر بھی گہری تشویش کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔ پھر وہ پرسوچ انداز میں بولے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ میرا تو ان باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں کررہا۔"

"ابا ان پراسرار واقعات کے بارے میں گاؤں والوں نے قاری ندیم صاحب سے کوئی بات کی تھی؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ہاں کی تو تھی۔" ابا گومگوں کے لہجے میں سر ہلا کر بولے۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"انہوں نے سارے گاؤں والوں کو کچھ پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"انہوں نے اور کچھ نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ پراسرار واقعات آخر ہمارے ہی گاؤں میں کیوں پیش آرہے ہیں۔"

"نہیں وہ خود پریشان نظر آنے لگے تھے۔" ابا نے جواباً کہا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا اب میرے لئے یہ بات تجسس کا باعث بن چکی تھی کہ آخر قاری ندیم نے مجھے شہر سے کیوں خاص طور پر بلوایا تھا وہ مجھ سے ایسی کون سی بات کرنا چاہتے تھے اور اس اہم بات کے لئے مجھے ہی کیوں منتخب کیا تھا۔ بہرحال اب یہ تو ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہی پتہ چل سکتا تھا چنانچہ میں نے صبح سویرے ان سے ملنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

اگلے دن میں بیدار ہوا اور گھر سے قاری ندیم صاحب کی طرف چلا۔ گاؤں میں ان پراسرار واقعات کے بارے میں ہر ایک کو چہ مگوئیاں کرتے دیکھا۔ کوئی سر کٹے کے متعلق گفتگو کررہا تھا۔ تو کوئی پٹڑوالے بندے کے بارے میں...... اور جو پراسرار واقعات میرے ساتھ بیتے تھے وہ گاؤں کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ پیش آچکے تھے۔ البتہ میری بات ابھی مشہور نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل ودماغ ان شیطانی واقعات وحالات کو تسلیم نہیں کررہا تھا۔ لیکن میں انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ یہ خوفناک واقعات خود میرے ساتھ بھی پیش آچکے تھے۔

بہرطور میں حسب روایات مختلف لوگوں سے سلام دعا کرتا ہوا سیدھا قاری ندیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قاری ندیم صاحب کی عمر کافی طویل تھی وہ ایک باریش اور پرہیزگار متقی انسان تھے۔ رنگت سرخ چہرہ نورانی تھا۔ انہوں نے شاید میری آمد کے بارے میں اپنے خادموں سے کہہ رکھا تھا۔ یکدم جیسے ہی میں وہاں پہنچا ایک خادم نے ان کے حجرے میں جاکر میرے آنے کی اطلاع پہنچائی تو انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مجھے اندر بلالیا۔ میں اندر داخل ہوا تو حجرے کے پاکیزہ ماحول کی سحر انگیز خوشبوں میرے دل ودماغ کو ایک عجیب سی عقیدت بھری سحرانگیزی سے معمور کردیا تھا۔

قاری صاحب ایک چٹائی پر آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح سفید براق شلوار کرتا زیب تن کررکھا تھا۔

وہاں صرف ایک خادم ان کے نزدیک موجود تھا۔ میں نے ہولے سے سلام کیا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"شریم بیٹا آگئے تم......" اچانک قاری صاحب کی پرجلال آواز ابھری۔

"آپ کا حکم بھلا میں کیسے ٹال سکتا تھا۔"

پھر بولے۔ "اچھا ٹھہرو میں تم سے کچھ ضروری بات کروں گا۔" پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں وہاں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ میرے اندر کی تجسس آمیز بےچینی فزوں تر ہونے لگی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ قاری صاحب جلد از جلد مجھ سے ہم کلام ہوں اور مجھے یہاں

بلانے کا اپنا مقصد بیان کریں۔ خدا خدا کر کے سب انتظار ختم ہوا۔ مجھے ایک مٹی کے آب خورے میں خوش ذائقہ شربت پینے کو دیا گیا۔ اس کے بعد قاری صاحب نے مجھے اپنے اشارے سے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا اور میں ان کے قریب سرک آیا میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی میں نے نظر اٹھا کر قاری صاحب کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں جلال کی کیفیت محسوس ہوئی میں ان کی جلالی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں۔ تب ان کی پرجلال آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''شریم بیٹا...... اس گاؤں میں پراسرار واقعات کا پیش آنا اور تمہارے ساتھ بھی اسی قسم کی انہونی ہونا اور تو اور پراسرار عمارت کا قائم ہونا یہ سب کچھ بیٹا تمہیں روکنے کے لئے تھا۔ ہاں اگر تمہارے ماں باپ کی دعائیں تمہارے ساتھ نہ ہوتیں۔ یا تمہارا کردار اچھا نہ ہوتا تو اس پراسرار عمارت سے تمہاری واپسی زندہ حالات میں نہ ہوتی کیوں یہ سب کچھ۔ تمہارے لئے بچھایا گیا تھا کہ تاکہ تم نہ گاؤں آسکو اور نہ مجھ سے مل سکو کیونکہ تمہیں ایک قدیم اور تاریخی کام کے لئے چن لیا گیا ہے اور اس کام کو صرف اور صرف تم ہی پورا کر سکتے ہو۔''

''وہ قدیم کام کیا ہے؟''

''وہ آہستہ آہستہ تمہیں خود بخود پتہ چلتا جائے گا۔ اب میں اصل کہانی کی طرف آتا ہوں بیٹا تاکہ تمہیں ٹھیک طرح سے سمجھ آسکے۔

''عثمان بلوچ تمہارا چھوٹا بھائی ہے نا۔''

میں ان کی باتیں سنتے سنتے ان کے استفسار پر چونکا۔ ان کے لبوں سے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر سن کر یکدم میں پریشان سا ہو گیا اور گھبرا کر بولا۔

''جی قاری صاحب کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہوں۔'' انہوں نے ایک گھمبیر ہنکار بھری۔ پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مجھ سے گویا ہوئے۔ شریم بیٹا۔

''معاملہ انتہائی سنجیدہ نوعیت کا ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں شہر سے خاص طور پر بلوایا ہے ورنہ میں تمہارے والد سے ہی بات کر سکتا تھا۔ پر اس لئے نہیں کہا کہ تم خود اس کام کے لئے موضوع قرار دیے گئے ہو۔ کیونکہ تمہیں اس کام کو پورا کرنے کے لئے چن لیا گیا ہے۔ اس لئے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تو میں نے اپنی بے چینی پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''میں اس عزت افزائی کا مشکور ہوں قاری صاحب آپ کا حکم پر ہی میں حاضر ہوں۔''

''اب میری بات غور سے سنو!'' وہ بولے اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ہمہ تن گوش برآواز ہو گیا۔

''تم نے شاید یہاں گاؤں آتے ہی لوگوں کی زبانی سنا ہو گا کہ کچھ عرصے سے یہاں پراسرار واقعات جنم لے رہے ہیں۔'' وہ ذرا سانس لینے کو رکے تو میں نے اثبات میں دھیرے سے اپنا سر ہلا دیا۔

''تم کیا جانتے ہو کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟'' انہوں نے بغور میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے لہجے میں کہا اور میں ان کے اس عجیب سوال پر چونک کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں قاری صاحب۔''

''میاں یہ سب تمہاری وجہ سے اور تمہارے چھوٹے بھائی عثمان کی وجہ سے ہو رہا ہے۔'' قاری صاحب نے انکشاف کیا اور میں بری طرح چونک گیا۔ ''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں قاری صاحب۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''ہم بالکل درست کہہ رہے ہیں اور یہ حقیقت ابھی تک ہم نے اپنے تک محدود رکھی ہے۔''

''مگر میرے اور میرے بھائی کی وجہ سے یہ سب کیسے ہو سکتا ہے قاری صاحب معاف کیجیے گا میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔ اور قاری صاحب کا پرجلال چہرہ تکنے لگا۔ میں نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں برہمی کے آثار نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔

وہ بولے۔ ''شریم بیٹا میں تمہیں اب تفصیل سے بات بتاتا ہوں تاکہ تمہاری سمجھ میں آسکے۔ اور تم

بہتر انداز میں اسے سمجھ سکو ہو یکھو شریم بیٹا کچھ ان دیکھی طاقتوں نے تمہیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے اور تو اور قسمت کے دھارے میں بھی تمہیں یہ کام سرانجام دینا ہے اور اس کام کو صرف اور صرف تم ہی پورا کر سکتے ہو۔

آج سے ہزاروں برس پہلے ہمارے اس علاقے میں ایک بادشاہ امن حکومت کیا کرتا تھا بہت ہی اچھا بادشاہ تھا۔ اس کی ایک بیوی مان تھی اور ساتھ ہی اس بادشاہ نے ایک باہر بھی شادی کی تھی دوسری بیوی کا نام اومن تھی۔ بادشاہ امن کی پہلی بیوی مان سے کوئی اولاد نہ تھی امن کی دوسری بیوی اومن سے ایک بیٹی نفران تھی۔ جس سے بادشاہ امن بہت ہی پیار کرتا تھا اس بات کا امن کی پہلی بیوی کو پتہ چلا تو وہ نفران سے حسد کرنے لگی مان نے اپنے ایک شاہی جادوگر سے ساز باز کر کے پہلے تو نفران کی ماں کو اومن کو مار دیا پھر نفران کو اپنے ایک جادو کے زور سے زندہ حنوط کر کے دفنا دیا ایک اہرام میں اور اس شہزادی نفران کا اہرام آج تک کوئی تلاش نہ کر سکا۔ اور نہ ہی کسی کو معلوم ہے کہ وہ اہرام کہاں ہے اس شہزادی کی روح اب بھی اسی عذاب سے دوچار ہے۔ اب اس شہزادی کی روح کو اور اذیت دینے کے لئے وہ شاہی جادوگر کی بدروح یا آسیب کہہ لو۔ جس کا نام بھالی ہے وہ پھر سے واپس اس دنیا میں آنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنے دور میں پہلے تھا بھی ظالم اس نے اپنے دور میں بہت ظلم کئے ہیں۔ اب وہ واپس آنا چاہتا ہے اس دنیا میں تاکہ وہ اس شہزادی کی روح کو اور اذیت دے سکے۔

بھالی اپنے شاہی محل کے تہہ خانے میں ہی مر گیا تھا اور اور بھالی کی لاش گل سڑ کر اس تہہ خانے میں رہ گئی۔

قاری ندیم اتنا بتا کر خاموش ہوئے تو میں جیسے سحر زدہ سی کیفیت سے ابھر کر بولا۔ ”وہ شاہی جادوگر بھالی تو مر چکا پھر اس کی بدروح کا دوبارہ جنم کیسے ہوا؟“

”اب میں وہی تمہیں بتانے والا ہوں۔“ قاری ندیم گھمبیر آواز میں بولے۔

”شریم بیٹا تمہیں پتا ہے کہ وہ شاہی محل جس میں بھالی رہتا تھا آہستہ آہستہ معدوم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اس کے آثار بھی مٹ گئے پر اس کے مردہ وجود کی راکھ شاہی محل کے تہہ خانے میں رکھی ہے اور اس وقت بھالی کے محل کے کھنڈر پر جو گھر بنا ہوا ہے وہ کسی اور کا نہیں شریم تمہارا ہے۔“

میں اس انکشاف پر سرتاپا لرز اٹھا مگر میرے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔

”شریم سب سے پہلے تم نے اس بھالی کو مارنا ہے۔“

”کیسے؟“

”میں تمہیں بتاتا ہوں اس کے بعد تم نے شہزادی نفران کا اہرام تلاش کرنا ہے۔ جو کے موئن جو دڑوں کے کہیں آس پاس ہی ہے۔ جو تمہیں خود بخود آہستہ آہستہ پتہ چلا ہے کہ بھالی اب اپنا مردہ وجود حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی راکھ کو یہاں سے کئی سو میل دور گھنے جنگلات میں کالی دیوی کے ایک مندر میں لے جا کر وہاں کے مہا پجاری رام داس کے حوالے کر سکے۔ مہا پجاری رام داس زبردست کالی طاقتوں کا ماہر ہے اور اپنے انہی شیطانی منتروں کے باعث ماہر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھالی کو دوبارہ زندہ کرنے اور اسے ناقابل تسخیر بنانے کے لئے اس کے مردہ وجود کی راکھ کو کالے منتر کے ذریعے اس قابل بنانا چاہتا ہے تاکہ بھالی کی بدروح اس کے اندر حلول کر سکے یوں بھالی دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لوٹ آئے گا اور بنی نوع کے لئے درد سر بنے گا۔

شہزادی نفران کی روح جو پہلے ہی اس کے دیئے ہوئی اذیت ناک سزا جھیل رہی ہے اسے اور بھی اذیت دے سکے۔

”تاکہ کوئی بھی شہزادی نفران کو اس کی اذیت سے نجات نہ دلا سکے۔“ قاری صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہوئے۔ تو میں ان کی ساری اسرار بھری گفتگو سننے کے لئے

دمیں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گویا ہوا۔

''قاری صاحب یہ تو واقعی ایک تشویش ناک اور ناقابل یقین سی داستان ہے مگر چونکہ یہ آپ کی زبانی سن رہا ہوں اور آپ کا مقصد چونکہ صرف اور صرف انسانیت کی بھلائی ہے لہٰذا مجھے ان سارے واقعات پر یقین ہے اور اس میں میرا عمل دخل بھی پتہ چل گیا ہے پر میری اب تک ذہنی پریشانی دور نہیں ہوئی ہے کہ اس سارے شیطانی کھیل میں میرے بھائی عثمان کا کیا عمل دخل ہے۔''

''ہوں! ہم اب اسی طرف آرہے ہیں بھالی ایک شیطانی عامل تھا مرنے کے بعد اس کا جسم اب تک مردہ حالت میں محفوظ ہے جسے وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور شیطانی شعبدے دکھا کر گاؤں والوں کو خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ اس رات پیش آئے، واقعات اگر تمہاری ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ نہ ہوتیں تو تم اس پراسرار حویلی سے کبھی زندہ واپس نہ آتے۔''

بہر حال بھالی گاؤں والوں کو اس لئے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے کہ گاؤں والے گاؤں چھوڑ کر یہاں سے کوچ کر جائیں پھر اسے اپنے شیطانی مقصد کے حصول کی خاطر ایک زندہ شخص کی مدد کی ضرورت ہے جو اس کے مردہ وجود کی راکھ کئی سو میل دور جنگلات میں کالی کے بڑے مندر کے مہا پجاری رام داس کے حوالے کر سکے۔ اور اس مکروہ مقصد کے لئے بھالی کی بدروح نے تمہارے چھوٹے بھائی عثمان کا انتخاب کیا ہے۔''

قاری صاحب اتنا بتا کر چپ ہوئے تو میں دھک سے رہ گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' بے اختیار میرے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا۔

''یہ عنقریب ہونے والا ہے برخودار۔'' قاری صاحب نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

''تمہارے چھوٹے بھائی عثمان کو بھالی نے ساحر بنانے کے خواب دکھائے ہیں وہ راستے سے بھٹک رہا ہے اور اس نے بھالی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

قاری صاحب کے انکشاف پر میں دہل گیا میں اپنے چھوٹے بھائی عثمان سے بہت محبت کرتا تھا۔

اگر یہ بات کوئی اور مجھ سے کہتا تو میں بالکل اس کی بات کا یقین نہ کرتا مگر قاری صاحب کی بات کو میں جھٹلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''اب تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''تم اب جاؤ اور اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرو وہ اپنی زندگی اور آخرت کو جہنم نہ بنائے۔''

''قاری صاحب آپ بالکل بے فکر رہیں اگر یہ بات ہے تو میں ابھی جا کر اپنے بھائی کو اس باطل راستے پر چلنے سے روکوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لئے اپنے بھائی پر سختی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ میں نے جوش آمیز لہجے میں کہا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر بولا۔'' قاری صاحب بھالی کی بدروح نے اگر میرے بھائی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو؟''

''شریم بیٹا بھالی کے پاس بس اتنی ہی طاقت ہے کہ وہ لوگوں کو صرف دہشت زدہ کر سکتا ہے انہیں وہ جانی نقصان تو کیا بال برابر بھی نقصان پہنچانے کی سکت نہیں رکھتا۔ یہی بات میں نے تمام گاؤں والوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس کے شعبدوں سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ جو تمہارا بال برابر بھی نقصان نہیں کر سکتا اگر ایسا کوئی خوف ناک منظر دیکھیں تو فوراً با آواز بلند قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیں مگر لوگ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئے ہیں تاہم میں نے بھالی کی بدروح کی اور بھی معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کروں گا اب تم جاؤ اور میں نے جو کہا ہے اس پر فوراً عمل کرو پھر مجھے آ کر بتاؤ۔'' قاری صاحب نے اتنا کہہ کر اپنی آنکھیں موند لیں اور زیر لب بدبدانے لگے۔

انہیں عالم مراقبہ میں دیکھ کر قریب موجود ان کے خادم نے مجھے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ میں حیران و پریشان وہاں سے نکل آیا میں اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا مگر میرا ذہن قاری صاحب کی باتوں میں الجھا

ہوا تھا میں جانتا تھا کہ اس پراسرار راز کا ذکر انہوں نے صرف مجھ سے ہی کیا تھا اور ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے اس راز کو راز رکھنے کی تاکید کی تھی ورنہ میرے بھائی عثمان سے پورا گاؤں نفرت کرنے لگتا حتیٰ کہ میں نے یہ بات ماں باپ سے بھی مخفی رکھنے کا تہیہ کیا تھا۔

میں جب گھر پہنچا تو عثمان گھر پر نہیں تھا۔ ابا بھی گھر پر نہیں تھے امی باورچی خانے میں مصروف تھیں میں نے ماہی سے عثمان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ''عثمان اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے۔''

''اچھا میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں باہر آ گیا اور گلی میں سست روی سے چلتے ہوئے پھر میں سوچنے لگا کہ ''عثمان کہاں ہوگا۔ اسے میں کہاں تلاش کروں۔''

پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اس کے دوستوں سے پوچھوں کیونکہ میں اس کے چند دوستوں سے واقف تھا ایک تو مجھے پرچون کی دکان سے میں اپنے والد کے ساتھ بیٹھا نظر آ گیا اس کا نام قاسم تھا گاؤں کے لوگ چونکہ میری عزت کرتے تھے اس لئے قاسم کا والد مجھ کو دیکھ کر خوشی سے بولا۔ ''آ پتر...... آ بیٹھ تجھے خالص دودھ کی چائے پلاؤں۔''

''نہیں چاچا میں اپنے چھوٹے بھائی عثمان کو ڈھونڈ رہا ہوں آپ خوش ہیں نا اور قاسم تو کیسا ہے پڑھتا پڑھاتا بھی ہے یا...... سارا دن میرے بھائی کے ساتھ چڑیاں اڑاتا رہتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''شریم بیٹا۔ یہ دونوں بدمعاش چڑی مار ہوگئے ہیں۔'' چاچا بولے۔

''اچھا قاسم یہ بتا عثمان کو تو نے دیکھا ہے۔'' میں نے قاسم سے پوچھا۔

جواباً وہ بولا۔'' اسے میں نے دودھ والے پہلوان چاچا کے بیٹے فریدو کے ساتھ دیکھا تھا میرا خیال ہے کہ وہ دونوں قادر بڑھئی کے پاس اپنی غلیل بنوانے گئے ہیں۔'' میں رحمٰن چاچا کو سلام کرکے چلا آیا میں سیدھا پہلوان دودھ والے کی دکان پر پہنچا وہاں اس کے بیٹے فرید کو موجود نہ پاکر خاموشی سے قادر بڑھئی کے پاس پہنچا۔ اسے سلام کرکے میں نے دونوں کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں یہاں سے گئے ہیں۔''

سلام دعا کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ ''فرید اور عثمان کو گاؤں کے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا میں اس کا شکریہ ادا کرکے جنگل جانے والے راستے کی طرف ہولیا جنگل زیادہ دور نہ تھا کھیتوں کے پار کیکر کے گنجان درختوں والا طویل سلسلہ گھنے جنگل کی صورت میں پھیلا ہوا تھا جب میں کھیتوں کے درمیان والی بل کھاتی پگڈنڈی پر چلتا ہوا وسط میں پہنچا تو دور ہی سے میری نظر سامنے دونو عمر لڑکوں پر پڑی میں ان دونوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ فرید اور میرا بھائی عثمان تھے۔

میرے دل میں آئی کہ انہیں میں آواز دے کر روکوں مگر پھر کچھ سوچ کر اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ وہ دونوں جنگل میں داخل ہوچکے تھے میں بھی خاموشی سے ذرا ان کے قریب پہنچ گیا۔ مگر اس طرح کہ ان کی نظروں میں نہ آسکوں جانے کیوں میرا دل ان دونوں کی طرف سے عجیب سی بے چینی کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہوئے تو میں بھی چند گز کے فاصلے پر محتاط روی کے ساتھ موٹے تنوں والے درختوں کی آڑ لیتا ہوا بدستور ان کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر میں نے ان دونوں کو ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہوتے دیکھا۔ چونکہ وہ دونوں میری نظروں سے غائب ہوچکے تھے اس لئے میں ٹھہر کر چند ثانیے بغور دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا یہاں گھنے درختوں کے تنے بہت قریب قریب تھے تیز خاردار جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی میں بہ آہستگی قریب آ گیا اور جھاڑیاں پرے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا تو اچانک ٹھٹھک کر رک گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے ذرا ہی فاصلے پر ایک قدرے بلند ٹیلا تھا بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک کھوہ نما غار ہے میں نے ان دونوں کو اس تاریخ دہانے کے سرے پر کھڑے پایا پھر اچانک فرید کی سہمی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''یار عثمان مروا نہ دینا کہیں وہ

بدروح میرا خانہ خراب نہ کردے۔"

"ارے دل مضبوط کر یار میں نے تجھے بتایا نہیں کہ وہ بدروح میری دوست بن چکی ہے جب تو خود مجھے اپنی آنکھوں سے اس سے باتیں کرتا دیکھے گا تو تیرا سارا خوف دور ہو جائے گا۔ چل آگے بڑھ شاباش۔" عثمان نے اس کی ہمت بندھائی۔

عثمان کی بات سن کر میں سکتے میں آ گیا قاری صاحب کی باتیں درست ثابت ہو رہی تھیں پھر میں نے ان دونوں کو غار کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ تو میں بھی چھپتا چھپاتا غار کے دہانے کے قریب پہنچا۔ اور آڑ میں ہو کر اندر جھانکا۔ جنگل میں عجیب سی ویرانی مسلط تھی۔ حالانکہ دن کا وقت تھا پھر بھی چار سو ویرانی اور سناٹے کا راج تھا حتیٰ کہ کسی پرندے کے بولنے تک کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی جیسے سب کو سانپ سونگ گیا ہو خود مجھے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں بھی سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر محسوس ہونے لگیں۔

اندر روشنی ہو رہی تھی یہ چھوٹے سے مٹی کے چراغ کی روشنی تھی جو میرے بھائی نے جلا کر نیچے زمین پر رکھ دیا تھا وہ دونوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھے میں مبہوت سا ان دونوں کو تکے جا رہا تھا ان دونوں کی پشت میری طرف تھی اور چہرے دوسرے طرف۔

پھر اچانک میں نے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنی۔ عثمان کسی انجان زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا تب پھر اچانک مجھے سرد ہوا کا جھونکا محسوس ہوا میرے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی غار میں دھواں سا بھرنے لگا تھا پھر ان دونوں کے بالکل سامنے ذرا ہی فاصلے پر مرغولوں کو یکجا ہو کر ایک عجیب سی بدہیبت وجود میں بدلتے دیکھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کے ہیولے انسانی شبیہ میں تبدیل ہونے لگے میں دم بہ خود سا کھڑا اس غیر واضح شبیہ کو دیکھے جا رہا تھا میرے چھوٹے بھائی عثمان نے اب بڑبڑانا بند کر دیا تھا اس کے ساتھ دودھ والے کا بیٹا فرید بھی کھڑا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا انسانی شبیہ کا پراسرار ہیولا کثیف دودھیا رنگ کا تھا۔ تب مجھے غار میں ایک گونجتی آواز سنائی دی۔ بڑی مکروہ اور غیر عجیب۔ "عثمان مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میں تمہارا دوست ہوں۔"

اور اس کے جواب میں میرے چھوٹے بھائی عثمان نے اپنے ساتھ کھڑے فرید کے کاندھے پر ہاتھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "او ئے تو نے نہیں سنا یہ بدروح ہماری دوست ہے تو کیوں گھبرا رہا ہے دل مضبوط کر۔"

عثمان کے حوصلے دلانے پر فرید کا خوف ذرا کم ہوا تو بھالی کی بدروح نے دوبارہ عثمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "عثمان تو نے میرا کام کہاں تک پہنچایا ہے۔" اس کے انداز مخاطب میں ایک خاص قسم کا حکم تھا۔

عثمان جواباً مودب ہو کر بولا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو اس گھر سے بدظن کر کے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دوں۔ دراصل میرے بھائی جان اچانک شہر سے آ گئے ہیں۔" وہ چند ثانیے توقف کے بعد دوبارہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "کچھ میری مدد کرنا پڑے گی۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" بول بدروح نے پوچھا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے گھر والوں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دو۔ پھر وہ جیسے ہی خوف زدہ ہو کر گھر چھوڑ دیں گے تو میں اپنے گھر کا صحن کھود کر تمہارے مردہ وجود کی راکھ حاصل کر لوں گا۔"

عثمان کی بات سن کر میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔

"ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا مگر مجھے ایک انسان کی وجہ سے خطرہ ہے۔"

"کون سا خطرہ ہے کس سے خطرہ ہے؟" عثمان نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"اس کا نام قاری ندیم ہے۔" اس نے بتایا اور عثمان چند لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے پوچھا۔ "تمہیں ان سے کیا خطرہ ہے؟"

"تم نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے اس کے پاس

بہت کچھ ہے اور وہ طاقت اس کے ایمان کی ہے دیکھو تم اپنے مکان سے راکھ کو نکال کر کالی دیوی کے بڑے مندر میں مہا پجاری رام داس کے حوالے کرنا پھر تمہارا کام ختم پھر مجھے اپنا نیا جیون مل جائے گا پھر دیکھنا ساری دنیا میرے قدموں میں ہوگی۔ اور تم دونوں دوست دولت میں کھیلو گے۔"

عثمان نے جوش بھری خوشی سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں اب اپنی کوشش تیز کردوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور جلدی میرا کام ختم کرنے کی کوشش کرو۔" اس کے بعد وہ گاڑھا دودھیاں دھواں فضا میں تحلیل ہوکر غائب ہوگیا۔

عثمان اور فرید چلے تو میں جلدی سے پرے ہٹ گیا اور قریب کی جھاڑیوں میں چھپ گیا وہ دونوں خوشی خوشی باتیں کرتے ہوئے گاؤں کی طرف بڑھتے جارہے تھے جب کافی دور جاچکے تو میں نے بھی گاؤں کی طرف قدم بڑھادیئے مجھے اپنے چھوٹے بھائی عثمان پر بہت غصہ آرہا تھا وہ ایک شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا جس نے اپنی شعبدہ گری اور اونچے خواب دیکھا کر اپنا دست راست بنالیا تھا۔

مجھے تشویش ہونے لگی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ بدی کی طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ انسان کو کس قدر ذلیل وخوار کرتا ہے پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔

میرے دماغ میں آیا کہ میں عثمان کی خوب خبرلوں مگر پھر میں نے اپنے غصے پر قابو پایا اور دل میں طے کیا کہ پہلے میں عثمان سے پیار سے سمجھانے کی کوشش کروں گا اگر نہ مانا تب اس سے سختی کے ساتھ نمٹوں گا۔

قاری صاحب نے مجھے بھائی اور عثمان کے خفیہ گٹھ جوڑ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ سوفیصد سچ ثابت ہوا تھا۔ میں انہی پریشان کن خیالات میں چکراتا ہوا گھر پہنچا۔ تو عثمان موجود تھا اس وقت تو میں نے اسے کچھ نہیں کہا مگر جب رات کو وہ سونے کے لئے میرے کمرے میں میرے برابر کی چارپائی پر لیٹنے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ "عثمان تمہیں نیند تو نہیں آرہی۔"

"نہیں بھائی کیا کوئی خاص بات ہے۔" اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"ہاں خاص ہی سمجھو۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ "تم نماز پڑھتے ہو پانچ وقت کی۔"

"کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔"

"کبھی کبھی سے کیا مطلب تمہیں باقاعدگی سے نماز پڑھنی چاہئے اس لئے تو تمہارا ایمان کمزور پڑتا جارہا ہے اور تم ایک خبیث شیطان کی باتوں میں آگئے ہو۔"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں وہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکا ہوں سمجھے، تم اور فرید جس غار میں جس بدروح سے مل کر آرہے ہو وہ سب میں دیکھ چکا ہوں اور اس نے تمہیں اپنے جس ناپاک مقصد کے لئے بھٹکایا ہے میں اس سے بھی واقف ہوں۔

میری بات غور سے سنو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس بدروح کی شعبدہ گریوں سے پورا گاؤں عاجز آیا ہوا ہے اگر گاؤں والوں کو ذرا سی بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ تم اس بدروح کے آلہ کار ہو تو وہ تمہاری تکا بوٹی کرڈالیں گے۔" میں نے بالآخر اسے بھیانک نتائج سے آگاہ کیا اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

اس کے چہرے پر پہلے تو الجھن آمیز پریشانی چھا گئی پھر اس کا چہرہ پرسکون سا نظر آنے لگا۔

اور وہ سنجیدگی سے بولا۔ "بھائی جان اگر آپ کو ساری حقیقت کا علم ہوگیا ہے تو پھر یہ بھی سن لیں کہ میں اس سے اپنا تعلق نہیں توڑ سکتا۔ کیونکہ آپ اور گاؤں والوں کو اس کی طرف سے سخت غلط فہمی ہوئی ہے آج تک اس نے کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچایا وہ تو صرف اور صرف یہ چاہتا ہے کہ "وہ اچانک کہتے کہتے رک گیا۔

میرا دماغ عثمان کی بے وقوفی پر بھنا کر رہ گیا جی چاہا کہ

اس کے ایک تھپڑ رسید کردوں۔ مگر میں ابھی سختی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو عثمان جس بدروح کو تم نیک سمجھ رہے ہو وہ ایک شیطان ہے اس کی مدد کرکے تم خود پر ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت پر ظلم کروگے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے بھائی تم اس کی مدد کا خیال دل سے نکال دو۔ میں تمہیں اس بدروح کی اصلی حقیقت بتاتا ہوں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ جب تم اس بدروح کی اصلیت سے واقف ہوجاؤ گے تو تمہیں اپنی نادانی پشیمانی ہوگی۔

یہ کہہ کر میں نے قاری ندیم صاحب کی بتائی ہوئی بھالی کی حقیقت بتانے کے بعد دیکھا کہ عثمان کے چہرے پر اثر پذیری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے اور وہ خاصی دیر تک گم سم ہوگیا۔"

"بھائی جان اچھا ہوا کہ آپ نے ساری حقیقت بیان کرڈالی میں واقعی ایک بہت بڑا گناہ کرنے چلا تھا مجھے معاف کردیں۔"

میں نے خوش ہوکر اسے اپنے گلے سے لگالیا ایک بدروح کے چکر میں آنے سے بچ گیا جس سے مجھے اور میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا مجھے اب بھالی کی بدروح سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ قاری ندیم صاحب کے بقول بھالی کسی کا بال بھی باکا نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ اسے کوئی دوسرا جسم نہ مل جائے۔

میں اگلے دن پھر قاری ندیم صاحب کے پاس حاضر ہوا اور انہیں خوشخبری سنائی کہ "میں نے عثمان کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔" قاری صاحب بھی میری بات سن کر خوش ہوئے۔

"قاری صاحب بے شک بھالی کی حیثیت ہے مگر کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس خبیث سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیا جائے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اب اپنے ناپاک مقصد کے لئے کسی دوسرے معصوم انسان کو ورغلانے کی کوشش نہ کرے۔"

قاری صاحب میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولے۔ "بیٹا تم نے ٹھیک کہا ہے ہمارے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ اس بدروح کو اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھگانے کا ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا قاری صاحب؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اگر کسی طرح بھالی کے مردہ جسم کی راکھ کو نکال کر دریا برد کردیا جائے تو پھر اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوسکتا ہے۔"

"میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں قاری صاحب۔" میں نے بلاتامل پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹا یہ نیک کام تم ہی کرسکتے ہو قاری صاحب نے پرخیال انداز میں کہا۔"

"آپ بتائیں کہ میں کیا کروں۔ اور کس طرح یہ نیک کام کروں۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تمہیں سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لینا ہوگا اس کے بعد وہ گھر خالی کرکے صحن کی کھدائی شروع کردو بمشکل ڈھائی تین فٹ کی کھدائی کے بعد ایک چوکور آہنی ڈھکن نما دروازہ نظر آئے گا تم اسے کھینچ کر اوپر اٹھالینا۔ پھر اندر ایک زینہ نظر آئے گا جو زیادہ طویل نہیں، نیچے اترو گے تو تمہیں طاقچے میں ایک دیا جلتا ہوا دکھائی دے گا یاد رکھنا اسے تم نے اس وقت تک نہیں بجھانا ہے جب تک تابوت میں رکھی بھالی کی لاش کی راکھ نہ سمیٹ لو پھر اسے با آسانی بجھا کر باہر آجانا۔ اور فوراً اس راکھ کو جا کر دریا میں پھینک دینا۔ بس پھر بھالی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے گا۔

بس اس بات کا خیال رہے کہ اس پراسرار تہہ خانے کے طاقچے میں رکھا وہ چراغ جو ہزاروں سال سے روشن ہے وہ اس وقت تک نہ بجھنے پائے جب تک تم تہہ خانے سے باہر نہیں آجاتے۔"

"ٹھیک ہے قاری صاحب میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا اور جانے کی اجازت مانگی۔

قاری ندیم نے مجھے یہ کام جمعرات کے روز

کرنے کی تاکید کی تھی میں گھر لوٹ آیا آج منگل تھا اور مجھے یہ کام پرسوں یعنی جمعرات کے دن غروب آفتاب کے بعد کرنا تھا۔

میں نے سب سے پہلے عثمان کو اپنے مقصد کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ قدرے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''بھائی جان کیا اس میں آپ کی جان کو خطرہ تو ناں ہوگا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ ایک نیک کام ہے مگر مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ میری مدد کرے گا۔ اور میں بہ احسن وخوبی یہ نیک کام کر ڈالوں گا۔ کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے۔''

''ہاں ہاں بھائی کیوں نہیں۔'' وہ اچانک چونک کر بولا۔ ''بھائی جان کیا یہ خطرے کا کام کرنا ضروری ہے میرا مطلب ہے کہ اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے کیونکہ بھالی تو اپنے جسم کی راکھ کے بنا ادھورا ہے۔'' عثمان نے کہا۔

''نہیں عثمان مجھے یہ کام کرنا ہوگا یہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس نے جس طرح تمہیں اپنے ناپاک مقصد میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح کسی اور کو بھی بہکا سکتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا عثمان کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

اگلے دن یعنی بدھ کو میں نے اپنے گھر والوں کو ساری بات بتائی امی اور چھوٹی بہن ماہی تو بے چاری خوف زدہ ہوگئیں جبکہ ابا کچھ پریشان سے نظر آنے لگے۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ پیار سے بولے۔ ''شریم پتر مجھے خوشی ہے کہ تو ایک نیک کام کر رہا ہے پر اپنا خیال رکھنا۔''

بہرحال میں نے اپنے گھر والوں کو راضی کر ہی لیا۔ پڑوس میں غلام دانے والا رہتا تھا اس کا گھر خاصا بڑا تھا۔ دو میاں بیوی ہی تھے۔ اولاد نہیں تھی غلام سے مکان میں مرمت وغیرہ کا بہانہ کر کے میں نے سب گھر والوں کو ان کے ہاں منتقل کر دیا تھا جمعرات کی صبح تک گھر خالی ہوگیا میں نے قاری صاحب کی ہدایت کے مطابق اس راز کو آشکار نہیں کیا تھا بلاوجہ گاؤں میں ہڑبونگ سی مچ جاتی اس لئے میں نے ابا اماں اور بہن ماہی کو بھی اس راز کو راز میں رکھنے کو کہا تھا۔

میں نے ایک کدال کا بندوبست کر لیا تھا لالٹین کی ضرورت نہ تھی عثمان کو میں نے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتا تھا پر وہ میرے ساتھ رہنے پر بضد رہا۔ پھر ابا اور اماں کی بھی حمایت پر میں نے عثمان کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میں نے اس کے چہرے سے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان اور الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں یہ ہی سمجھا کہ شاید وہ خوف زدہ تھا میں نے پھر بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر وہ میرے ساتھ کام میں شریک نہ ہونا چاہے تو چاچا غلام کے ہاں چلا جائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا مجھے اس کے انکار پر حیرت بھی ہوئی۔

بہرطور اب ہم دونوں بھائی سورج کے ڈوبنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے ندیم صاحب کی نشاندہی کے مطابق صحن کے فرش پر تقریباً چھ فٹ مربع پر لکیر کھینچ دی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ منڈیر سے دھوپ سرکنے لگی شام کے سائے جھکنے لگے پھر نجانے کیوں میرے اندر بھی ایک عجیب سی کیفیت ابھرنے لگی۔ بالآخر جب ذرا دیر بعد سورج غروب ہوگیا تو میں نے اپنی کمر کس لی اور اللہ کا نام لے کر کدال سنبھال لی صحن کا فرش ویسے ہی کچا تھا۔ میں نے کدال سے زمین کھودنا شروع کر دی۔ عثمان نے میرے کہنے پر لالٹین کو ایک جگہ پر صحن میں لٹکا دیا۔ میں کدال چلائے جا رہا تھا جب میں ذرا ہانپنے لگا تو عثمان نے مجھ سے کدال لے لی اور خود شروع ہوگیا۔

دسمبر کی ٹھٹھرتی شام کے باوجود نجانے کیوں میری پیشانی پر ننھی ننھی بوند چمکنے لگی تھی کدال چلانے کی وجہ سے میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی لیکن اس کے ساتھ میں اپنے وجود کے اندر ہلکی سی کپکپی بھی محسوس کر رہا تھا۔ جو کسی طور بھی سردی کا بہرحال پیش خیمہ نہ تھی یہ کپکپی کسی اور ہی قسم کی تھی ایک انجانے خوف کی میں ذرا

ستانے کے بعد فوراً عثمان سے کدال لے لی۔ وہ بھی چند کدالیں مارنے کے بعد ہانپنے لگا تھا دوفٹ کے قریب گڑھا کھد چکا تھا مگر ہماری کدال کسی آہنی اور ٹھوس شے سے نہیں ٹکرائی تھی۔

رات اب کافی گہری ہو چکی تھی لالٹین کی روشنی میں ہم دونوں بھائیوں کے سائے کچی دیواروں پر لرز رہے تھے میں نے عثمان سے کدال لی تو اچانک میری نظر دیوار پر عثمان کے سائے پر پڑی میں نے دیکھا کہ عثمان کے سائے نے میرے ہاتھ سے کدال چھین لی اور مجھ پر وار کرنے کے لئے فضا میں بلند کی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا میں نے وہاں سے نظر اٹھا کر عثمان کی طرف دیکھا جو ویسے ہی خالی ہاتھ کھڑا تھا جبکہ کدال بدستور میرے ہاتھ میں تھی۔

''کیا ہوا بھائی جان؟'' اچانک عثمان نے مجھے گم صم پا کر پوچھا۔

''کک کچھ نہیں۔'' میں چونک کر بولا۔ میری نظریں پھر دیوار پر مرکوز ہو گئیں اب کیا دیکھتا ہوں کہ عثمان کا سایہ دھیرے دھیرے دیوار سے اتر کر سائبان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جدھر بدنما بانس سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی میں نے سراسیمہ انداز میں اپنے ساتھ کھڑے عثمان کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ البتہ اب وہ بھی خوف زدہ نظروں سے دیوار پر اپنے سائے کو حرکت کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ''بب بب بھائی جان یہ یہ کک کک کیا ہو رہا ہے؟'' دوسرے ہی لمحے لرزتی ہوئی آواز میں عثمان مجھ سے بولا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے دیکھا عثمان کے اس پراسرار سائے نے لالٹین کے بالکل قریب آ کر ذرا جھکتے ہوئے شاید پھونک ماری تھی کیونکہ لالٹین کی لو بری طرح لرزنے لگی میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

اچانک ٹھٹھرتی ہوئی فضا میں ایک سرد ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ اور اگلے ہی لمحے لالٹین کی لوں آخری بار زور سے بھڑک کر بجھ گئی میرے رگ و پے میں خوف کی سرسراہٹ دوڑ گئی چاروں اطراف تاریکی چھا گئی تھی۔

''بھائی جان آپ کدھر ہیں؟'' عثمان کی آواز ابھری۔ میں نے فوراً اسے تھام لیا اور بولا۔

''میں ادھر ہی ہوں عثمان ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں بھائی جان لگتا ہے کہ بھالی کی بدروح ہم سے ناراض ہو گئی ہے۔ بھاگ چلو۔ ورنہ وہ ہمیں مار ڈالے گی۔'' عثمان نے خوف بھری آواز میں کہا۔

''بے وقوف مت بنو وہ بدروح ہمیں خوف زدہ تو کر سکتی ہے مگر ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔''

میں نے اسے ذرا سخت لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر وہ میرے دونوں بازو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑے وہاں سے لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے دوبارہ جھڑکا پھر جیب سے ماچس نکال کر میں نے لالٹین دوبارہ روشن کر دی۔ اب میرے دل سے بھالی کا خوف دور ہو چکا تھا لالٹین روشن ہوتے ہی میں نے پھر دوبارہ پراسرار کوئی سایہ نہیں دیکھا۔

میں نے کدال پکڑی اور دوبارہ شروع ہو گیا۔ دو چار مزید کدالیں مارنے کے بعد اچانک کدال کا آہنی پھل کسی ٹھوس فولادی شے سے ٹن کر کے ٹکرایا۔ تہہ خانے کا دروازہ ابھر آیا تھا۔ پھر میں نے اور عثمان نے جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے مٹی پرے ہٹائی تو ہمیں اس پراسرار تہہ خانے کا بند دروازہ نظر آ گیا وہ خاصا سالخوردہ اور زنگ آلود ہو چکا تھا میں نے کدال کے نوکیلے پھل سے اسے اوپر اٹھایا۔ ڈھکن نما دروازہ کھلتے ہی ایک حد درجہ ناگوار بدبو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اور میرا جی الٹنے لگا۔ میں بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھے چند قدم پیچھے ہٹ گیا مگر میں نے دیکھا کہ عثمان پر اس ناگوار بدبوں کا کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ اور وہ جوں کا توں کھڑا نیچے تہہ خانے میں جھانک رہا تھا۔ پھر میں بھی جی کڑا کر کے آگے بڑھا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ اندر روشنی سی پھوٹ رہی تھی میں سمجھ گیا کہ یہ اس پراسرار دیئے کی روشنی تھی۔ جو جانے کتنے برسوں سے اندر نہیں

طاقچے میں رکھا روشن تھا۔ پھر اس روشنی میں مجھے ایک آہنی زینہ نیچے جاتا دکھائی دیا۔

میں نے دیکھا کہ عثمان کے چہرے پر اب خوف غائب ہو چکا تھا بلکہ ایک جوش سا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا میں یہی سمجھا کہ شاید یہ بدروح بھالی کو قابو کرنے کا جوش تھا۔ ''عثمان تم ادھر ہی رکو میں نیچے اتر کر بھالی کے جسم کی راکھ نکال کر لاتا ہوں۔''

''نہیں بھائی میں تمہیں اس خوف ناک تہہ خانے میں اترنے نہیں دوں گا میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ ضد کرتے ہوئے بولا تو میں چپ ہو رہا۔

پھر سب سے پہلے میں نے اپنے کاندھوں پر ایک بڑا سا مگر پرانا رومال رکھا تاکہ راکھ کو اس میں باندھ کر اوپر لا سکوں۔ پھر سب سے پہلے میں نے اللہ کا نام لے کر نیچے اترا۔ ناگوار بدبوؤں سے ابھی تک میرا جی متلانے لگا تھا لیکن نیک مقصد کو پورا کرنے کے جذبے سے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ تہہ خانہ زیادہ گہرا نہ تھا۔ ذرا ہی دیر بعد میرے قدم تہہ خانے کے فرش سے جا لگے پھر میں نے عثمان کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ پہلے ہی سے نیچے اترنے میں مصروف عمل تھا۔

میں نے اس پراسرار دیئے کی روشنی میں تہہ خانے کا جائزہ لیا وہ زیادہ بڑا نہ تھا فرش پر جھاڑ جھنکار پھیلا ہوا تھا۔ ایک طاقچے میں مجھے وہ پراسرار دیا نظر آیا اس کی روشنی بہت ہی دھیمی تھی۔ مگر اچھی خاصی روشنی بکھیر رہا تھا میں نے اس روشنی میں تہہ خانے کے وسط میں ایک دیمک زدہ بوسیدہ سا تابوت پڑے دیکھا۔ اس کی آبنوسی رنگت جگہ جگہ سے مٹیالی ہو چکی تھی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اس قدر کہ اس کے اندر مردہ جسم کی جلی کٹی ہڈیاں تک صاف نظر آ رہی تھیں جو راکھ کی طرف بھربھری محسوس ہو رہی تھیں میرا دل پھر سے دھک دھک کرنے لگا۔ یہ کوئی کم وحشت ناک ماحول نہ تھا۔ ایک ایسے پراسرار تہہ خانے کے اندر جہاں ایک شیطان کے برسوں پرانے خاکستر مردے کا بوسیدہ تابوت پڑا تھا اور یہی نہیں ایک طلسمی دیا بھی یہاں برسوں سے روشن تھا اس بات کو عقل تسلیم نہیں کر رہی تھی کیونکہ یہ بھالی کا شیطانی طلسم تھا اور مجھے بہر حال اس کا طاغوتی سحر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑنا تھا۔

میں نے سب سے پہلے عثمان کو سرگوشیانہ لہجے میں تاکید کی کہ وہ اس دیئے کی طرف نہ جائے کہیں اس کی بے ترتیب سانسوں یا اس کے وجود کے جھٹکے سے وہ بجھ نہ جائے۔ اس کے بعد میں نے تابوت کی طرف قدم بڑھائے میرے وجود میں ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی۔ ہر طور میں ہمت کر کے تابوت کے قریب پہنچ ہی گیا تابوت کا ڈھکن نہ جانے کہیں غائب ہو چکا تھا تابوت اس کے اندر بھالی کا خاکستر اور کٹا پھٹا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا جو راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کی خاکستر میں کھوپڑی کو چھوا تو ٹھیک اسی وقت تہہ خانے کی اسرار زدہ خاموشی میں ایک غیرانسانی کریہہ چیخ بلند ہوئی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر اچانک کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز ابھری جیسے کوئی ہانپ رہا ہو ایک سرد ہوا کا ٹھٹھرا دینے والا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو مجھے بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔

ٹھیک اسی وقت سامنے طاقچے میں دھرے ہوئے چراغ کی مدہم لو پھڑپھڑانے لگی میں پریشان ہو گیا اگر یہ دیا بجھ جاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی مگر خیریت رہی کہ اس کی لو ذرا دیر تک لہرانے کے بعد بجھی نہیں میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ سے بڑا رومال اتار کر تہہ خانے کے بوسیدہ فرش پر بچھا دیا۔ پھر عثمان سے کہے بغیر میں نے تابوت کے اندر سے بھالی کے مردہ وجود کی راکھ سمیٹنا شروع کر دی میری دیکھا دیکھی عثمان بھی راکھ سمیٹنے میں مصروف ہو گیا ہمارے ہاتھ لگاتے ہی مردے کی بچی کچی جلی ہوئی ہڈیاں بھربھری ہو کر راکھ میں تبدیل ہونے لگی تھیں ہم نے بہت کم وقت میں اور تیزی کے ساتھ کام نمٹایا۔ اور ساری راکھ رومال میں ڈھیر لگانے کے بعد میں نے رومال کے چاروں سروں کو گرہ لگا کر چھوٹی سی پوٹلی بنالی۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

تہہ خانے میں اب کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آوازیں معدوم ہوگئی تھیں اپنا کام نمٹانے کے بعد عثمان نے اچانک وہ پوٹلی اپنے قبضے میں لے لی۔

”بھائی اب جلدی سے اوپر آجاؤ“ یہ کہہ کر وہ زینہ کی طرف بڑھا مجھے اس کی اس اچانک حرکت پر حیرت تو ہوئی مگر میں خاموش رہا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

میں بھی اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا رہا ادھر عثمان غیر معمولی پھرتی کے ساتھ اوپر پہنچ چکا تھا پھر میں نے جیسے ہی سر ابھارا عثمان نے زور سے میرے سر پر لات رسید کی۔

میں اچانک اس حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً میں سیڑھیوں پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے آرہا۔ شکر تھا کہ مجھے کوئی خاص چوٹ نہ آئی تھی۔ مگر اپنے چھوٹے بھائی کی اس حرکت پر مجھے پہلے حیرت اور بعد میں بہت غصہ آیا چنانچہ میں گرتے ہی دوبارہ اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا پھر جب تک میں اوپر تک پہنچتا عثمان ن اوپر سے تہہ خانے کا ڈھکن گرادیا۔ میں چیختا چلاتا رہ گیا لیکن سنگدل نے ڈھکن نہ کھولا میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے اپنے بھائی کی اس حرکت پر بے حد افسوس اور دکھ ہونے لگا۔ میں نے پاگلوں کی طرح ڈھکن پر زور لگایا لیکن وہ نہ کھلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اوپر کوئی وزنی شے رکھ دی گئی تھی بے بسی اور دکھ کے شدید احساس سے میرا دل بھر آیا۔

میں پاگلوں کی طرح عثمان کو پکارنے لگا۔ ”عثمان میرے بھائی خدا کے لئے یہ ظلم نہ کر دروازہ کھول دو دیکھو تو جو کچھ کرنے چلا ہے وہ تیرے لئے نقصان دہ ہے۔“ مگر میری آواز تہہ خانے کے پراسرار ماحول میں گونج کر رہ گئی میں سیڑھیوں پر کھڑا کھڑا تھک گیا تو نیچے اتر آیا ہر سو سناٹے کا راج تھا۔

سامنے تہہ خانے میں دیوار پر دیا بدستور روشن تھا عثمان بھالی کے مردہ وجود کی راکھ مجھ سے چھین کر لے جاچکا تھا۔ جس سے میں پہلے ہی اس بھیانک حقیقت کا اندازہ لگا چکا تھا کہ عثمان مجھ سے راکھ والی گٹھڑی چھین کر کیوں بھاگا تھا اس کا واضح مطلب تھا کہ وہ بھالی کی بدروح کے اشارے پر چل رہا ہے اس نے مجھے دھوکا دیا تھا کہ وہ راہ راست پر آگیا ہے مگر مجھے دکھ کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہورہی تھی کہ کیا عثمان کا خون اس قدر سفید ہوچکا ہے کہ وہ بھالی کا آلہ کار بن کر اپنے سگے بھائی کا دشمن بن چکا تھا۔ مجھے اپنے بھائی کی اس حرکت پر غصہ تو تھا ہی مگر اب مجھے اس کی طرف سے تشویش ہورہی تھی کہ اس نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ سراسر تباہی و بربادی کی طرف جاتا تھا میں تو اب یہ سوچ سوچ کر پریشان ہی ہورہا تھا کہ اگر عثمان نے بھالی کے کہنے پر عمل کرڈالا تو بھالی ایک طاقتور شیطانی ساحر کے روپ میں زندہ ہوجائے گا اور سب کے لئے تو ہوگا ہی شہزادی نفران کے لئے بھی پریشان کن ہوگا پھر ناکامی کے احساس تلے مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی اور تب میرے اندر جوش کی ایک تیز لہر اٹھی اور میں ایک بار پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھا پھر دروازے کے قریب پہنچ کر اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں ہاتھ تہہ خانے کے سپاٹ ڈھکن نما دروازے پر جما کر اسے اوپر اٹھانے کے لئے پوری طاقت سے زور لگانے لگا جلد ہی دروازہ تھوڑا سا اوپر کو اٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ اوپر کوئی زیادہ وزنی شے نہیں رکھی گئی تھی۔

لہٰذا میں نے پہلے سے بھی زیادہ اپنے وجود کی ساری طاقت صرف کردی اور بالآخر پھنس پھنسا کر میں اس منحوس تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پورا گھر بھائیں بھائیں کررہا تھا ڈھکن کے اوپر چارپائی رکھ دی گئی تھی اور عثمان کا کوئی اتا پتہ نہ تھا میں نے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا جو کہ کھلا ہوا تھا میں وحشت کے عالم میں دروازے کی طرف دوڑا۔ اور باہر گلی میں آگیا پوری گلی تاریکی میں غرق تھی آسمان پر تارے بھی مدہم تھے مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس گھور تاریکی میں اسے کہاں تلاش کروں۔

تب اچانک مجھے اس غار کا خیال آیا جہاں میں

پہلی بار عثمان اور اس کے ہم خیال دوست فرید کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچا تھا اور وہاں میں نے عثمان کو بھالی کی بدروح سے ہمکلام ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی میں نے تاریکی اور ٹھٹھرتی ہوئی سردی کی پروا کئے بغیر اس غار کی طرف دوڑ لگادی میں کڑاکے کی سرد اور تاریک رات میں دوڑا چلا جا رہا تھا میرے دوڑنے میں دیوانگی تھی ایک وحشت تھی میں عثمان کو یہ خطرناک قدم اٹھانے سے ہر قیمت پر روکنا چاہتا تھا وہ نادانی میں بھالی کی باتوں میں آ کر اس کی مدد کر کے نہ صرف خود کو بلکہ پوری انسانیت کو مصیبت میں مبتلا کرسکتا تھا جس کا سارا گناہ عثمان کے سر جاتا لیکن اس بھالی نے جانے اسے کیسی پٹی پڑھا رکھی تھی کہ عثمان اس کے حکم کا غلام بن کر رہ گیا تھا اور مجھے یعنی اپنے بھائی کو بھی خاطر میں نہیں لایا تھا میں گرتا پڑتا اور ہانپتا کانپتا اس غار کے پاس پہنچا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے یہاں آسمان کھلا اور صاف تھا جوش نے میرے اندر ایک عجیب سی دلیری کو ہوا دی چنانچہ میں بے خطر غار کے اندر پہنچ گیا۔

ماچس میرے جیب میں موجود تھی یہ میری عادت تھی میں نے فوراً دیا سلائی جلائی اور غار روشن ہوگیا چھت سے مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ اور کوئی ذی نفس نہ تھا میں نے دیا سلائی پھینکی اور باہر آ گیا میرے اندر طوفانی ہلچل مچی ہوئی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عثمان کو کہاں ڈھونڈوں اچانک مجھے اپنے عقب سے آہٹ سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا تو میری نظروں کے عین سامنے ایک جھریوں بھرا چہرہ تھا جانے کیوں میرا دل دھک سے رہ گیا وہ ایک بوڑھا شخص تھا اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی اور کمر میں کوب سا ابھرا ہوا تھا اس نے لاٹھی پکڑ رکھی تھی مجھے اس کی یرقان زدہ نظریں اپنے وجود میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئیں اس کبڑے کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کیونکہ گاؤں کے تقریباً سبھی لوگ میرے دیکھے بھالے تھے۔ ”کس کو ڈھونڈ رہے ہو بیٹا؟“ اس نے کھرکھراتی ہوئی آواز میں پوچھا اسکی توانا آواز اس کے وجود سے میل نہیں کھاتی تھی۔

بہرحال میں نے کہا۔ ”باباجی میں ایک لڑکے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”لڑکا۔“ اس نے سوچتی ہوئی آواز میں دہرایا۔

”ہاں چاچا وہ میرا بھائی ہے اور مجھ سے دو سال چھوٹا ہے کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہیں۔ف

”ہاں یاد آیا۔ ایک لڑکے کو میں نے چھوٹی سی گٹھڑی پکڑے ادھر جنگل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”کب کب؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ابھی تھوڑی ہی دیر تو ہوئی ہے۔“ وہ بولا۔

”وہ کس طرف گیا ہے چاچا مجھے بتاؤ جلدی۔“

میں نے بے چینی سے پوچھا تو اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کردیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس طرف دوڑ لگادی۔ دوڑتے دوڑتے میں نے یونہی عقب میں دیکھا تو وہ کبڑا شخص غائب تھا میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے گٹھڑی والے جس شخص کو دیکھا تھا وہ یقیناً میرا بھائی عثمان تھا جس نے راکھ کی گٹھڑی تھام رکھی تھی میں اندھا دھند جنگل میں داخل ہوگیا جنگل بہت تاریک تھا عام حالات میں اس میں داخل ہونے کا تصور ہی میرے لئے محال تھا۔ لیکن اس وقت میرے سر پر ایک لگن اور ایک مقصد سوار تھا۔ میں نے عثمان کو آوازیں دینا شروع کردیں اچانک سامنے سے ایک روشنی سی ٹمٹماتی ہوئی نظر آئی میں ٹھٹھکا لیکن رکا نہیں۔

اور بالآخر دوڑتے دوڑتے اس کے قریب پہنچا وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی ٹمٹماتی ہوئی روشنی اس کے اندر سے آ رہی تھی اس بیابان اور گھنے تاریک جنگل میں اس جھونپڑی کو دیکھ کر حیرت تو ہوئی مگر پھر میں نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک جھونپڑی سے آواز ابھری۔ ”کون ہے اندر آ جاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔“

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہ آواز مجھے کچھ شناسی محسوس ہو رہی تھی میں دھڑکتے دل کے ساتھ جھونپڑی کی طرف بڑھا پھر مرتعش ہاتھ سے دروازے پر جھولتا بوسیدہ

ٹاٹ پرے ہٹا کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے فرش پر ایک بوڑھے شخص کو دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ یہ وہی پیلی آنکھوں والا کبڑا بوڑھا تھا جسے میں نے غار کے باہر دیکھا تھا اور اسی کی ایما پر میں عثمان کو ڈھونڈنے کے لئے یہاں تک پہنچا تھا مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ یہ اتنی جلدی یہاں کہاں سے آدھمکا۔

''بابا تم یہاں اتنی جلدی کیسے پہنچے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا وہ اپنی یرقان زدہ پراسرار آنکھوں سے میری چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا ہم تو صدیوں سے یہاں آباد ہیں اس کے اسرار بھرے لہجے میں مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔

''ڈورنہیں یہاں بیٹھ جاؤ۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے بولا وہ خود بھی جھونپڑی کے کچے سے فرش پر بیٹھا تھا میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا مجھے اپنے بھائی کو ڈھونڈنا ہے ہر قیمت پر۔''

میری بات سن کر وہ اسرار بھرے لہجے میں بولا۔ ''اوئے لڑکے اب تو اپنے بھائی کو کبھی نہیں تلاش کر سکے گا۔''

میں حیرت سا اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔'' اس نے جو کام کرنا ہے وہ اسے کرنے دے کیوں اس کا راستہ کھوٹا کرتا ہے۔'' اس بوڑھے نے مجھ سے ذرا سخت لہجے میں کہا تو میری آنکھیں پھیل گئیں گویا وہ میرے عزائم سے بھی واقف تھا میں نے غور سے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''باباتمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا بھائی کون سا کام کرنے جارہا ہے۔'' میری بات پر بوڑھے کے جھریوں بھرے چہرے پر پراسراری سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ایک عجیب سی سرسراہٹ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''مجھے کیا معلوم نہیں۔ میں سب جانتا ہوں کہ تو اس کو کیوں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ لیکن میری بات غور سے سن اس کے آڑے آنے کی کوشش مت کر اسے وہ کام کرنے دے جو اس نے کرنا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر دھک سے رہ گیا بہرحال میں نے کہا ''میرا بھائی ایک غلط کام کرنے جارہا ہے۔ میں اسے ضرور روکوں گا۔'' اور یہ کہہ کر میں واپسی کے لئے چل پڑا۔

میرے عقب میں اس بوڑھے کے قہقہے سنائی دیئے میں جیسے ہی جھونپڑی سے باہر نکلا اچانک مجھے جھونپڑی کے اندر سے شیر کی آواز سنائی دی میں ایک لمحے کو کانپ اٹھا۔ میرے قدم زمین پر جیسے جکڑ لئے میری دم بخود نظریں جھونپڑی کے دروازے پر جھولتی ہوئی ٹاٹ پر جم سی گئیں تب دوسرے ہی لمحے ایک شیر کو میں نے جھونپڑی کی دیوار چیرتے ہوئے اپنے سامنے جست بھرتے ہوئے دیکھا وہ اب میرے بالکل قریب آکر اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے یوں غرارہا تھا جیسے پلک جھپکتے میں وہ چھلانگ مجھ پر نہ لگادے۔

میں ایک لمحے کو اس کے خطرناک تیور بھانپ کر دہشت زدہ ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے قاری ندیم صاحب کی باتیں آگئی کہ اس شیطانی انسان کی بدروح شعبدہ دکھا کر خوف زدہ تو کرسکتی ہے مگر نقصان پہنچانے کی سکت نہیں رکھتی۔''

یقیناً یہ بھی اس کی ہی کارستانی ہوگی یہ خیال آتے ہی میرا خوف کچھ کم ہوا اور میں الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا شیر نے بھی دھیرے دھیرے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھنا شروع کردیا پھر میں نے دوڑ لگادی شیر بھی غراتا دھاڑتا ہوا میرے پیچھے دوڑنے لگا مگر میں رکا نہیں میں پوری قوت سے دوڑتا رہا شیر بھی بدستور میرے تعاقب میں دوڑا چلا آرہا تھا اگر وہ چاہتا تو آن کی آن میں مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ صرف مجھے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے اس لئے اب مجھے اس کی طرف سے حملہ نہ کرنے کی تسلی ہوتے ہی میں بھی بے خوفی سے دوڑتا چلا گیا۔ اچانک شیر کے دھاڑنے کی آواز معدوم ہوگئیں۔

میں نے عقب میں مڑ کر دیکھا شیر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے دوبارہ دوڑ لگا دی اچانک مجھے سامنے کسی انسان کا ہیولا دکھائی دیا میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا تو بے اختیار میرے حلق سے دہشت زدہ سی چیخ نکل گئی وہ ایک سر کٹا انسان تھا اس کے ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترشول تھا وہ ایک چھ فٹ چوڑے کاندھوں والا سر بریدہ انسان تھا جس کے کاندھوں سے سر غائب تھا پھر جیسے غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''نادان لڑکے کیوں ہمارا راستہ کھوٹا کرتا ہے باز آ جا ورنہ مارا جائے گا۔''

پھر میں نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا تو وہ سر کٹا انسان پیچھے سرکنے لگا میں نے دوسری طرف دوڑ لگا دی اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرا میرا سر کسی ٹھوس کٹے ہوئے درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا کہ میرے حلق سے اذیت ناک چیخ خارج ہوئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو پورا جنگل پرندوں کی چہچہاہٹ سے گونج رہا تھا میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا مجھے چکر سا آ گیا مجھے اپنی پیشانی پر ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی میں نے ہاتھ لگا کر زخمی پیشانی کو چھوا خون جم کر پپڑی کی صورت میں جم چکا تھا میں نے اس معمولی زخم کی پروا نہ کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی میں سیدھا گھر پہنچا تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا گھر میں میری اماں ابا اور چھوٹی بہن موجود تھی عثمان بیلچہ تھامے زمین کی مٹی برابر کر رہا تھا اسے دیکھ کر غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا وہ حیران سا ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو میرے اماں ابا بھی حیرت سے تکنے لگے۔ ''بول تو نے ایسا کیوں کیا بتا وہ راکھ کہاں ہے بول ورنہ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے غصے سے چراغ پا ہو کر اسے جھٹکے دیئے۔

وہ اپنی آنکھوں میں حیرت سمیٹتے ہوئے پریشانی سے بولا۔ ''بھیا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ میں نے کیا کیا ہے کونسی راکھ؟'' اس کے مزید جھوٹ پر میں اور بھنا گیا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ابا فوراً آگے آ گئے۔ وہ مجھے اس سے الگ کر کے بولے۔ ''شریم پتر یہ تیرے کو کیا ہو گیا کیوں اپنے بھائی سے لڑ رہا ہے۔''

''ابا یہ اس شیطان کا آلہ کار بن گیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے ابا کو وہیں کھڑے کھڑے رات کی ساری کتھا سنا دی اور غصیلی نظروں سے قریب کھڑے حیران و پریشان عثمان کے چہرے کو گھور سے دیکھنے لگا مگر وہ یوں انجان کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوں۔

ابا میری بات سننے کے بعد بولے۔ ''پتر تو نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا پتر تم تو ساتھ والے گھر میں تھے اور عثمان ہمیں لینے آیا تھا اس نے بتایا کہ ''جب تم دونوں تہہ خانے سے کام نمٹا کر باہر نکلے تو عثمان وہیں لیٹ کر سو گیا مگر جب صبح عثمان کی آنکھ کھلی تو تو غائب تھا یہ بے چارہ پریشان دوڑا دوڑا ہمیں بلانے آ گیا۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ پٹی عثمان نے پڑھائی ہو گی میں نے ایک بار پھر زہر خند نظروں سے عثمان کی طرف گھورتے ہوئے ابا سے کہا۔

''ابا یہ جھوٹ بول رہا ہے میری بات کا یقین کرو میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے آپ ایک طرف ہٹ جائیں ذرا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں چند قدم عثمان کی طرف بڑھا۔ پھر اسکے چہرے کی طرف نظر گاڑے ہوئے بولا۔ ''عثمان تم ابا اماں کو بے وقوف بنا سکتے ہوں لیکن مجھے نہیں کیونکہ میں تمہاری حقیقت سے واقف ہوں۔'' دیکھ میرے اچھے بھائی تو جو کرنے چلا ہے وہ نہ کر اب بھی تیرے پاس وقت ہے بدی کی طرف جانے والے سارے راستے تباہ اور ذلیل خوار کر دیتے ہیں تو ان راستوں کا خود کو مسافر نہ بنا ورنہ تیرا انجام بہت بھیانک ہوگا میری ہر بات مان لے اس شیطان کے مردہ وجود کی راکھ کو میرے حوالے کر دے۔'' میں نے آخری بار پیار اور نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی ابا اماں اور بہن حیران و پریشان کھڑے ہم دونوں کا منہ تکنے

جا رہے تھے۔میں نے دیکھا عثمان کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے۔

"وہ اُکل لہجے میں بولا۔"بھائی آپ تو خواہ مخواہ میرے دشمن بن گئے ہو مجھے تو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی آپ کیا کہہ رہے ہو، میں تو کسی کا آلہ کار نہیں بنا اگر ایسا کوئی خواب آپ نے دیکھا ہے تو اس وجود کو یہاں لے آئیں میں خود سب سے پہلے اس کا گلا دبوچ کراسے مارڈالوں گا۔" عثمان کے سفید جھوٹ پر ایک بار پھر میں ہتھے سے اکھڑ گیا۔اور پھر اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اسے رگیدنے کی کوشش کرتا۔

اچانک ابا نے آگے بڑھ کر میرا رستہ روک لیا اور پہلی بار وہ ذرا سخت لہجے میں مجھ سے بولے۔"شریم اپنے غصے پر قابو رکھو۔یہ مت بھولو کہ گھر میں اس وقت تمہارا باپ موجود ہے اس طرح تم دونوں آپس میں لڑو گے تو لوگ کیا کہیں گے کہ میں نے اپنے بچوں کو یہ تربیت دی ہے اور پھر لوگ بھی ہمارے دشمن بن جائیں گے۔"

"ابا میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے جو کچھ کہا وہ بالکل درست ہے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو چلیں ابھی قاری ندیم صاحب کے پاس انہوں نے ہی تو سب سے پہلے شہر سے اپنا آدمی بھیج کر مجھے بلایا تھا اور عثمان کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ ایک شیطان کی بدروح کا آلہ کار بن چکا ہے۔"

میری بات سن کر اب ابا بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے میں نے دیکھا کہ قاری ندیم کے نام پر عثمان کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔"ابا آپ خود سوچیں عثمان میرا بھائی ہے میں اس کا دشمن کیسے بن سکتا ہوں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ برے کام سے باز جائے۔"

اس بار اماں نے عثمان کے قریب آکر اس سے کہا۔"میرے لعل سچ کیا ہے بتادے شریم تیرا بڑا بھائی ہے وہ ضرور تیرا بھلا چاہے گا۔"

"اماں ایسی کوئی بات ہو تو میں بتاؤں ناں بھائی جان کو میری طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے۔" عثمان پر کسی کی نصیحت کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہو رہا تھا وہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھا تب پھر ابا نے بھی عثمان کو گھورتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"عثمان اگر تو جھوٹا نکلا تو یاد رکھنا میں بہت بری طرح تجھ سے نمٹوں گا۔"

"ابا آپ بھی مجھے ایسا سمجھ رہے ہیں۔" عثمان نے کاہ پھر وہ باقاعدہ رونے لگا۔

پھر آخر یہی فیصلہ ہوا کہ میں اور ابا عثمان کو لے کر قاری ندیم کے سامنے حاضر ہوں وہی اب اس مسئلے کا صحیح طور پر فیصلہ کرسکتے ہیں چنانچہ ہم سب پھر خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

جب اچھی طرح دن نکل آیا تو میں اور ابا عثمان کے ساتھ قاری ندیم کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوئے میں عثمان کے چہرے کا بھی جائزہ لے رہا تھا وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا صاف لگ رہا تھا کہ وہ قاری صاحب کے سامنے جانے سے کترا رہا ہے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔سامنے نظر پڑتے ہی میں بری طرح ٹھٹھک گیا۔سامنے قاری ندیم کھڑے تھے میں ہکا بکا سا رہ گیا۔"قاری صاحب آیئے اندر تشریف لائیں۔" میں نے احترام سے کہا اور راستہ دیا وہ اندر آگئے مجھے ان کی یوں اچانک آمد پر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی سوچا کہ اچھا ہوا کہ قاری صاحب خود ہی آگئے اب فیصلہ ہوجائے گا۔

سب نے بڑے احترام کے ساتھ انہیں سلام کیا پھر جلدی سے چارپائی پر نئی چادر اور تکیہ رکھ دیا گیا میں نے دیکھا کہ وہ بڑے غور سے عثمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور عثمان بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔"یہ اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تشریف لے آئے اب آپ سے کیا کہیں اللہ والے ہیں ہم بڑی پریشانی سے دوچار ہیں آپ ہی اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔" ابا نے نہایت احترام سے اپنی پریشانی بتائی۔

قاری صاحب باوقار لہجے میں بولے۔ ”ہاں یہ مسئلہ ہی ایسا تھا کہ مجھے خود یہاں آنا پڑا۔“

”اب آپ ہی کچھ کریں۔“ میں نے کہا اور ساری تفصیل انہیں بتادی انہوں نے ساری بات سننے کے بعد عثمان پر ایک نظر ڈالی پھر بولے۔ ”یہ سچ ہے کہ عثمان ایک بدروح کے کہنے پر عمل کرنے لگا تھا مگر ہماری اور شریم کی ملاقات اور مداخلت کی وجہ سے عثمان راہ راست پر آ گیا ہے لیکن رات والا واقعہ بھالی کی وجہ سے ہوا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”شریم بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے عثمان بے قصور ہے۔“ میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔

”ہاں شریم یہ سچ ہے کہ تو نے اس بھالی کے مردہ وجود کی راکھ حاصل کر لی تھی مگر عین وقت پر اس بدروح نے عثمان کا روپ بدل کر راکھ لے اڑی۔“

”مگر آپ نے ہی تو کہا تھا کہ بھالی کی بدروح میں اب اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی مردہ وجود کی راکھ کو لے اڑے۔“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے۔ ”ہاں وہ مختلف بہروپ تو بھر سکتا ہے مگر کسی ٹھوس شے کو چھونے یا ہاتھ لگانے کی اس بدروح میں طاقت نہیں ہے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ عثمان تمہارے سمجھانے بجھانے پر راہ راست پر آ گیا تھا چنانچہ اس کی خبر بھالی کو ہو گئی اس نے نئی چال چلی عثمان سے مایوس ہونے کے بعد اس نے شاہد پرچون والے کے بیٹے قاسم کو ورغلایا اور پھر اسے عثمان کا روپ دے کر تمہارے ساتھ کر دیا اور تمہیں قاسم پر اپنے بھائی عثمان ہونے کا دھوکہ ہوا۔“ انہوں نے کہا۔

میں نادم ہو گیا پھر بے اختیار ہو کر آگے بڑھ کر عثمان کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ ”میرے بھائی مجھے معاف کر دینا۔“

”نہیں بھائی جان اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں مجھے شرمندہ نہ کریں اماں ابا بھی خوش ہو گئے مگر میں عثمان سے جلدی سے الگ ہوتے ہوئے تفکر آمیز لہجے میں بولا۔ ”قاری صاحب اس کا مطلب ہے کہ اب بھالی کے مردہ وجود کی راکھ قاسم کے پاس ہو گی۔“

”ہو گی نہیں بیٹا یقیناً ہے۔“ قاری صاحب نے کہا۔ ”قاسم بھالی کی بدروح کے ورغلانے پر آ گیا ہے اس سے پہلے کہ قاسم کالی کے مندر کی طرف روانہ ہو جائے تم اس سے وہ راکھ چھین کر جلد از جلد اسے دریا برد کر دو۔“

”ٹھیک ہے قاری صاحب میں اس وقت قاسم کو جا کر پکڑتا ہوں۔“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”اس طرح نہیں اس سے چالاکی سے نمٹنا ہو گا یوں جوش میں خواہ مخواہ کا جھگڑا ہو جائے گا قاری صاحب بولے۔ ”اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس طرح چالاکی سے اس سے اگلواتے ہو میں اب چلوں۔“ یہ کہہ کر قاری صاحب چلے گئے۔

میں نے دیکھا کہ عثمان بھی ان کے پیچھے گھر سے خاموشی سے نکل گیا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور قاسم کے ساتھ کس طرح چالاکی سے اگلواؤں عثمان تو میرا چھوٹا بھائی تھا مگر قاسم سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا میں اس سے زبردستی کرتا بھی تو کس برتے پر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں گھر سے نکلا اور سید شاہد چاچا کی دکان پر پہنچا وہاں اتفاق سے قاسم بھی موجود تھا میں اپنے جوش کو دبا کر اسے دیکھتے ہی مسکرایا جواباً اس نے بھی مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ اور دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”آیئے بھائی جان کیا چاہیے۔“

میں جی کڑا کر کے اس سے ہاتھ ملایا پھر اس کے ساتھ ہی گدی پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

”قاسم مجھے کچھ نہیں چاہیے تم سے ایک بات کرنا تھی ضروری۔“

”ہاں ہاں بھائی جان بولیں میں سن رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”پہلے وعدہ کرو کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔“

”خیریت تو ہے بھائی جان کیا بات ہے میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“

میں نے بغور اسے کے چہرے کا جائزہ لیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”قاسم میں نے تجھے ایک بدروح سے بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”میں اس پر یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کے اور بھالی کی بدروح کے گٹھ جوڑ سے واقف ہو چکا ہوں تیری راکھ کی پوٹلی کی حقیقت سے بھی واقف ہوں جوں بقول قاری ندیم کے تمہارے پاس محفوظ ہے۔“

چنانچہ اب میں یہ چاہتا تھا کہ قاسم پر اپنی دھاک بیٹھا کر اس سے دوستی کرو اور اس کا ہم خیال بن کر اس کے ساتھ کالی مندر جانے کے لئے اس سے کا ساتھ دوں پھر موقع پاتے ہی راکھ کی پوٹلی اس سے چھین کر دریا برد کر دوں۔

لیکن میں نے دیکھا میری بات سن کر پہلے تو قاسم کا منہ کھلا اس کے بعد اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”بھائی جان آپ نے بھی اچھی کہی بھلا میں کوئی سفلی علوم جانتا ہوں اچھا مذاق کیا ہے آپ نے۔“ اس کی بات سن کر مجھے خفت سی محسوس ہوئی تاہم میں نے یہی سوچا کہ وہ بن رہا ہے میں پھر بولا۔ ”یار اب تو مخول نہ کر میں تیرا راز دار بننا چاہتا ہوں اور تیری مدد بھی کروں گا تو نے راکھ کی پوٹلی سنبھال لی ہے۔ یہ اچھا کیا چل میں بھی تیرے ساتھ کالی کے مندر چلنے کے لئے تیار ہوں ایک سے دو بھلے۔“

”راکھ کی پوٹلی کالی کا مندر۔“ وہ الجھ کر بڑبڑایا وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ ”بھائی جان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں میرے ابا نے یہ روحوں والی آسیب زدہ باتیں سن لی تو مجھے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پڑ جائے گی۔ چلیں میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

اگر قاری ندیم صاحب نے قاسم کی نشاندہی نہ کی ہوتی تو میں واقعی قاسم کے جھانسے میں آ جاتا۔ مگر ان کی بات غلط نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا مجھے قاسم کی مکاری پر غصہ تو آیا مگر میں نے ضبط سے کام لے کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا اسے پہلے ہی میری باتوں سے میری دماغی حالت پر شبہ ہو رہا تھا اب جو اس نے مجھے یوں اس طرح گھورتے ہوئے پایا تو وہ گھبرا گیا۔

”میں نے کہا اب زیادہ نہ بن مجھے اپنے ساتھ ملا لے دیکھ تیری طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ میں کسی بدروح کا دوست بن جاؤں پھر اپنی مرضی سے اس سے جو چاہوں کام کراؤں۔“

اب قاسم کی حالت غیر ہوگئی وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکین صورت بنا کر بولا۔ ”بھائی جان خدا کے لئے آپ چلے جائیں یہاں سے میرے ابا آ گئے تو وہ مجھے الٹا لٹکا دیں گے پہلے ہی گاؤں والے آسیب سے تنگ آئے ہوئے ہیں کہیں وہ لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اس میں میرا بھی ہاتھ ہے۔“

مجھے اس کی چالاکی پر بڑا غصہ آیا جب اس نے سیدھے طریقے سے منہ نہ کھولا تو میں نے گھی کو ٹیڑھی انگلی سے نکالنے کا سوچا اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تو تو ایسے نہیں مانے گا میرے جارحانہ تیور دیکھ کر اسے جیسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ میرے بارے میں جو سمجھ رہا ہے وہ بالکل درست ہے اس نے بھی پیچھے دو قدم ہٹ کر اپنی آستین چڑھالی میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”دیکھ قاسم جو تو کرنے جا رہا ہے وہ اچھا نہیں تو اپنے مفاد کی خاطر پوری انسانیت کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ تو ایک مردہ شیطان کو زندہ کر کے بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے میں تجھے کسی قیمت پر یہ گناہ نہیں کرنے دوں گا شرافت سے وہ راکھ میرے حوالے کر دے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

”میرے تیور دیکھ کر وہ پہلے ہی اپنی آستین چڑھا چکا تھا اب جو مجھے یہ کہتے سنا تو مجھ سے پہلے ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا اور مجھے زور کا دھکا دیا تو میں دکان کے اونچے تڑے سے نیچے آ رہا تھا اب تو میرا طیش آسمان کو چھونے لگا میں بھنا کر اٹھا اور پھر ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے آس پاس کے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ہمیں چھڑایا غصے اور جوش میں مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہ بات مجھے خفیہ رکھنا تھی یہ میری بہت بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

اس کی شہادت گاؤں کے دیگر لوگوں نے بھی دی بلکہ اس نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ میرا چھوٹا بھائی عثمان اس گھناؤنی کھیل میں شامل ہے۔ جس نے بعد میں مجھے بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی اب تو پورے گاؤں میں ہم دونوں بھائیوں کے خلاف کا زہر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گیا وہ لوگ مشتعل ہوگئے اور بھری چوپال میں ہم دونوں بھائیوں کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ ''یہ دونوں بھائی ایک ہیں ان دونوں کا منہ کالا کرکے پورے گاؤں میں گھمایا جائے ان دونوں کو سرعام پھانسی دی دی جائے۔ تاکہ پھر کسی کو کالا علم سیکھنے کی جرأت نہ ہوسکے دونوں کو ماردو۔'' غرض پورے گاؤں میں شور مچ گیا۔

ادھر میری حالت کاٹو تو لہو نہیں۔ احساس ذلت شرمساری اور انتہائے دکھ کے مارے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے سب سے زیادہ دکھ مجھے قاری صاحب کی باتوں سے ہوا تھا انہیں بھی میری طرف سے شدید غلط فہمی ہوگئی تھی وہ بھی انسان تھے غلطی ان سے بھی ہوسکتی تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ قاری صاحب کسی صورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ صبح سویرے کون تھا جوان کے بھیس میں ہمارے گھر آیا تھا اور تب پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بھالی کی بدروح کی تو کارستانی نہ تھی جو قاری صاحب کا روپ بھر کر مجھے غلط راہ پر ڈال دیا گیا تھا کیونکہ بھالی کی بدروح میں بہرحال جادوئی شعبدے دکھانے کی سکت تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔ اور بری طرح پچھتانے لگا کہ کاش میں اس وقت قاسم سے بھڑنے کے بجائے کم ازکم قاری صاحب کے حجرے میں جاکر ان سے تصدیق کرلیتا کہ آیا وہ ہی آئے تھے یا ان کے بھیس میں کوئی اور تھا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا چڑیا کھیت چگ چکی تھیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ان کا مطلب تھا کہ میرا بھائی عثمان ہی اصل مجرم تھا اور بھالی نے اس روز صبح کو آکر میرا اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال یہ قاری صاحب کی مہربانی تھی کہ انہوں نے پنچایت سے مجھے معاف کرنے کی سفارش کی تھی میرے پاس معافی تلافی کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا اس طرح کم ازکم میں اور عثمان سزا سے بچ سکتے تھے البتہ مجھے معافی مانگتے ہوئے دکھ بھی ہورہا تھا کیونکہ میں بے قصور تھا اور میرے معافی مانگنے کا مطلب تھا کہ میں مجرم تھا لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا اب تو گاؤں کے مشتعل لوگ ہمیں گاؤں سے نکالنے کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔

میں گھر پہنچا تو ابا کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا میں اندر سے کٹ کررہ گیا مجھ میں ان سے نظریں ملانے کی تاب نہ تھی، بیٹے تو اپنے باپ کا نام روشن کرنے اور ان کا سر فخر سے بلند کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ میں ان کا کیسا بدنصیب بیٹا تھا کہ ان کی پورے گاؤں میں بنی ہوئی عزت میری وجہ سے مٹی میں مل گئی تھی۔

''ابا میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں بالکل بے قصور ہوں۔'' میں نے اپنی آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے کہا مگر وہ اسی طرح چارپائی پر پاؤں لٹکائے اور سر جھکائے بیٹھے رہے ان کی خاموشی پر میرا دل مزید بھر آیا دکھ اور احساس ندامت کی ٹیس سی میرے وجود میں اترتی چلی گئی میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ان کے کاندھوں کو تھاما تو وہ بے جان سے ہوکر چارپائی پر لڑھک گئے۔ میں دہل گیا۔ ''ابا جان...... ابا جی۔'' میں انہیں پکارتا رہ گیا لیکن وہ تو بہت دور جاچکے تھے جہاں سے آج تک کوئی جاکر واپس نہیں آیا۔

وہ شخص جس نے آج تک اپنی عزت پر ذرا سا بھی دھبا بھی برداشت نہیں کیا تھا اور عزت کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا ایسا شخص بھلا کیسے بے عزتی کے اتنے بڑے داغ کو سہنے کا حوصلہ رکھتا یہ داغ ان کی موت نے دھویا وہ عزت کے لئے ہی جیے اور عزت کے لئے ہی مرگئے۔

گھر میں صف ماتم بچھ گئی گاؤں والوں نے جیسے ہم سے بالکل ہی ناتا توڑ دیا تھا کوئی ہمیں تسلی کے دوبول بھی کہنے نہ آیا تھا یہ بے حسی کی انتہا تھی کچھ بھی تھا خوشی غمی

میں تو شریک ہونا اخلاقی فرض ہوتا ہے چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی نہ آیا ابا کے انتقال کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ ایستادہ نیم کا سایہ دار گھنا پیڑ کٹ کر گر گیا ہے اب اس کی ٹھنڈی چھایا سے ہم محروم ہو چکے تھے اماں نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا ماں بہن نے ابا کی کمی کو زیادہ محسوس کیا تھا۔

"دیکھ لیا بھیا آپ کو بڑا ناز تھا گاؤں والوں پر آپ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے نا دیکھ لو اب ہم خود ان کے رحم و کرم پر ہو گئے ہیں۔" عثمان نے جیسے اپنے دل کا غبار نکالا۔

"یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے نہ تم اس بھالی کے پیچھے لگتے اور نہ آج ہیں یہ دن دیکھنا پڑتے۔" میں نے اسے گھور کر درشت لہجے میں کہا۔

"یہ میری وجہ سے نہیں آپ کی وجہ سے ہوا ہے بھائی جان۔"

ابا کے مرنے کے بعد عثمان کے اندر دلیری آئی تھی۔

"نہ آپ گرمی دیکھاتے اور قاسم کو بے گناہ مارتے تو یہ دن آج ہمیں نہ دیکھنا پڑتا بڑا درد تھا نا آپ کو گاؤں والوں کے لئے۔"

"بس کرو چپ ہو جاؤ۔" اچانک بہن ہم بھائیوں کے بیچ میں آ گئی اور روتے ہوئے بولی۔" ابا کو فوت ہوئے ایک دن بھی نہ گزرا۔ اور تم دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن چکے ہو اماں کی خبر لو وہ بے چاری زندہ لاش بن کر رہ گئی ہیں۔" واقعی یہ درست تھا ابا کے مرنے کے بعد اماں جیسے سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی وقت بڑے بڑے زخم بھر دیتا ہے بعض زخم ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے مرہم کی تہہ سے بار بار ابھر کر سامنے آتے ہیں غموں اور دکھوں کی جب ہم راہی مقدر بن جائے تو ایسے بدنصیب انسان کے زخم ہرے ہی رہتے ہیں۔

گاؤں والوں نے ہم سے بات کرنا تو کجا دیکھنا تک چھوڑ دیا تھا وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ہمیں لوگوں کی فضیحت کا نشانہ بنا پڑتا [illegible] تو شرارتی لڑکوں کا ٹولہ گھر کے قریب سے گزرتا تو زوردار نعرہ لگاتا۔"ان سب کو گاؤں سے باہر نکالو۔" اور پھر ہمارے مکان کے اندر پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی۔

عثمان مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا ابا کے مرنے کے بعد اس میں رہی سہی تمیز بھی ختم ہونے لگی تھی میں اس سے راکھ کی اس پوٹلی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ میں اس پر سختی نہیں کر سکتا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ راکھ کی پوٹلی ابھی تک عثمان کے پاس ہی ہے وہ موقع کا منتظر تھا چنانچہ میں نے اسے ایک دن نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے بھائی میری پیشانی پر جو بے عزتی کا داغ لگا ہے اسے ہم دونوں بھائیوں نے ہی دھونا ہے اور ایسا ممکن ہے اگر تم راکھ کی پوٹلی کو پنچایت کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو اصل حقیقت بتا دو تو ابا کی روح بھی خوش ہو جائے گی اور ہم بھی سر اٹھا کر جی سکیں گے۔"

میری بات سن کر عثمان نے مجھے تیز نظروں سے گھورا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔"بھیا آخر تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو ہمارے ساتھ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود تمہارے دل میں اب تک گاؤں والوں کے لئے درد بھرا ہوا ہے ایک بات سن لو بھیا میں اب اس پورے گاؤں والوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

مجھے ان کے بے رحمانہ سلوک نے بہت دکھ یا ہے میں باہر جاتا ہوں تو لوگ مجھ پر تھوکنے سے بھی نہیں چوکتے۔"

"میرے بھائی وہ غلط فہمی کا شکار ہیں بہر حال انہیں نفرت میں اس قدر حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے تھا یہ ان کی بھی غلطی ہے۔" میں نے عثمان کو محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔"دیکھ بھائی تو میری بات مان لے۔"

"ہرگز نہیں بھیا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔"وہ راکھ کی پوٹلی میرے قبضے میں ہے۔ اس روز قاری ندیم کے بھیس میں بھالی کی بدروح

ہی آئی تھی اور میں بھالی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اب دیکھ لیا ہے کہ یہ دنیا کمزور لوگوں کی نہیں بلکہ طاقتور لوگوں کی ہے۔ میں ان لوگوں کو ایک دن اچھی طرح اپنی طاقت دکھا کر رہوں گا۔ تم دیکھنا بھیا تم دیکھنا بھیا۔" وہ عجیب پراسرار لہجے میں یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور میں اپنی جگہ ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اس کے لہجے سے سرکشی کی بو محسوس ہوئی تھی وہ پہلے ہی بھالی کا آلہ کار بن چکا تھا۔ اب ان عاقبت نااندیش گاؤں والوں نے عثمان کے اندر سرکشی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں ایک طرف مجھے عثمان کی فکر لاحق تھی کہ وہ بھالی کا آلہ کار بن چکا تھا وہ برسوں پرانے ایک خبیث روح کو بھی جگانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا دوسری طرف گاؤں والوں نے ہمارا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ کوئی بھی میری بات ماننے کو تیار نہ تھا وہ سب لوگ بس ایک ہیٹ پر قائم تھے۔" کہ ہم لوگ بس یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔"

یہ تو قاری ندیم صاحب اور پنچائت کی مہربانی تھی کہ ہم ابھی تک ادھر ہی تھے۔ پھر ہماری زمین بھی تھی باپ دادا کے زمانے کی۔ اسے کس طرح چھوڑ سکتے تھے ان حالات میں ہمارا جینا پھر بھی دوبھر ہو گیا تھا۔

ایک بار تو جی میں آئی کہ عثمان کو اس کے حال پر چھوڑ دوں اور وہ جس خطرناک کام کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اس پر لعنت بھیجوں مجھے قاری ندیم پر بھی افسوس ہو رہا تھا کہ انہیں بھی عثمان کی وجہ سے میری طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اچانک مجھے خیال آ گیا کہ میں ان سے مل کر ان کی یہ غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور میری بات سنیں گے یہ ارادہ کرنے کے بعد میرے اندر ایک نئے عزم نے سر ابھارا۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"شریم بہت ہار بیٹھے، کیا تم بھول گئے کیا، کہ سچائی کی راہ میں چلنے والوں کو بہت سی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے بہت سی تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں اگر تم اپنے نیک مقصد سے ہٹ گئے تو ایک خبیث شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے کیونکہ تم ہی قاری ندیم کے بعد وہ واحد شخص جو جو بھالی کی بدروح کے ناپاک ارادوں سے واقف ہو اٹھو اور بدی کی طاقتوں کے خلاف ایک نیک عزم کے ساتھ کمربستہ ہو جاؤ یہ تمہاری زندگی کا اہم مقصد ہے۔"

یہ خیالات آتے ہی میں قدرتی طور پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا میرے اندر اب نئے عزم و ولولہ انگیز جوش نے سر اٹھایا تھا چنانچہ میں نے سب سے پہلے یہی فیصلہ کیا کہ قاری صاحب کی طرف سے اپنی گلوخاصی کروانے کے بعد عثمان سے نمٹوں گا۔ بے شک وہ میرا بھائی تھا۔ لیکن اگر وہ غلط راستے پر چلنے اور اپنے ناپاک ارادوں سے باز نہ آیا تو میں بھائی کا رشتہ بھلا کر اس سے سختی سے نمٹوں گا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ بھالی کی راکھ کی پوٹلی ابھی تک عثمان کے قبضے میں تھی جسے اس نے کہیں چھپا کر رکھا تھا کہ وہ اس سے پہلے کہ وہ اسے لے کر اپنی مہم پر روانہ ہو میں اس سے وہ پوٹلی چھین کر دریا برد کر دوں گا۔

میں گھر سے نکلا اور قاری صاحب کے حجرے کی طرف بڑھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ان کے سامنے موجود تھا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے مجھ میں قاری ندیم سے بات کرنے حتیٰ کہ ان سے نظریں ملانے کی بھی تاب نہ تھی۔ "یہاں رونے کے بجائے اللہ کے حضور رو، نادان نماز پڑھ اور سجدہ ریز ہو جا۔ وہ رحیم وکریم ہے تیری غلطی کو معاف کر دے گا۔"

اچانک قاری صاحب کی پرجلال آواز ابھری میں نے آبدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ "قاری صاحب کیا آپ بھی مجھے خطاوار سمجھ رہے ہیں۔ قاری صاحب میرا اللہ ہی جانتا ہے میں بے گناہ ہوں میرے دل میں اب بھی اس بھالی کو نیست و نابود کرنے کی تمنا موجود ہے۔ اور میں نے عہد کر رکھا ہے جب تک اسے نیست و نابود نہ کر ڈالوں چین سے نہیں بیٹھوں گا مگر مجھ پر یہ الزام نہ لگائیں کہ میں ان کے ساتھ جا ملا ہوں۔"

"ہم جانتے ہیں کہ اس معاملے میں تم بے قصور ہو۔" قاری صاحب عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولے تو میں چونک کر ان کا نورانی چہرہ دیکھنے لگا۔ "ہاں تم سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ تم بھالی کے بہروپ کو نہ جان سکے جس نے تمہیں عثمان سے ہٹا کر قاسم سے بھڑا دیا۔ اور تم بنا مجھ سے تصدیق کیے اس سے جا لڑے۔"

"ہاں قاری صاحب یہ میری غلطی تھی مجھے آپ کے پاس حاضری دینا چاہئے تھی۔" میں نے احساس شرمساری سے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم یہی چاہتے تھے کہ تم اپنے کیے کی سزا بھگتو اور تمہاری غلطی کا کسی حد تک ازالہ ہو جائے اب ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم اب ٹھیک راہ پر ہو۔" قاری صاحب کی اس حوصلہ افزا گفتگو پر میرا چہرے خوشی سے کھل اٹھا۔

"اپنا وقت ضائع مت کرو ابھی بہت سے امتحان سے تمہیں گزرنا ہے تم پر اب لازم ہو گیا ہے کہ جلد از جلد اپنا فرض ادا کرو اور اپنے بھائی عثمان سے جا کر وہ راکھ کی پوٹلی حاصل کرو اور خبردار...... اسے اب اپنا بھائی مت سمجھنا۔ اسے بس بھالی کا آلہ کار سمجھنا۔ جاؤ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔"

میں ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رکا اور سیدھا گھر پہنچا۔ عثمان آج صبح ہی سے غائب تھا دوپہر کے وقت کھانا کھانے بھی نہیں آیا تھا اس نے جو ناپاک کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا میں اس سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اس لئے اب میں اس سے قاری صاحب کے کہنے کے مطابق ذرا بھی رعایت نہیں برتنا چاہتا تھا مگر اب شام ہونے کو آئی تھی اور وہ نہیں آیا تھا۔

ایک لمحہ کو تو مجھے یہ خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں وہ اپنی مہم جوئی پر روانہ تو نہیں ہو گیا اماں اور بہن بھی پریشان ہو رہی تھی۔

میں اس وقت عثمان کی تلاش میں نکل پڑا اور پورا گاؤں چھان مارا۔ لیکن عثمان کا کہیں پتہ نہ چلا پھر میں جنگل کی طرف چل دیا جس کے سرے پر وہ غار تھا جہاں عثمان بھالی کی بدروح سے بات کرتا تھا وہاں پہنچا تو غار خالی تھا۔ میں اب لوٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے غراہٹ کی آواز سنائی دی میں ٹھٹک کر رک گیا میں یہی سمجھا کہ کوئی جنگلی جانور ہوگا۔

مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دائیں جانب کی جھاڑیوں سے ایک بلی نما جانور کو نکلتے دیکھا تو میں نے جلدی سے اپنی حفاظت کے پیش نظر ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا مگر پھر جیسے ہی وہ جانور قریب آیا تو میں اسے دیکھ کر بری طرح دہل گیا کہ وہ قبر میں سوراخ کرکے مردے کھانے والا ایک جو تھا۔ لیکن یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن میرے خوف زدہ ہونے کی اصل وجہ اس کا مکروہ چہرہ تھا انتہائی کالا سیاہ چہرہ لال انگارہ آنکھیں اور ناک کی جگہ صرف دو سوراخ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی یہ چہرہ جلتی سلگتی بھٹی سے نکالا گیا ہو میرے دل میں فوراً بھالی کی بدروح کا خیال آ گیا میں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا تب میں نے دیکھا کہ اس کے مکروہ چہرے کے باچھوں سے دو نوکیلے دانت برآمد ہوئے اور سرخ سرخ دوشاخہ زبان باہر لپلپانے لگی پھر ایک غراتی ہوئی کھردری آواز برآمد ہوئی۔

"اوئے ناداں تو ہمارا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں تجھے تیرے گھر والوں سمیت نیست و نابود کر ڈالوں گا تو نے میری جادوئی طاقت دیکھی نہیں کس طرح تجھے پورے گاؤں میں ذلیل و خوار کرکے رکھ دیا ابھی بھی وقت ہے اپنے گھر والوں کی زندگی برباد نہ کر اور ہمارا راستہ کھوٹا نہ کر۔"

آیت الکرسی کا ورد کرنے کے بعد میرے اندر کافی حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ "بھالی تجھے میں نیست و نابود کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ تو نے میرے معصوم بھائی عثمان کو بھی اپنے شیطانی جال میں پھانس لیا ہے مگر اب میں اس کا بھی لحاظ نہیں کروں گا بول کدھر ہے میرا بھائی؟" وہ میری بات سن کر غرایا۔

(جاری ہے)



نحوست زدہ

عروہ ہادی۔جنڈانوالہ

حویلی کے فرش پر ہٹا کٹا نوجوان آرام و سکون سے سویا مگر یہ کیا جب وہ صبح کے وقت اٹھا تو اس کی ٹانگ اپنی جگہ سے غائب تھی جسے دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہوا۔

جوش جنون والے دوسروں کی نہ ماننے والے اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں، سبق آموز کہانی

قدیم حویلی کو دیکھتے ہی موہن کو پہلا احساس وحشت کا ہوا تو وہ اپنے احساسات کو کوئی بھی نام نہ دینے سے قاصر تھا۔ حویلی آج بھی اپنی شان وشوکت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی تھی گوکہ طوالت کا لمبا سفر طے کرنے کے بعد پہلے والی رعنائی اور دلکشی نہیں تھی مگر وقار اور دبدبہ اب بھی برقرار تھا ہر دیکھنے والے کو ایک ہی نظر میں جکڑ لیتا تھا۔

موہن کا دماغ بھی کسی انجانی گرفت میں تھا ایک نامعلوم سی کشش نے اس کے وجود کا احاطہ کرر کھا تھا مگر حویلی کے جانب کھنچے چلے جانے کے باوجود اس کے دل میں بے چینی سی کروٹ لے رہی تھی۔ ولب چباتے ہوئے قدیم نقش ونگار والا دروازہ محویت سے تکے جا رہا تھا۔

وہ اپنے دوستوں سے شرط لگا کر آیا تھا کہ اس

حویلی میں ایک رات تنہا گزارے گا۔ اب شش و پنج میں مبتلا وہ عجیب سے احساسات سے دوچار تھا چاروں طرف سے جھاڑیوں درختوں اور ویرانے میں کھڑی اس حویلی کے متعلق اس کے دوست کہتے تھے کہ ''وہ آسیب زدہ ہے موہن کو ان کی باتوں پر ہنسی آتی تھی۔

ایک رات ہوسٹل کے کمرے میں تمام دوست باتیں کررہے تھے کہ اچانک گفتگو کا رخ ماورائی مخلوق کی طرف چلا گیا اور بات کرتے کرتے ایک نے اس قدیم حویلی کا ذکر چھیڑ دیا موہن جو کہ ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا ایک دم بے زار ہوگیا۔ ''کیا تم پھر سے اس حویلی کے بھوت والی باتیں لے کر بیٹھے، بچوں والی باتیں۔''

''یہ بچوں والی باتیں نہیں ہیں موہن پیارے۔'' اس کا روم میٹ وکرم اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''وہ حویلی حقیقت میں منحوس اور آسیب زدہ ہے۔''

موہن تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اچھا تو...... اس حویلی میں کوئی آتما رہتی ہے...... جو رات کو انسانوں کا خون پی جاتی ہوگی۔ یا کوئی بھوت جس کو دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہوگی۔ کئی سالوں پہلے وہاں پر کوئی قتل ہوا ہوگا۔ اور اب مرنے والے کی آتما پھر کس لوگوں سے انتقام لے رہی ہوگی۔ ایسے ہی ہے ناں؟'' موہن کی آنکھیں طنزیہ اور لبوں پر تمسخرانہ مسکان تھی۔

''ایسا نہیں ہے۔'' وکرم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں پر نہ کوئی آتما ہے نہ بھوت۔''

''تو پھر کیا ہے؟'' موہن نے پہلے کے سے انداز میں کہا اس کے سوال پر اس کے دوستوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دیپک نے موہن کو بغور دیکھا۔

''وہاں پر ایک بوڑھا شیطان رہتا ہے۔''

''کیا؟'' موہن نے حیرانی سے نا سمجھی کے انداز میں کہا۔

''وہاں ایک بوڑھا خونی شیطان رہتا ہے جس کی وجہ سے برسوں سے اس حویلی میں کسی نے قدم نہیں رکھا پوری حویلی پر نحوست برستی ہے بلکہ حویلی کے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرتا۔ اور اگر کوئی بھولا بھٹکا قسمت کا مارا حویلی میں چلا جاتا ہے تو موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ گیا تو کہاں گیا۔'' وکرم سنجیدگی سے بولا تو مارے ضبط کے موہن کا چہرہ لال ہوگیا۔

''اچھا......''

''ہاں......!''

موہن کے تمسخرانہ انداز نے دوستوں کی سنجیدگی پر کوئی اثر نہ کیا۔

''وہاں پر ایک خونی شیطان رہتا ہے ویری انٹرسٹنگ؟'' موہن کا تمسخرانہ انداز عروج پر تھا۔ اور پھر وہ ہنسنے لگا مگر اس کے تینوں دوست اب بھی سنجیدہ تھے۔

''اچھا تو پھر اس کے درشن کے لئے تو ضرور جانا چاہئے۔'' اور ہنس ہنس کر موہن کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں اور اپنی آنکھوں کو صاف کرکے بولا۔

موہن کی بات پر وہ تینوں بری طرح گھبرائے مگر موہن بضد رہا۔

''تم وہاں ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتے۔'' دیپک مسکرایا تو موہن کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔ اور اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی دیپک کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ساری رات حویلی میں رہ کر دکھاؤں گا۔''

''پاگل مت بنو موہن۔ حویلی کی نحوست کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچادے۔'' وکرم بہت پریشان ہوا مگر دیپک اور اشمن استہزائیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

''میں وہاں ضرور جاؤں گا۔'' موہن نے ٹھوس اور مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہاں بھائی جاؤ...... اپنے سسر سے مل آؤ۔'' اشمن طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''جو کوئی تحفہ دے تو ہمارا حصہ بھی رکھنا۔'' دیپک نے اشمن کو کندھا مارا۔ وکرم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

موہن چیلنج دینے والے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''ضرور میں وہاں جاکر اس سے آشیرباد لوں گا۔'' پھر ویک اینڈ پر وہ کھانے پینے کی کچھ اشیاء لے کر

حویلی میں رات گزارنے کے لئے چل پڑا۔

وکرم بہت مضطرب تھا ایک لمحے کے لئے تو دیپک اور اشمن بھی گھبرا گئے مگر موہن انا کا مسئلہ بنا چکا تھا۔

☆......☆......☆

جب بغیر تالے کا دروازہ کھول کر موہن حویلی کے اندر داخل ہوا تو وہاں کی ویرانی دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا ساری حویلی گندگی جالوں اور وحشت سے بھری پڑی تھی ویسے موہن دلیر اور بہادر تھا اکثر خطرناک سے خطرناک مہم میں کود جاتا تھا حویلی کی حالت دیکھ کر اور دل کڑا کر کے ساری حویلی کا چکر لگایا اوپر بنے تینوں کمرے بھی گرد اور مٹی سے اٹے پڑے۔ جا بجا مکڑی کے جالے اور چمگادڑوں کی گندگی تھی۔ نامعلوم سی بدبو نے موہن کا سر چکرا دیا تو وہ تیزی سے نیچے اتر آیا۔ نیچے بنے دو کمروں میں سے ایک کمرے کو بمشکل صاف کر کے اس نے بیگ رکھا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکالی کچھ گھونٹ حلق سے اترے تو اس کے حواس کچھ ٹھکانے پر آئے بوتل بیگ میں رکھ کر اس نے کپ اور چائے سے بھرا تھرماس نکالا اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔

حویلی کی پراسرار خاموشی نے اس کے دل میں عجیب سی گرہ لگا دی تھی۔ حویلی کے اردگرد جنگل اور جھاڑیوں کے ہوتے ہوئے بھی حیرت انگیز طور پر کسی بھی پرندے یا حشرات الارض وغیرہ کی آواز نہیں آرہی تھی۔ بہت ہی عجیب زندگی سے عاری سناٹا تھا۔

موہن کو تو سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ ساری رات اس تنہا اور ویران دہشت زدہ جگہ پر اکیلا کیسے رہے گا انسانی فطرت کے پیش نظر وہ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا مگر اس کے احساسات ابھی بھی بہت مضبوط تھے اور خوف پر قابو رکھتے ہوئے تھا۔

چائے کے دو کپ پینے کے بعد وہ خود کو کسی حد تک تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

اپنے جدید اسمارٹ فون سے اس نے دوستوں کو کال کرنے کی کوشش کی مگر اس ویران جگہ پر نیٹ ورک بھی کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ بے زاری، تنہائی اور اکتاہٹ سے گھبرا کر اس نے سیل فون پر گیم کھیلنی شروع کر دی کچھ دیر بعد وہ اس شغل سے بھی اکتا گیا۔

تنہائی اور وحشت جب اعصاب پر سوار ہو جائے تو مادی چیزوں سے سکون نہیں ملتا۔

وہ کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ویرانی اور جامد سکوت نے ایک بار پھر اس کے اوپر عجیب سی کیفیت طاری کر دی ایک لمحہ کے لئے تو اس کا دل چاہا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے مگر اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹکا دیپک اور اشمن کی استہزائیہ مسکراہٹوں اور باتوں سے بپھرا تھا کہ ہر حال میں وہ رات گزارے کم ازکم وہ دوستوں کے سامنے سبکی نہیں برداشت کرنا چاہتا تھا۔

دن ڈھل گیا سورج کی راجدھانی ختم ہوا چاہتی تھی رات کے سائے گہرے ہونے لگے تو حویلی کی وحشت میں بھی مزید اضافہ ہوتا گیا۔ وہ کتنی دیر اسمارٹ فون پر میوزک سے دل بہلاتا رہا پھر ٹفن میں موجود نوڈلز سے پیٹ بھر کر فرش پر چادر بچھائی اور لیٹ گیا۔

باہر ہر سو خاموشی اور جان لیوا سناٹا طاری تھا۔ پیٹ بھر جانے کی وجہ سے اب اس پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ اسے نیند نہ آئے مگر اس کی کوشش اکارت گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ نیند کی گہری جھیل میں ڈوب چکا تھا۔

موہن کی آنکھ درد کی شدت کی وجہ سے کھلی ایک ناقابل برداشت تکلیف اس کے وجود سے اٹھ رہی تھی وہ نیم غنودگی میں تھا۔ درد بہت شدید تھا مگر اس کے بوجھل اعصاب اسے ہوش میں آنے نہیں دے رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی سحر میں جکڑا ہوا تھا۔

موہن کی حسیات بیدار تھیں۔ مگر ذہن غنودگی میں تھا وہ سوئی جاگی کیفیت میں درد اور تکلیف محسوس کر رہا تھا معاً کھٹکا سا ہوا اس کی بند ہوتی آنکھیں کھلیں اور ایک عجیب سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

کوئی ٹھوس وجود تھا جو ہاتھ میں کچھ پکڑے

اندر داخل ہوا۔ موہن کا سر چکرا رہا تھا مگر وہ ساری قوت لگا کر خود کو گھسیٹتے ہوئے پیچھے لایا اور دیوار سے ٹک گیا۔ اس سارے عمل میں اس کا وجود ناقابل برداشت تکلیف سے دوچار ہو گیا مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے یہ درد کیوں اور کس وجہ سے ہو رہا ہے؟ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ کسی ان دیکھی قوت کی گرفت میں تھا۔

نجانے کہاں سے زردی مائل روشنی پورے کمرے میں نمودار ہو رہی تھی۔ وہ وجود اس کے سامنے کونے میں بیٹھ گیا موہن نے بغور اسے دیکھا وہ کوئی کمزور سا بوڑھا تھا۔ وہ عجیب ڈیل ڈول اور جھریوں زدہ چہرے کا مالک تھا۔

اسے دیکھ کر موہن کو کراہیت سی ہوئی۔ اس کے شعور میں کوئی کھٹکا سا ہوا مگر پھر دماغ کورے کاغذ کی مانند ہو گیا۔

بوڑھے کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں سے گوشت اٹھا اٹھا کر وہ اپنے پوپلے منہ میں ڈال رہا تھا۔ "بہت عرصے کے بعد اتنا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے۔" اس نے رغبت سے اپنی لمبی لمبی انگلیاں چوستے ہوئے کہا۔

موہن کو اس سے گھن سی آ رہی تھی کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

"آج رات تم میرے مہمان ہو۔ تمہاری تواضع کرنی چاہئے۔" ایک بار پھر بوڑھے کی باریک لرزتی آواز ابھری پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور موہن کی طرف بڑھا۔

"تم ہو کون؟" موہن کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

کبڑا بوڑھا اس کے سامنے آ کر بیٹھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی سرانڈ اور تعفن زدہ بو سے موہن کا دل جیسے ڈوبنے لگا اور اسے ابکائی آئی تو وہ بے اختیار پیچھے ہوا۔

بوڑھے کی غلیظ زدہ آنکھیں چمکیں اور اس کے ہونٹ مزید پھیلے۔ "میں یہاں کئی سالوں سے رہتا ہوں..... میرا نام تو کوئی ہے نہیں مگر سب مجھے "نحوست زدہ" کہتے ہیں۔ لو تم بھی کھاؤ۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا موہن کی طرف بڑھایا۔

موہن نے اس کے بلی کے ناخنوں کی طرح لمبے اور سیاہ پڑتی کھال والے استخوانی ہاتھ کو دیکھا اور اس کے وجود سے اٹھتی بدبو سے موہن کا سر چکرا کر رہ گیا اسے ابکائی آئی اور بے تحاشہ کھانستے ہوئے ہوش کی دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس نے آخری بار بوڑھے پر نظر ڈالی جو پوری دل جمعی اور انہماک کے ساتھ پلیٹ چاٹ رہا تھا۔

موہن کی آنکھ کھلی تو اسے درد پھر سے محسوس ہوا سر بھی بھاری اور بوجھل سا تھا۔ اس کے اعصاب اور حواس بیدار ہو چکے تھے۔

ہوش کی دنیا میں آتے ہی رات کا کریہہ منظر دماغ میں روشن ہوا پھر اچانک جھماکہ ہوا کہ وہ رات میں بوڑھے نحوست زدہ خونی شیطانی سے مل چکا تھا نجانے وہ کس کا گوشت اتنی رغبت سے کھا رہا تھا۔

موہن نے اٹھنا چاہا مگر درد کی ٹیسوں نے اسے بے حال کر دیا، اسے محسوس ہوا کہ درد کا محرک کہاں ہے؟ اس نے جسم سے لپٹی چادر کھینچ کر علیحدہ کی اور جسم کے نچلے حصے پر نظر پڑتے ہی اس کے حلق سے دلخراش کراہ نکلی گئی۔

دائنی ٹانگ گھٹنے سے کاٹ کر علیحدہ کر لی گئی تھی موہن بخوبی سمجھ گیا کہ اس کی ٹانگ کہاں گئی؟ گوشت کھاتا منحوس بوڑھا اس کے ذہن کے پردے پر اترا اور موہن تکلیف و اذیت سے بلبلایا۔ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اس نے اپنے دوستوں کی باتوں کو یاد کیا۔

نحوست نے واقعی اس کی خوشیوں کو نگل لیا تھا، حویلی پر ہی نہیں بلکہ موہن پر بھی منحوسیت چھاپ دی گئی تھی۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دل کو ساماں سکوں کا مل جائے
زندگی کو مدعا مل جائے
سب سے پیش آؤ احترام کے ساتھ
جانے کس بھیس میں خدا مل جائے
(ایس حبیب خان.....کراچی)

سکوتِ خلق سمندر کی نیند سوتا ہے
سکون نہ جان، بظاہر جو اضطراب نہ ہو
بس ایک نام کا تارہ چمکتا رہے
گلہ نہیں جو مقدر میں ماہتاب نہ ہو
(انتخاب.....ساحل دعا بخاری)

جو آسمان پہ ہمیشہ رہا ہے آج اسے
ہمیں بتانا ہے اک جگہ زمین بھی ہے
انا پرست ہے وہ جانتے ہیں ہم لیکن
وہ خود بلائے گا اس بات کا یقین بھی ہے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

ہم نے خوشیوں کی طرح دکھ بھی اکٹھے دیکھے
صفحہ زیست کو پلٹو گے تو یاد آؤں گا
اس انداز میں ہوتے تھے مخاطب مجھ سے
خط کسی اور کو لکھو گے تو یاد آؤں گا
(انتخاب: محمد علی ولد شاہد علی.....کراچی)

میرے دل کی راکھ کرید مت، اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
چراغ پھر چراغ ہیں کہیں ہاتھ تیرا جلا نہ دے
ذرا دیکھ چاند کی پتیوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
تیرا نام لکھا ہے ریت پہ کوئی لہر آ کر مٹا نہ دے
(انتخاب: جاوید عرف مائیکل.....کراچی)

آیا ہی تھا خیال کہ آنکھیں چھلک پڑیں
آنسو کسی کی یاد سے کتنے قریب تھے
(انتخاب: محمد اسحاق انجم.....کنگن پور)

پڑے تھے پاؤں میں چھالے لیکن
تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا بچھا کے چلے
(انتخاب: عمر دراز.....کھڈیاں خاص)

شام سے سوچ رہا ہوں میں
چاند کس شہر میں اترا ہوگا
(انتخاب: جہاں اکرم.....کھڈیاں خاص)

دوست کہتے ہیں مجھے، اندھے کنوئیں میں کود جا
اور اس کے بعد جو گزرے گی دیکھا جائے گا
(انتخاب: ولید.....کھڈیاں خاص)

مرتی ہوئی زمین کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے
وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ کر کے دکھانا پڑا مجھے
(انتخاب: محمد اسحاق انجم.....قصور)

اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے
(انتخاب: افتخار احمد.....پھلریاں تلومنڈی)

اگر رک جائے میری دھڑکن تو اسے موت نہ سمجھنا
کئی بار ایسا ہوا ہے تجھے یاد کرتے کرتے!
(عبدالستار انجم.....قصور)

سراپا اشک ہوں میں بھی بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں بادل ادھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے
(انتخاب: ماسٹر محمد یٰسین انجم.....منڈی احمد آباد)

کبھی کبھی پتھر کے ٹکرانے سے آتی نہیں خراش
کبھی اک ذرا سی بات سے انسان بکھر جاتا ہے
(انتخاب: ذیشان عرف بلو.....کراچی)

کیوں کچھ سوچ کر میں اپنا دل چھوٹا کروں
وہ اتنی ہی کر سکا وفا جتنی اس کی توقعات تھیں
(انتخاب: آمنہ جاوید.....کراچی)

☆☆

غزل

تیری ان جھیل سی آنکھوں میں دیکھی جو اداسی کی لہر
تم نے تو ظاہر نہ کیا مگر قصور وار خود کو سمجھتا ہوں
نہیں ہے میرا کوئی سوال تم سے اے ہمدم
یقین مانو میں تو بس التجائے زندگی کرتا ہوں
ہوگئی شام زندگی کی اک دو پل کا ساتھ دے
حیات کر اپنی نام میرے میں یہ کب کہتا ہوں
تسلی جو خود کو دی کہ خوش ہوں تیرے بن
غم بھی چلا اٹھا میں بھی تجھ میں رہتا ہوں
تجھ سے بچھڑ کے زندہ ہوں کیسے اس جہاں میں
بہت ہوچکے غم اب اس جہاں کو کوچ کرتا ہوں
آج میں بہت برہم ہوں خود سے اے صائم
آخر کیوں میں اپنے احساسات لکھتا ہوں
(ظہور احمد صائم......لاہور)

وہ سنا ادھر سے گزر گئے
میرے دل کے در سے گزر گئے
ہیں نصیب میں ان کے منزلیں
وہ اگر بھنور میں سے گزر گئے
کیا بتائیں یہ بھی ہوا کبھی
کہ ہم اپنے گھر سے گزر گئے
گو قدم قدم پہ تھیں مشکلیں
پھر بھی ہم سفر سے گزر گئے
تیرے بھولے میرے خیال میں
میری چشم و تر سے گزر گئے
یہ زمانہ امتیاز ہے انہیں کا جو
بلا خوف ادھر سے گزر گئے
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

موسم کی رداؤں کا مجھے خوف بہت ہے
جذبوں کی صداقت ہے سبھی اپنی جگہ پر
بے لوث وفاؤں کا مجھے خوف بہت ہے
ہے افق پہ افسردہ سا اک شام کا منظر
ان روتی فضاؤں کا مجھے خوف بہت ہے
ہے درد کے پہلو سے شب وصل بھی لپٹی
مانوس صداؤں کا مجھے خوف بہت ہے
اب حُسن کی تابانیاں بھاتیں نہیں مجھ کو
زُلفوں کی گھٹاؤں کا مجھے خوف بہت ہے
عامر مرے ہمراہ نہ جگنو ہے نہ تارا
رُخصت کی دُعاؤں کا مجھے خوف بہت ہے
(عامر زمان عامر......بورے والا)

قریۂ خلوت میں عمر بھر میری بسر ہوجائے
کاش! کہ دشت میرا گھر ہوجائے
خواہشوں کی راکھ میں لپٹا وجود
بے خواب رتوں کا منظر ہوجائے
تلخی درد رہے تبسم میں پنہاں
چہرہ زرد آنکھ سمندر ہوجائے
رنج یوں ہی جاوداں ہے
اشک چنتا رہوں اور سحر ہوجائے
رت جگوں کے ادھ کھلے دریچوں میں
دامن خیال لہو سے تر ہوجائے
اداسیوں کی اب یہی صدا ہے
نخل الفت بے ثمر ہوجائے
آسودگی کا نام لیتا ہی نہیں واجد
خدا کرے یہ دل پتھر ہوجائے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

زمانہ کی زمانے کو ہمیں تو تم سے ہے مطلب
جو. چاہو تو اپنا لو ہمیں جو چاہو تو ٹھکرادو
مگر تم جو اپنا لو گے تو زندگی جی اٹھیں گے ہم
کسی کی آخری خواہش سمجھ کر ہی چلے آؤ
یہ جیسے بھی ہوا بس ہوگیا ہمیں تم سے پیار

پرکیف اداؤں کا مجھے خوف بہت ہے

فقط دو چار بولوں سے ہماری زندگی بڑھا دو
نہ ہو پائے تم جو ہمارے ہمیں پھر بھی گلہ نہ ہوگا
ہماری بے رنگ سی زندگی میں اک رنگین شمع جلا دو
خوشی سے مل کر ہم کو خوشی سے الوداع کہہ دو
ہماری سوچ کے ہر زینہ کو اک نئی راہ دکھلا دو
(طارق محمود......کامرہ کلاں اٹک)

میرے ہم سفر تو حساب دے، میں ہوں بے زباں تو جواب دے
پل بھر میں پورا جو ہو سکے، میرے آنسوؤں کو وہ خواب دے
تیرا لمس ہو میری زندگی، جو کھیلوں بس تیرے واسطے
جو کبھی نہ وقت خزاں رہے، میرے باغباں وہ شباب دے
کہیں جگنوؤں کی قطار ہو، کہیں تتلیوں کی بہار ہو
تیرے گرم سانسوں سے بج اٹھے میری جان مجھے وہ رباب دے
میری جان اک تیرے واسطے نہ گریز ہے نہ حجاب ہے
جو چھپا لے سارے جہان سے میرے ہم سفر وہ حجاب دے
میرے جس کو سنا کریں، میری آنکھ میں جو رہا کرے
میری روح جس کو پڑھا کرے، مجھے اس طرح کی کتاب دے
تیرے پیار سے نہ یہ جی بھرے، تیری پیاس یوں ہی جواں رہے
میرے ہم سفر مجھے پیار دے، مجھے قربتوں کا عذاب دے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

میں اکیلا تھا مجھے احساس تنہائی نہ تھا
وہ ستم گر اس سے پہلے اتنا ہرجائی نہ تھا
عشق کی راہوں پہ چلتا جارہا تھا دم بدم
ہاں کسی بھی طور دل میں خوف رسوائی نہ تھا
منزل مقصود کی باتیں تو کرتے تھے مگر
پر کسی کے دل میں شوق جادہ پیمائی نہ تھا
بس کوئی اک بات تھی میرے لئے تسکین جاں
دل کے بہلانے کا سامان حسن زیبائی نہ تھا
ہے عجب جلتی شمع سے دور پروانہ رہا
کیا کہوں بھنورا تھا اور پھولوں کا شیدائی نہ تھا
کر گیا دل پر اثر بس ان کا حسن بے مثال
اس سے پہلے مجھ کو شوق خامہ فرسائی نہ تھا
پرخچے جس نے اڑائے بے گناہوں کے قمر
وہ کسی بھی بہن کا یا بھائی کا بھائی نہ تھا
(ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم)

جھڑ رہے ہیں شاخ سے پتے یہاں
گرتے ہوئے میں بول کو کیسے لکھوں
روز و شب ہجر زدہ ماحول ہے
ہجر زدہ ماحول کو کیسے لکھوں
ہوگئے مادہ پرست سب یہاں
سچ کے کڑوے بول کو کیسے لکھوں
شور ہے آواز کا چاروں طرف
وحشت زدہ ماحول کو کیسے لکھوں
چار سو سود کے سودے ہیں اب
تاجر کی کم تول کو کیسے لکھوں
اپنے اپنے دام میں بکتے ہیں سب
لیکن تیرے مول کو کیسے لکھوں
(انتخاب: نامعلوم)

راہ وفا میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
حسین چہرے رشک غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
غم پھر سے یوں بھی دے جاتے ہیں لوگ
شمع کے ساتھ آج بھی جلتے پروانے ہیں
سوچا بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا محبت میں
کسی کی یاد میں بہتے ہوئے آنسو نذرانے ہیں
شام کے گہرے سائے تھے یوں زندگی کے ساتھ
جلتی بجھتی ہوئی روشنیوں میں پھر کئی فسانے ہیں
ساتھ کوئی نہیں دیتا کسی کا جہاں میں جاوید
کھلے گی جب آنکھ پھر خواب کئی سہانے ہیں
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

وقت دعا میں اک دعا کروں
میں رب سے اک التجا کروں
تو خوش رہے، تو شاد رہے
تیرے دل کا آنگن آباد رہے
تو ہر پل یوں ہی ہنسا کرے

تو پھولوں کی طرح کھلا کرے
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو
تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو
تجھے کسی سے کوئی گلا نہ ہو
کوئی دکھ تجھے ملا نہ ہو
تیری رد کبھی دعا نہ ہو
تیرے لب پہ کبھی صدا نہ ہو
تجھے بن مانگے وہ عطا کرے
تیری معاف ہر اک خطا کرے
(عروج ماہین طٰہٰ......راولپنڈی)

تجھے پا کر کھونا میرے بس میں نہیں
اب زندگی میں اور غم پرونا میرے بس میں نہیں
اپنے مقدار سے بہت اُلجھ لیا میں نے
اب مقدر سے پھر لڑو میرے بس میں نہیں
خود ہی میں گم رہنا عادت بن گئی میری
اب پھر محفلوں میں لوٹ کر آؤں میرے بس میں نہیں
اک تم ہی ہو جس کو دیکھ کر غم بھول جاتی ہوں
اب تم کو بھول جاؤں میں بس میں نہیں
بہت عرصے تک جاگ لیا میں نے
اب راتوں کو سونا میرے بس میں نہیں
اب آخری امید لے کر آئی ہوں آپ کے پاس
کہ دکھوں میں اب اور رونا میرے بس میں نہیں
(رابعہ عباس......بستی فتے والی)

کوئی نئی چوٹ پھر سے کھاؤ اداس لوگو
کہا تھا کس نے کہ مسکراؤ اداس لوگو
گزر رہی ہے ہیں گل سے پھر ماتی ہوائیں
کواڑ کھولو دیئے بجھاؤ اداس لوگو
جو رات مقتل میں بال کھولے اتر رہی تھی
وہ رات کیسی رہی سناؤ اداس لوگو
کہاں تلک بام و در چراغاں کئے رکھو گے
بچھڑنے والوں کو بھول جاؤ اداس لوگو
اجاڑ جنگل، ڈری فضا، ہانپتی ہوائیں
یہیں کہیں بستیاں بساؤ اداس لوگو
یہ کس نے سہمی ہوئی فضا میں ہمیں پکارا
یہ کس نے آواز دی کہ آؤ اداس لوگو
یہ جان گنوانے کی رت کہیں رایگاں نہ جائے
سرسناں کوئی سر سجاؤ اداس لوگو
اسی کی بات سے ہی طبیعت سنبھل سکے گی
کہیں سے محسن کو ڈھونڈ لاؤ اداس لوگو
(انتخاب: عینی......نوابشاہ)

تجھے واسطہ ہے تیرے محبوب کا خدایا
محبوب سے مرے تو مجھ کو ملا خدایا
ان کا بھلا کیا میں نے ٹھیکہ اٹھایا ہے جو
ہر بار دکھ ہوئے بس مجھ کو عطا خدایا
سپنے دکھائے کیوں پھر احسان کیوں کیا یہ
کرنا ہی تھا تجھے جب ہم کو جدا خدایا
بت کو سکوں ملا پھر سن کے وہ موت کا جب
بولے ”غضب یہ ہائے کیا ہوگیا خدایا“
ناکامیوں کے صحرا میں خوب ”نور“ بھٹکا
اب تو اسے تو منزل اپنی دکھا خدایا
(اویس نور بلوچ......میرپور ماتھیلو)

تم بن خاک جیا کرتے ہیں ہم
جب اوروں سے ملا کرتے ہو تم
جاں اپنی ہی کہا کرتے تھے ہم
صحت مری کی دعا کیا کرتے تھے تم
دل گھبرا جاتا ہے میرا اکثر
سر راہ جب بھی پیا کرتے ہو تم
مجھ سے ہی محبت رہے گی ہمیشہ
ملاقات پہ کہا کرتے تھے تم
اوروں پہ مہرباں ہو آج کل

یہ کیسی زندگی جیا کرتے ہو تم

(اسحاق انجم......قصور)

وقت کے حساب سے چلنا پڑتا ہے
ٹھوکر کے بعد آخر سنبھلنا پڑتا ہے
ساتھ دینے والے جب اوقات بتانے لگتے ہیں
امید کے جھوٹے خواب سے نکلنا پڑتا ہے
جب ضمیروں کا سودا سرعام ہونے لگے
نقصان سچ بولنے کا بھرنا پڑتا ہے
جس وقت کھلونا سمجھتے ہیں ہمارے عزیز ہم کو
پھر قسمت کے ہاتھوں ہم کو بہلنا پڑتا ہے
دنیا کی حسین وادیوں میں کون رہتا ہے
زندگی کی ضد پر سب کو مرنا پڑتا ہے
وقت کے حساب سے چلنا پڑتا ہے
ٹھوکر کے بعد آخر سنبھلنا پڑتا ہے

(صبا رمضان......پنڈ دادنخان)

ایک دلکش صبح میں نے تمہیں دیکھا تھا
سیاہ پیرہن میں ملبوس
جیسے اجالے میں کوئی کالی گھٹا
جانے کس کو اپنے دل میں سموئے ہوئے
انتظار کی گھڑیاں آنکھوں میں سجائے ہوئے
شاید تمہیں میرا ہی انتظار تھا
کیونکہ بے ساختہ تم نے مجھ کو دیکھا
ایک تبسم ہونٹوں پر آیا
کچھ بجلیاں آنکھوں میں نمودار ہوئیں
میں بھی تمہارے سحر میں کھنچتا ہوا
بار بار مڑ مڑ کر تمہارے ہی طرف
دیکھتا ہی چلا گیا
وہ کون سی دلآویز گھڑی تھی
جب تم میرے دل میں سما گئی
ایک خط تمہاری طرف دیا
ایک جواب تمہارا آیا
عہد و پیمان ہوئے، زندگی نبھانے کا وعدہ
وعدہ جو پورا ہوا، اور میری زندگی نکھر آئی
کتنے سالوں کے بعد بھی
میں وہ سہانا منظر، وہ یادیں نہ بھلا سکا

(سلیم بیگ ہمدانی......کراچی)

سیراب دید ہوں گے یقیناً یہیں سے ہم
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ تری اس یقیں سے ہم
پوچھے نہ کوئی معجزہ سجدہ جنوں
ہر سنگ راہ توڑ دیں اپنی جبیں سے ہم
ترک خیال وصل پہ آمادہ ہوگئے
مجبور ہو کے تیری مسلسل نہیں سے ہم
یہ رعب حسن آنکھ ملانا محال ہے
کس طرح ہمکلام ہوں اس مہ جبیں سے ہم
کیا خوب ہے ہماری ملاقات کا یہ کھیل
تم آسماں سے دیکھ رہے ہو زمیں سے ہم
ملتا ہے جس سے درس محبت زمانے کو
رکھتے ہیں پیار ایسے مکاں کے مکیں سے ہم
پوشیدہ طور پلتے ہیں جس آستیں میں سانپ
کرتے ہیں اجتناب اسی آستیں سے ہم
آنکھوں میں اس کی تیر گئے اشک غم کاشف
کردیں اب اختتام فسانہ یہیں سے ہم

(انتخاب: ذکا اللہ بھٹی-کراچی)

خون مسلم کا رائیگاں نہیں جائے گا
کوئی ہمیں یوں مار کر پچھتائے گا
ہم تو مر کر بھی پائیں گے اک زندگی
تو ہماری زندگی نہ پائے گا
ہم سے مہکے گا یہ سارا گلستاں
تو کہاں گلشن مرا مہکائے گا
وقت پہلے سا نہیں تو کیا ہوا
وقت اچھا بھی تو عزیز آئے گا

(انتخاب: حبیب اللہ......فیصل آباد)

www.urdusoftbooks.com

بھیگی پلکوں پر نام تمہارا ہے
بیچ بھنور کشتی بڑی دور کنارا ہے
بھیگی پلکوں پر نام تمہارے ہے
پوچھیں یہ لہریں کیوں ہے یہ دوری
عشق میں آخر کیوں ہے مجبوری
میرے نہیں تو کیا میرا ہر پل تمہارا ہے
بھیگی پلکوں پر نام تمہارا ہے
اجڑا میرا نصیب ہاتھ میرے خالی
تو سلامت رہے اللہ ہے والی
دل پہ کیا گزری وہ جو ہارا ہے
بھیگی پلکوں پر نام تمہارا ہے
بجھنے لگے دیئے تیز ہواؤں میں
اب رہا نہ دم میری صداؤں میں
وہ جو سامنے ہے کیا خوب نظارہ ہے
بھیگی پلکوں پر نام تمہارا ہے
(انتخاب: کامران...... کراچی)

تو اپنی سوچ کا اب زاویہ بدل کوئی
سلگتی آگ کھلاتی نہیں کنول کوئی
کسی کے سامنے شرط وفا کو کیا رکھیں
ہماری بات پر کرتا نہیں عمل کوئی
ہزار چاہا مگر پھر بھی اس کے بارے میں
نہ کرسکا میں کبھی فیصلہ اٹل کوئی
طرح طرح کے مسائل تھے سامنے لیکن
بھلایا جانہ سکا دل سے ایک پل کوئی
وفا کی آس تو رکھلوں میں اس زمانے سے
یہ بانجھ پیڑ مگر کیسے دے گا پھل کوئی
میں کس طرح سے تمہارے دکھوں کو لوٹادوں
مری سمجھ میں نہیں آتا اس کا حل کوئی
وہ آرہی ہے گھٹا دیکھو جان کر عاطر
چلو فراز کی ہوجائے اب غزل کوئی
(انتخاب: حافظ سبحان...... کراچی)

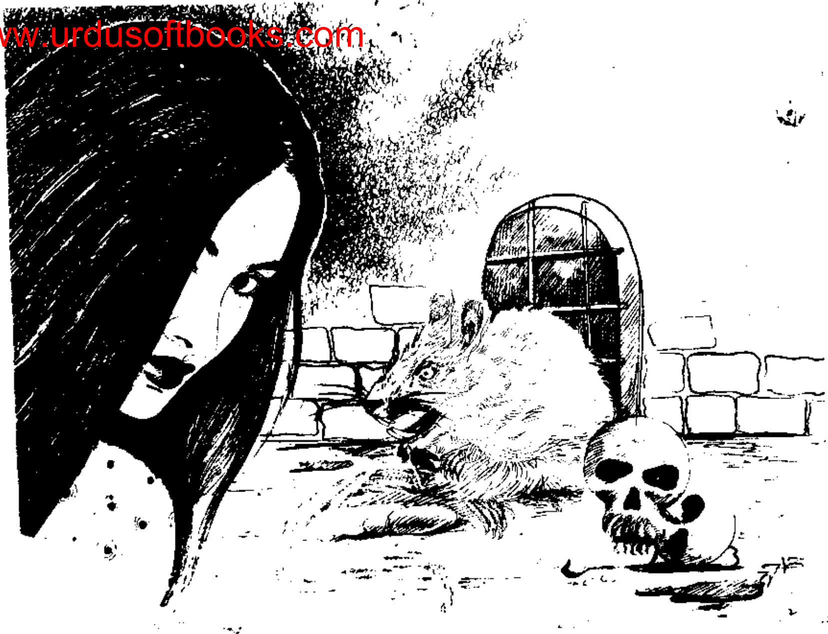
میرے بارے میں تیرا کیا خیال ہے
میری روح جسم ونظر کا سوال ہے
صبح شام رات تیرے نام کی تلاوت
میرے دل کی دھڑکنوں کی احوال ہے
کھویا کھویا سا رہتا ہوں ہر جگہ
یہی تو تیری صورت کا کمال ہے
آشا اور نراشا کے بھنور میں ہوں
تیرے بغیر میرا جینا محال ہے
دعا ہے مل جا تو مجھے جاناں
ورنہ میری زندگی کا بس زوال ہے
تیرے نام کے ساتھ میرا نام ہوجائے
علی ایسی امید ہر سانس میں بحال ہے
میرے بارے میں تیرا کیا خیال ہے
میری روح جسم ونظر کا سوال ہے
(انتخاب: رضیہ...... کراچی)

کبھی تو آ کر دیکھو تم
میرے دل کے اجڑے گلشن میں
چھوڑ گئے تھے جب تم
کچھ پھول تھی چاہت کے
دو بول میٹھی اپنائیت کے
اور بعد تمہارے جانے کے
پت جھڑ کا موسم آیا ہے
یادیں کچھ ہماری محبت کی
ساتھ اپنے یہ لایا ہے
تم تو اپنے مقصد کے لئے
ہم کو صنم بھول گئے
غیر کسی کی بانہوں میں
آخر تم جھول گئے
پر آج بھی!
میرے دل کو اجڑے گلشن میں
سوکھے پتے تمہاری یادوں کے
اب بھی گر رہے ہونگے
"کبھی تو آ کر دیکھو تم"
(انتخاب: وقاص احمد...... کراچی)

میرے خدا میری سن لے دعا
میرا پیغام تو اس تک پہنچادے ذرا
میرے آنسوؤں کو وہ کیوں سمجھتی نہیں
بات وہ مجھ سے کیوں کرتی نہیں
میرے دل کو نہ وہ تڑپائے ذرا
میری حالت پہ وہ رحم کھائے ذرا
چین اس بنا مجھے آتا نہیں
ایس کی یادوں سے خیال اک پل جاتا نہیں
میرے دل کو نہ وہ اتنا ستائے ذرا
اے خدا میری سن لے دعا ذرا
دل میرا اب کہیں لگتا نہیں
خیال اس کا میرے ذہن سے نکلتا نہیں
اس کو بھولنے کا جتنا میں تصور کروں
یاد اتنا مجھے وہ آئے ذرا
یہ غزل اداس کی کوئی اسے سنائے ذرا
یہ بات میری ایس کو بتائے کوئی ذرا
اے خدا میری سن لے دعا ذرا
(انتخاب: عبدالحمید...... لاہور)

یارو وہ آج کل بڑا اداس رہتا ہے
جلا کے میرا دل بڑا اداس رہتا ہے
بن میرے بھی اس کو چین آتا نہیں
ہر گھڑی ہر پل بڑا اداس رہتا ہے
جس میں چھپا کر کرتا تھا پیار مجھے
اس کا وہ آنچل بڑا اداس رہتا ہے
تمام شب چوما کرتا تھا جس کو میں
اس چہرے کا تل بڑا اداس رہتا ہے
جو چھوڑ گیا تھا سہانی رتوں میں مجھے
یارو اب وہ سنگدل بڑا اداس رہتا ہے
میری خوشیاں چھین کر جو بڑا خوش تھا بوبی
اب وہی شخص مسلسل بڑا اداس رہتا ہے
(انتخاب: کنول-ساہیوال)

☆☆



عاشق جن

سلیم اختر۔راولپنڈی

وفا شعار اور شوہر پرستی کی اپنی مثال آپ نوشیزہ جو کہ ایک ایک پل شوہر کے گن گاتی ہوئی وقت بیتاتی تھی لیکن ایک دن جب صبح کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو حیران کن منظر سامنے آیا تھا

جسم وجاں پر ہیبت طاری کرتی ایک خوفناک جن کی دل دہلاتی تحیر انگیز حقیقت

اس دلچسپ مافوق الفطرت کہانی کو ایک برٹش رائٹر مسٹر فائیز نے اپنی یاد داشتوں پر مشتمل کتاب (BLACK DAYS) ''کالی یادوں'' میں کیا ہے۔ یہ کتاب 1922ء میں برمنگھم میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں فائیز یوں لکھتا ہے۔

یہ 1910ء کی بات ہے جب میں برصغیر کے شہر مدراس کے علاقہ برٹش ٹاؤن کے ایک مکان میں رہائش کے لیے آیا تھا۔ رائٹر نے اپنی آمد کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ اس کی ٹرانسفر خانیوال شہر سے مدراس محکمہ تعلیم والوں نے اس لیے کردی تھی کہ میری جگہ خانیوال شہر میں ایک اور سینئر چیف سرویئر آف سکولز مسٹر لائپ آ گیا تھا۔ اس نے اپنا اثرورسوخ چلا کر مجھے خانیوال سے اکھڑوا دیا تھا۔ میری مدراس ٹرانسفر ایک سرکاری حکم کے تحت ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی تعمیل کی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا

تھا کہ مدراس شہر کے علاقہ برٹش ٹاؤن کے جس مکان میں ٹھہرا ہوا تھا اس کی لوکیشن یہ تھی کہ یہ پانچ کمروں پر مشتمل تھا جبکہ اس کے اوپر والی منزل میں دو کمرے تھے۔

میں کنوارہ، اکیلا اور تنہائی پسند تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی ضرورت کے تحت اس بڑے مکان میں صرف ایک چھوٹے سے کمرے کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اس کمرے میں اسٹڈی والی ٹیبل اور میرے سونے کا پلنگ موجود تھا۔ ساتھ ہی اٹیچ باتھ بنا ہوا تھا۔ میرا بنگالی خدمت گار جس کا نام کاسو بابا تھا۔ اسے میں نے صرف اپنی چاکری کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میرے کبھی کبھار مہمان دوست وغیرہ آتے تھے۔ وہی ان کو چائے وغیرہ بنا کر دیتا تھا۔

میں دراصل دلی طور پر اپنے گھر آئے مہمانوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں طبعتاً کیونکہ پڑھاکو، تنہائی پسند تھا۔ جو مہمان بعض دفعہ لیچڑ ہو کر مجھے اپنی الٹی سیدھی بے مقصد باتوں میں لگا کر میرا قیمتی وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ میں نے کاسو بابا کو یہ بات سمجھائی ہوئی تھی کہ جب میں نے کسی لیچڑ مہمان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا تو میں اسے اشارۃً کہتا کہ:

”کاسو بابا ایک کڑک چائے کا کپ اور بناؤ“۔

”سر! آپ کا فلاں آفیسر کا فون آیا تھا۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں“۔ اور میں مصنوعی طور پر اس محفل سے اٹھ جاتا تھا۔

جون 1910ء کو برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ حکومت نے ہم برٹش لوگوں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ ہم لوگ اپنے دفتروں میں نہ جائیں اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ یہ آرڈر ایک ہفتے کے لیے تھا۔

میں نے کاسو بابا کو کہا۔

”تم بازار سے بہت سی انگلش لٹریچر کی بکس لے آؤ۔“

اس نے مجھے کہا۔

”اس وقت بازار جانا بہت مشکل ہے کیونکہ مدراس کے گلی کوچوں میں ہندو، سکھ آپس میں مورچہ بند ہو کر آپس میں لڑ رہے ہیں“۔ اس نے بازار جانے سے انکار کردیا۔ اور بولا۔

”سر! وہ سامنے والے بنگلے میں ایک گورا صاحب مسٹر ہیرٹ آئے ہیں سنا ہے ان کی اپنی بہت بڑی کتابوں کی لائبریری ہے۔ آپ کہیں تو میں ان سے آپ کی مطلوبہ کتب لے آؤں؟“

میں نے اسے کہا۔ ”ہاں پوچھ لو۔ شاید وہ دیں یا نہ دیں“۔

کاسو بابا تھوڑی دیر بعد میرے پاس چند بہت اچھی میرے پڑھنے کے لائق کتب لے آیا۔ وہ کتابیں انتہائی پرانی اور اچھے رائٹرز کی لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کو اتنے قرینے سے سنبھال کر سنبھالنے والے نے رکھا ہوا تھا۔ کہ میرا دل خوش ہوگیا۔

شام کو کاسو بابا نے مجھے کہا۔

”سر! وہ سامنے والے مسٹر ہیرٹ صاحب آئے ہیں“۔

”اوہو..... اچھا.....“ ان کی آمد سے میں دلی طور پر خوش نہ تھا۔ لیکن میں نے بے دلی سے کاسو بابا کو کہا۔

”میں تمہیں انہیں بھگانے یا ٹالنے کا اشارہ کروں تو تم مجھ سے وہی بات کرنا جو کہ میں تم سے کرتا ہوں“۔ میں بیٹھک میں گیا تو مسٹر ہیرٹ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک بوڑھا اور شکل سے ہی خشک طبع لگ رہا تھا۔

”سوری..... میں نے آپ کی کسی لازمی مصروفیات میں مداخلت تو نہیں کی؟“

”جی نہیں۔ مداخلت کیسی..... آج کل تو ویسے بھی فسادات کی وجہ سے ہم لوگوں کو ذرا گھروں میں بیٹھنے کا موقع مل گیا ہے“۔

”اچھا تو آپ فارغ ہیں۔ اسی بہانے میں بھی دو چار گھنٹے آپ سے گپ شپ لگا لوں گا“۔ دو چار گھنٹے میں نے دل میں سوچا۔ میں نے مصنوعی خوش اخلاقی سے اسے مسکرا کر کہا۔

”جی ہاں..... ہاں کیوں نہیں..... میں بھی تقریباً فارغ ہوں“۔ ہیرٹ نے ابتدائی طور پر مجھے بتایا کہ۔

"وہ حکومت کی جانب سے مدراس شہر میں اس کی پرانی تاریخی عمارتوں اور اس کے اردگرد کی جگہوں کا بغور جائزہ لے کر اس کے بارے میں یہ رپورٹ بنانے آیا ہے۔ کہ ان تاریخی عمارتوں اور ان کے گرد جو خالی جگہوں کو کسی طرح عام عوام کے لیے تفریح گاہ بنانے آیا ہے۔ کہ ان تاریخی عمارتوں اور ان کر گرد جو خالی جگہوں کو کس طرح عام عوام کے لیے تفریح گاہ بنائی جاسکتی ہیں"۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "اس سے حکومت کو کیا فائدہ ہوگا؟"

بیرٹ نے کہا۔ "اسے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ نے یہ بات خفیہ طور پر بتائی ہے کہ مدراس کی ویران خالی تاریخی عمارتوں کو تفریح گاہ بنانے سے حکومت کو کئی مقاصد حاصل ہوں گے۔ برسوں پرانی تاریخی عمارتوں کی (RENUVATION) ہو جائے گی۔ کھنڈرات کے اندر جو نشئی وارداتی قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں ان سے چھٹکارا مل جائے گا۔ حکومت کو ان عمارتوں، پارکوں پر لگائے گئے ٹیکسوں، ٹکٹوں کاروباری لوگوں سے وصول ٹیکسوں کی مد میں تقریباً سالانہ 30 لاکھ روپیہ مل جائے گا"۔ نیز مسٹر بیرٹ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا جن سے مجھے دور دور تک کوئی لگاؤ نہ تھا۔ میں نے اسے دوران گفتگو کہا کہ۔

"سر! کاسو بابا جو پرانی کتب آپ کے گھر سے لایا ہے اسے آپ نے بڑے قرینے سے سنبھال کر رکھا ہے"۔ بیرٹ نے اس کا جواب نحیف سا مسکرا کر دیتے ہوئے یہ کہا۔

"مجھے تو اصل میں کتب بینی کا اتنا وقت ہی نہیں ملتا ...... ہاں کبھی کبھار کوئی اچھی کتاب مل جاتی ہے تو پڑھ لیتا ہوں۔ وہ دراصل میری بیٹی جو کہ اپر ہسٹری (UPPER HISTORY) P.H.D کے برابر ڈگری کر رہی ہے۔ یہ اس کی لائبریری کی کتابیں ہیں۔ وہی دور دراز کے کتب فروش، کباڑیوں کی دکانوں اور ادھر ادھر سے اچھی کتابیں خرید کر لاتی ہے۔ وہ فارغ وقت میں ان کی نوک پلک ٹھیک کرتی رہتی ہے"۔ مسٹر بیرٹ کافی دیر میرے پاس بیٹھا میرا دماغ چاٹتا رہا۔ بالآخر مجھے اسے بھگانے کا وہی طریقہ استعمال کرنا پڑا۔ یعنی کاسو بابا کو کہا۔

"کاسو بابا! ذرا ایک کڑک چائے بنا کر تو لاؤ"۔

دو روز بعد کاسو بابا مجھ سے بیرٹ سے لائی گئی کچھ پرانی کتب واپس کر آیا تھا۔ اس کی جگہ دوسری کتب لے آیا۔

ان میں سے میں نے ایک کتاب کھولی تو اس کے اندر ایک برٹش یونیورسٹی کی لائبریری کا کارڈ اور اس کارڈ میں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کارڈ کے نیچے لکھا تھا...... مس نائیدل۔

مس نائیدل بیرٹ کی تصویر ایک تیر کی مانند میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں گھڑی کی چوتھائی میں اس سے ملوں...... میں بیرٹ کے گھر اس کارڈ کو لے کر گیا۔ بیرٹ نے مجھے اپنی بیٹھک میں بیٹھا کر مجھ سے اپنے روایتی انداز میں خشک بے معنی باتیں کیں۔ میں دلی طور پر چاہتا تھا کہ میں کسی طریقے سے اس کی بیٹی نائیدل سے ملوں...... بیرٹ میرا اپنے مخصوص خشک موضوعات سے دماغ چاٹتا رہا۔ میں اسے بے دلی سے مسکرا کر YESNO کہتا رہا۔

میں نے بیرٹ سے پوچھا۔

"آپ کی فیملی میں اور کون کون ہے؟" اس نے جواباً کہا کہ۔

"میری بیٹی، میری بیوی اور میرا بیٹا گیٹس"۔

"سر! آپ سب اتوار کو میرے گھر ڈنر پر آئیں"۔

"نہیں تم اکیلے ہو تم کو ایسا کرنے میں پریشانی ہوگی۔ آپ ایسا کریں کہ آپ آئندہ اتوار کو میرے گھر ڈنر کریں"۔

میں نے بغیر کسی تردد کے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اس دن میں نائیدل کا دیدار نہ کر پایا تھا۔ اتوار کے روز ڈنر میں اپنے تئیں بہت اچھی طرح خوب بن سنور کے مسٹر بیرٹ کے بنگلے میں گیا تھا۔ ڈنر کی میز پر مسٹر بیرٹ نے پہلے میرا تعارف اپنی فیملی سے کروایا۔ اس کے بیٹے گیٹس کے ساتھ بیٹھی اس کی بیٹی بڑی سنجیدگی سے ڈنر میں مصروف عمل تھی۔ سچ ہے وہ مجھے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ نہ اس کی جانب سے کوئی ایسا موضوع آ رہا تھا اور نہ ہی میری وہاں کوئی ہمت پڑ رہی تھی کہ میں اس سے کسی موضوع کو چھیڑ کر

اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کرسکوں۔

"لگتا ہے اب تو شہر کے فسادی حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ سنا ہے حکومت نے ہم برٹش لوگوں کو کہا ہے کہ وہ اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر FRIDAY سے آجائیں"۔

"YES" میں نے نائیدل کی جانب سے اپنا ذہن جھٹکتے ہوئے کہا۔

نائیدل ایک مناسب چہرے والی لڑکی تھی وہ میرے دل کو بھا گئی تھی۔ بیرٹ کے سوا اس کی تمام فیملی خاموش طبع تھی۔ ڈنر سے واپسی پر میں نائیدل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس حقیقت کا بھی بخوبی ادراک تھا کہ مسٹر بیرٹ اور اس کی فیملی نے میری عزت تو کی تھی لیکن وہ مجھ سے زیادہ گھلی ملی نہ تھی۔

شہر میں امنڈنے والے فسادات پر حکومت نے قابو پالیا تھا۔ ہم برٹش لوگ پھر سے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر جانے لگے تھے۔ ادھر بیرٹ بھی میرے بنگلے میں کم آتا تھا۔ جبکہ میری دلی خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی بہانے اس سے مل کر نائیدل کو دیکھ پاؤں..... اسی دوران میں نے کئی بار کا سو بابا کے ذریعے ان کے بنگلے سے اپنے پڑھنے کے لیے کتب منگوائیں۔ جن کو میں نے پڑھے بغیر ہی واپس بھیج دیا تھا۔

ایک بار مجھے پتہ چلا کہ مسٹر بیرٹ دو ہفتے کے لیے محکمانہ کورس کے لیے سہارنپور گیا ہوا ہے۔ میں ایک ان ہمت کرکے اس کے بنگلے میں کچھ بکس لینے گیا۔ وہاں خوش قسمتی سے اس کی بیوی سے میرا سامنا ہوا۔ جس کے پیچھے نائیدل کھڑی تھی۔ میں نے نائیدل کو کہا۔

"مہربانی کر کے مجھے فلاں بکس دے دیں"۔

مسز بیرٹ نے مجھے کہا۔

"آپ بیٹھ جائیں"۔ وہ مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھا کر چلی گئی۔ جبکہ تھوڑے توقف کے بعد نائیدل اپنے ہاتھ سے میری مطلوبہ بکس لے آئی۔ میں نے اسے کہا۔

"SORRY" "میں نے آپ کو تکلیف دی"۔ اس نے خود ہی کہا۔

"نو پرابلم۔ آپ کو اگر اس بکس میں دلچسپی ہے"۔

اسے کیا پتہ تھا کہ مجھے تو اس میں دلچسپی ہے۔

"تو میرے پاس اس سے بھی اچھی موضوع پر کتب موجود ہیں۔ آپ لینا چاہیں گے؟"

"ہاں..... کیوں نہیں"۔

اس نے اپنے لبوں سے وہ لفظ بول دیا تھا جو کہ میں دل سے چاہتا تھا۔

"تو کیا میں آپ کے پاس اپنی پسندیدہ مطلوبہ کتب لینے آجایا کروں؟"

"ہاں کیوں نہیں"۔

پھر میں تقریباً روزانہ حیلے بہانے سے اس سے ملنے جانے لگا۔

اسی دوران بیرٹ بھی اپنا محکمانہ کورس کر کے واپس آ گیا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں نائیدل سے کتابیں لینے آتا رہا ہوں تو اس نے اس کا مائنڈ نہ کیا۔

میں نے اپنے مقصد کے حصول کو مزید بہت آسان بنانے کے لیے گیتس کو بھی اپنی جانب مائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ نائیدل بھی مجھ سے ہلکے پھلکے انداز میں بے باکی، دوستانہ انداز میں گپ شپ مارنے لگی تھی۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ نائیدل نے مجھے کہا۔

"فائز! تم سے مجھے شادی کرنے میں کوئی عار نہیں ہے اور امید ہے کہ میرے ڈیڈی، ممی کو بھی نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ شادی اپنی اسٹڈی ختم کرنے کے بعد کروں گی"۔

"کب تک تمھاری اسٹڈی ختم ہوگی؟" میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"یہی کوئی 2 سے 3 سال میں اگر تم انتظار کرلو"۔

میرے لبوں سے تفکرانہ انداز والی سیٹی نکلی۔ "یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے"۔

"دیکھو! میں شادی کے جھنجھٹ میں پڑ کر اپنی PHD اسٹڈی کو عین موڑ پر ادھورا نہیں چھوڑ سکتی"۔

"اچھا اس کا میں ایک بہت خوبصورت حل نکالتا ہوں۔ اس سے نہ تو تمہاری جاری تعلیم میں کوئی حرج آئے گا اور ہماری شادی بھی ہو جائے گی"۔

"دیکھو! ہم شادی کرنے کے بعد ایک دوسرے سے صرف اتوار والے دن رجوع کیا کریں گے بقیہ 6 روز تم بے شک جہاں مرضی چاہوں اسٹڈی کرو"۔

"جاؤ اچھا میں تمہاری اس خواہش، تجویز کا ذکر اپنے ڈیڈی سے کروں گی"۔

شام کو مسٹر ہیربرٹ اور اس کی وائف نے مجھے بنگلے میں خصوصی طور پر ڈنر پر بلایا۔ وہاں ٹائمیڈل بھی موجود تھی۔ ہیربرٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"تم واقعی ٹائمیڈل سے شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہو؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں"۔ مسٹر ہیربرٹ نے مجھے کہا۔

"اگر تم ہماری بیٹی سے واقعی شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہو تو اس کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی وہ تم سے صرف اتوار کے دن رجوع کیا کرے گی اور باقی 6 روز وہ اپنی اسٹڈی جاری رکھے گی"۔

میں ٹائمیڈل کو حاصل کرنے کے لیے جنون محبت میں اس مضحکہ خیز شرط پر اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔

ٹائمیڈل سے میری شادی ہو گئی وہ ایک محبت کرنے والی بیوی ضرور ثابت ہوئی لیکن اس کے ذہن میں پڑھائی کا اتنا جنون سوار تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے ساتھ لائی لاتعداد کتب کے ساتھ گزارتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری نئی دلہن میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے۔ لیکن میں اسے اس کی پڑھائی سے اس لیے ڈسٹرب نہ کرتا تھا کہ وہ میری جانب سے متنفر نہ ہو جائے۔ میں نے اس سے شادی سے پہلے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ صرف اتوار کو میرے پاس آئے گی۔ اس نے میرے بنگلے کے اوپری کمرے میں خصوصی طور پر اپنا اسٹڈی روم بنایا ہوا تھا۔ وہ وہاں تادیر پڑھتی رہتی تھی۔ وہ شاذونادر ہی چند لمحوں کے لیے میرے پاس نیچے آتی تھی۔ میں اس سے کہتا تھا کہ۔

"میں اپنی شادی کو بڑا مضحکہ خیز اور باعث اذیت تصور سمجھتا ہوں"۔ ٹائمیڈل مجھے کہتی۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں آپ سے اس شرط پر شادی کروں گی کہ میں نے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے پڑھنا ہے اور آپ میری اسٹڈی میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں میں اپنے امتحان دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس رہوں گی"۔

اس نے یہ الفاظ میرے گالوں پر مسکرا کر محبت بھری چٹکی کاٹ کر کہے تھے۔

ایک رات حسب معمول ٹائمیڈل بنگلے کے اوپری کمرے میں اسٹڈی کر رہی تھی۔ میں اس کی جانب سے صبر کیے اپنے بیڈ پر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک کاسو بابا بڑے سہمے ہوئے انداز میں میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے پہلے کبھی اس انداز میں میرے سامنے ڈرا، سہما ہوا نہیں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے تجسس کے عالم میں پوچھا کہ۔

"کاسو بابا! خیریت تو ہے؟ آپ ایسے کیوں کھڑے ہیں"۔ وہ میرے اس بات پر رونے لگا۔ میں سمجھا کہ اس کا کوئی قریبی عزیز فوت ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"کاسو بابا! خیر تو ہے مجھے بھی تو کچھ بتائیں؟" وہ بسورتی، سہمی حالت میں اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"آپ! کرسی پر آرام سے بیٹھیں"۔ میں نے اس کے ہاتھوں میں پانی کا گلاس دے کر پوچھا۔

"اپنے اعصاب قابو میں رکھ کر مجھے بتاؤ کہ تمھاری ایسی کیفیت کیوں ہو رہی ہے؟" اس نے کہا۔

"مسٹر فائز! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں وہ بات کیسے بتاؤں......؟ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہے"۔ میں نے اس سے ششدر ہو کر پوچھا۔

"کون سی بات......؟"

اس نے کہا "سر! میں جو بات آپ کو بتانے والا ہوں آپ نہ جانے کیسے میری اس بات کا یقین کریں گے......" وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

"ہاں میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمھارے لبوں سے نکلی ہوئی باتوں پر یقین کروں گا۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولتے"۔ کاسو بابا لپک کر میرے قریب آیا۔

اس نے مجھے یہ بڑی عجیب اور میرے پاؤں سے زمین نکالنے والی بات بتائی کہ۔

"مسٹر فائز! میں نے آج اوپری منزل کے کمرے کی سیڑھیوں کے عین وسط میں ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو ٹائیدل کے ساتھ دیکھا ہے"۔

"کاسو بابا! تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو..... تم یہ کیا دیوانوں والی اور کس قسم کی گھٹیا بات کر رہے ہو؟" میں نے نیم طیش میں آ کر اسے کہا۔

"معاف کرنا مسٹر فائز! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میری جو تعریف کی تھی وہ کیا جھوٹ تھی؟ آپ کیا یہ تصور کر سکتے ہیں کہ میں اس عمر میں آپ کے سامنے ادنیٰ ملازم ہوتے ہوئے جھوٹ بول سکتا ہوں"۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ ٹائیدل اور بقول وہ تمہارے وہ خوبصورت لڑکا اکٹھے کس حالت میں تھے؟"

"جی میری نظروں نے دیکھا کہ وہ دونوں بڑے محبت بھرے انداز میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے"۔

"کاسو بابا! تم اب جاؤ"۔ میں نے اس وقت کاسو بابا کی جانب سے کی گئی بات کو اس کا دماغی خلل کا اختراع محسوس کیا تھا۔ ٹائیدل اوپری کمرے میں بنائی ہوئی اپنی مخصوص لائبریری میں رات گئے ہوتی تھی اور میں جب اپنے آفس جانے کی تیاری کرتا تھا تو وہ اس وقت سو کر اٹھتی تھی۔ اس سے میری زیادہ کوئی خاص بات نہیں ہو پاتی تھی۔ جبکہ صرف اتوار کے روز جب وہ میرے بیڈ پر آتی تھی تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر میرے لیے واقعی محبت موجود ہے۔ اس کا اظہار مجھے اس کی جانب سے اس کے رومانس بھرے انداز سے ہوتا تھا۔ مجھے اس کی محبت پر بڑا مان تھا، اعتماد تھا۔

ایک درمیانی رات میں رفع حاجت کے لیے اٹھا مجھے خیال آیا کہ میرے کمرے کا تو گٹر خراب ہے۔ میں کیوں نہ فراغت کے لیے اوپری کمرے کا بیت الخلاء استعمال کرلوں۔ میں نیند میں آہستہ آہستہ ننگے پاؤں جب اوپری منزل کی جانب جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا تو آخری سیڑھی پر میری ناک کے نتھنوں کو بڑی دلفریب خوشبو محسوس ہوئی۔ میں ارادتاً رک گیا۔ میں نے زور زور سے وہاں رک کر چند گہرے سانس لیے۔ "یہ خوشبو کیسی ہے؟" میرے دل نے میرے دماغ سے سوال کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں جب اس کمرے کے بند دروازے کے اور قریب گیا تو وہاں میں نے ایک جھری سے کمرے کے اندر جھانکا۔ تو وہاں مجھے واقعی ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹائیدل بکس شیلف کے پاس کھڑی کسی سے باتیں کر رہی ہو..... اس کی پوزیشن یہ تھی کہ مجھے صرف ٹائیدل نظر آ رہی تھی۔ جبکہ وہ جس سے باتیں کر رہی تھی وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے حاجت کا اتنا پریشر پڑ رہا تھا کہ میں مجبوراً بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے دیکھا کہ ٹائیدل اپنے ہاتھوں میں کتاب اٹھائے ہوئے تھی۔

"فائیز! خیریت تو ہے تم یہاں کیسے؟"

"وہ میں نے اوپری منزل والا باتھ استعمال کرنا تھا"۔

باتھ سے فراغت کے بعد میں نے ٹائیدل کے چہرے پر بغور گھور کر دیکھا۔ وہ مجھے مسکرا کر دیکھ کر بولی۔

"میں نیچے آتی ہوں"۔ وہ جب میرے قریب آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ۔

"تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟"

اس نے کہا۔"بہت...... اس میں کوئی شک ہے"۔

میں نے اس سے پھر پوچھا کہ۔

"کیا میرے علاوہ بھی تمہاری زندگی میں کوئی اور ہے؟" ٹائیدل نے کہا کہ۔

"فائیز! لگتا ہے آج کل تمہارا دماغ چل رہا۔ کیا بات ہے؟ تم اس قسم کی بے ربط، دل جلانے والی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" اس نے اپنے چہرے پر ناراضگی کے اثرات طاری کر لیے۔

پھر میں نے کہا۔"میں نے تمہاری زندگی میں کسی دوسرے شخص کی علامات پائی ہیں"۔ پھر میں نے اس سے کاسو بابا اور اپنی آنکھوں سے دیکھی، سنی بات کا اس سے ذکر کیا تو یکدم اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کو قدرے سکتہ سا ہو گیا ہے۔

"جو حقیقت ہے اسے تم مجھے بے دھڑک بتاؤ......؟ مجھے، حقیقت سننے کا بخوبی حوصلہ ہے۔" ناہیدل میرے سینے سے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار رونے کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار مجھے چومتی جا رہی تھی۔

"فائز! تم اپنے دل میں میری جانب سے بدگمانی پیدا نہ کرو۔ مجھے یسوع کی قسم مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ لیکن......"

"ہاں، ہاں بولو لیکن......؟" میں نے بڑے اطمینان سے اسے کہا۔ ناہیدل نے مجھے کہا۔

"تم اور میں ڈنر کے بعد میٹرس روڈ پر چہل قدمی کرنے جائیں گے۔ وہاں میں تمہیں اپنی زندگی سے لپٹا ہوا ایک ایسا عجیب اور دل و ذہن کو یقین نہ آنے والا راز سناؤں گی جسے سن کر تم بھی پریشان ہو جاؤ گے۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے اس سے تجسس سے پوچھا۔

"تھوڑا صبر کر لو۔ میری پراسرار کہانی آرام سے سننے والی ہے۔"

ڈنر کے بعد میں اور ناہیدل میٹرس بازار میں چہل قدمی کرنے گئے۔ وہاں اسے میں ایک چائے کے ہوٹل میں لے گیا۔ اس ہوٹل میں ناہیدل نے کہا......

"فائز! اب میں جو تم کو اپنی زندگی کا عجیب راز بتا رہی ہوں تم اسے غور سے سننا اور پھر تم ٹھنڈے ذہن سے فیصلہ کرنا میرا اس شخص سے عشق میں کتنا عمل دخل ہے اور تم مجھے جو سزا دو گے مجھے منظور ہے۔"

ناہیدل نے مجھے ہوٹل میں بڑی عجیب کہانی سنائی۔

اب ناہیدل کی زبانی سنیے......

تم سے شادی سے تقریباً ایک سال پہلے میرے خوابوں میں ایک بہت خوبصورت شخص کی ادھوری شبیہہ بنا کرتی تھی۔ میں شبیہہ کو دیکھ کر گہری نیند سے چونک کر اٹھ جایا کرتی تھی۔ عالم خواب میں رفتہ رفتہ یہ شبیہہ ایک خوبصورت انسان کی صورت اختیار کر جاتی تھی۔ یہ خواب میں آنے والا شخص مجھے خواب میں کہتا تھا کہ۔

"ناہیدل میں تم پر عاشق ہوں۔ میں تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنی دنیا میں لے کر جاؤں گا۔" میں نے ایک بار اس کا ذکر اپنے پروفیسر سے کیا تھا کہ۔

"مجھے خواب میں ایک شخص آ کر اس قسم کی بات کرتا ہے۔" میری بات سن کر پروفیسر نے مجھے بتایا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے تم صرف ایک خواب کی طرح لو۔" میں پھر سے فکرمند ہو گئی۔ چند روز تک وہی شخص میرے خوابوں میں آیا۔ اس نے مجھے کہا کہ۔

"ناہیدل! میں نے تمہیں ہر صورت میں حاصل کرنا ہے۔" میں نیند میں یہی سمجھ پاتی تھی کہ میں گہری نیند میں سو رہی ہوں۔ اسی دوران میرا دماغ کہتا تھا کہ "ناہیدل! فوری طور پر جاگنے کی کوشش کرو۔" میں اپنے تئیں جاگنے کی بھرپور کوشش کرتی...... لیکن وہ پراسرار شخص میری نیند کو اتنا گہرا کر دیتا کہ میں اپنی ہزار ہا کوشش کرنے کے باوجود جاگ نہ پاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ میں بمشکل جاگتی تھی۔ میں نے ایک روز اپنے فادر سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک کرسچن ماہر خواب کی تعبیر بتانے والے کو دکھلایا۔ اس شخص نے میرے فادر کو کہا کہ۔

"جس قسم کی یہ لڑکی بات بتا رہی ہے مجھے لگتا ہے کہ کوئی ماورائی مخلوق سے بڑا معاملہ ہے۔ لہٰذا اسے مشہور عامل، روحوں اور جنات کو سمجھنے والے شخص تھل لال سے ملواؤ۔"

لہٰذا میرے فادر مجھے تھل لال کے ڈیرے پر لے گئے۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھا کر مجھ سے تفصیلاً کچھ باتیں پوچھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میرے فادر کو کہا کہ۔

"وہ کل آپ کو اس لڑکی کے خواب میں نظر آنے والے خوبصورت لڑکے کے بارے میں بتائے گا۔" نیز اس نے میرے فادر ہیرٹ کو تاکید کی کہ۔ "وہ اس لڑکی کو روزانہ اس کے ڈیرے پر لائے۔"

دوسرے روز میرے فادر مجھے جب اس کے ڈیرے پر لے کر گئے۔ تو وہاں تھل لال نے ہمیں بتایا کہ دراصل ناہیدل نے جب بھی رات کے وقت تیز خوشبو لگائی ہو گی تو یقیناً اس پر ٹینش نامی جن عاشق ہو گیا ہو گا۔"

"یہ ٹینش نامی جن کون ہے؟" میرے فادر نے پر تجسس انداز میں پوچھا تو۔ اس نے کہا۔

"سچ بتاؤں یہ گنیش نامی جن عاشق مزاج خوشبوؤں اور لڑکیوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اور یہ اپنی جناتی دنیا کا آوارہ باسی ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی تیز خوشبو لگی خوبصورت لڑکی کو اپنی نظر میں رکھ کر اس کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا"۔

"تو تمہارا کیا فائدہ...... یہ تم کیسے ماہر عملیات ہو......؟ تم میری بیٹی سے اس کی چاہت ختم کرنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں اس کا منہ مانگا معاوضہ دوں گا"۔ تھل لال نے فادر پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ اگر سونے کا پہاڑ بھی مجھے دے دیں۔ صاف بات ہے کہ گنیش جن کو قابو کرنے کی صلاحیت میں نہیں رکھتا۔ ہاں لیکن میں تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم سے معقول معاوضہ لے کر اسے کچھ عرصہ کے لیے اپنے عمل سے تمہاری بیٹی سے دور رکھنے کی کوشش کروں گا"۔ اس کے بعد میرے فادر نے مزید ماہر عملیات سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ۔

"اس کا توڑ جو کرے گا تو وہ تھل لال ہی کر سکتا ہے

"۔ تھل لال مجھے تقریباً روزانہ اپنے ڈیرے پر بلانے لگا۔ وہ مجھے اپنے سامنے بیٹھا کر میرے ماتھے پر کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ میں اس سے پوچھا کرتی تھی۔

"تم میرے ماتھے پر کیا پڑھتے ہو؟" اس نے مجھے کہا۔

"میں تمہارے ماتھے پر تالا لگاتا ہوں"۔

"کیسا تالا......؟" میں نے اس سے حیرانگی سے پوچھا تو اس نے مجھے کہا۔

"اس سوال کا جواب تمہیں رات کو ملے گا"۔

رات کو میں سوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گنیش کی ادھوری شبیہہ میرے سامنے مکمل تصویر ابھر کر آنا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا اس ادھوری شفاف شبیہہ کو مکمل ہونے سے اسے کوئی پراسرار طاقت روکتی تھی۔ جس دن میں تھل لال کے پاس جانے میں کسل مندی کرتی تو گنیش جن ایک خوبصورت انسان کی شکل میں آکر مجھے خواب میں میرے حسن کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ۔

"تم مجھے اپنے خوابوں میں آنے سے روکنے کے لیے مجھ پر عملیات کا تالا نہ لگواؤ۔ اگر تم نے مزید ایسا کیا تو میں طیش میں آکر وہ کروں گا جو میں کر سکتا ہوں"۔ وہ دھمکی دے کر میرے خواب سے غائب ہو گیا۔

ایک دن تھل لال نے مجھے اور میرے فادر کو اپنے ڈیرے پر بلایا۔ اس نے ہمیں کہا۔

"میں کب تک گنیش جن کو تمہارے خوابوں میں نہ آنے کے لیے اپنے عملیات کا استعمال کروں۔ دراصل میں اب تمہارا یہ کام کرنے سے مجبور ہوں"۔ میرے فادر نے پوچھا۔

"کیوں؟" تھل لال کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں منڈلانے لگی تھیں۔ اس نے کہا۔

"ہیرٹ صاحب! مجھے اپنی جان پیاری ہے، مجھے میرے قابو جن نے دھمکی دی ہے کہ گنیش کہتا ہے کہ تھل لال تو اپنی اوقات میں رہ...... ایسا نہ ہو کہ میں تیری جان لے لوں"۔

"میں سچ بتاؤں۔ تمہیں میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ضدی گنیش جن ایک دن ناہیدل کو کسی نہ کسی روپ میں حاصل کر لے گا"۔ اس کی بات سن کر فادر اور میں انتہائی پریشان ہو گئے تھے۔

ایک دن ایسا بھی آ گیا تھا کہ میری آنکھوں میں نیند کا شدید غلبہ طاری ہونے کے باوجود میں رات کو سونے سے کتراتی تھی۔ میں رات بھر تیز پتی والی کڑک چائے پیتی رہتی تھی۔ میری صحت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی۔ میری فیملی نے باہمی طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس معاملے کی خبر بنگلے سے باہر نہیں نکلنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے جگ ہنسائی ہوگی۔

ایک دن ہماری فیملی سیر و تفریح کے لیے ایک پرفضاء پہاڑی علاقے میں گئی تھی۔ فادر نے اس پہاڑی مقام کے ایک بڑے ہوٹل کا ایک VIP کمرہ عارضی رہائش کے لیے لیا۔ وہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں ہماری ساری فیملی سما سکتی تھی۔ میرے فادر اور ممی مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔ میں نے اپنے کمرے کی بالکونی سے باہر کی جانب موسم کے نظارے کو دیکھنے کے لیے جھانکنا

شروع کردیا تھا۔ میں ابھی بالکونی سے ہوٹل کی جانب باہر دیکھ رہی تھی کہ کسی شخص نے مجھے پشت سے اچانک پکڑا۔ میں بالکونی سے باہر گرتے گرتے بچی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو وہاں میری نگاہوں کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت بلی آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا۔ میں نے زوردار چیخ ماری۔ اس لڑکے نے مجھے کہا۔

''نامیدل! تمھارے اس زور سے چلانے سے تمھارا مقصد ہرگز پورا نہ ہوگا۔ یہاں تمھاری آواز کی گونج بے اثر ہو گئی ہے۔ تم مجھ سے ڈرو نہیں۔ اس سے پہلے کہ تم مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں......؟ میں تمہیں خود ہی اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔ میں گنیش ہوں''۔

''گنیش جن......'' میرے منہ سے ہونقوں کی طرح نکلا۔

''نامیدل! تم مجھ سے ڈرو نہیں''۔ خوف سے میں تھر تھر کانپنے لگی۔ گنیش نے نہ جانے کیا اپنے منہ میں پڑھا...... میں لاشعوری طور پر اس کے سامنے شانت ہو کر کمرے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''نامیدل! میری چند باتیں غور سے سنو۔ تمہیں یاد ہے کہ تم اپنی سہیلی مس شٹ کی شادی میں شرکت کے بعد رات کو دیر سے واپس آرہی تھی اور تم نے اپنے کپڑوں پر تیز خوشبو لگا رکھی تھی۔ میں اتفاق سے ادھر آوارہ گردی کر رہا تھا کہ اچانک تم پر میری نگاہ پڑ گئی تھی۔ اصل میں تم نے اگر اپنے کپڑوں پر تیز خوشبو نہ لگائی ہوتی تو میں تمہاری جانب مائل نہ ہوتا''۔

''اچھا تو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے جواباً کہا کہ۔

''میں تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنی دنیا میں لے کر جاؤں گا''۔

''دیکھو! میں انسانی دنیا سے تعلق رکھنے والی مخلوق ہوں۔ تم گاڈ کے واسطے اپنی مخلوق میں اپنی کوئی دلہن تلاش کرو۔ یہ ممکن نہیں ہے''۔

''یہ سب کچھ ممکن ہوگا...... ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب تم مجھے اپنا دل بھی دو گی''۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ''۔ ساتھ ہی میں چلانے لگی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ حالانکہ میں نے اپنے حلق سے زور سے آواز نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن میری آواز کی گونج مجھے اپنے کانوں تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''یوں فضول چلا کر اپنا وقت ضائع نہ کرو نامیدل'' اس نے مجھے کہا۔ ''اچھا پھر آؤں گا''۔ گنیش جن ایک سفید دھویں کی صورت میں تبدیل ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے فادر اور ممی بھی آگئے۔ انہیں میری پریشان حالت دیکھ کر تشویش ہوئی۔ میرے فادر نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ۔

''گنیش ایک مجسم صورت اختیار کر کے مجھ سے یہاں ملنے آیا تھا''۔ اس واقعے کے بعد وہ مجھے شہر در شہر مختلف مذاہب کے ماہر عملیات، جنوں اور روحوں کو سمجھنے والے ماہرین کے پاس لے کر گئے۔ ان میں سے اکثریت نے فادر کو کہا کہ۔

''گنیش جن ایک ضدی، ڈھیٹ قسم کا جن ہے۔ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے''۔ بالآخر میرے فادر اور ممی نے فیصلہ کیا کہ میری شادی کر دی جائے۔ اسی دوران آپ میری زندگی میں آگئے۔ گنیش بھی میرے خواب میں بہت کم آتا تھا''۔ نامیدل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''میری جب آپ سے شادی ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں ہر صورت میں اپنی تعلیم کو جاری رکھوں گی۔ مجھے UPPER HISTORY کی ڈگری لینے کا شوق بھی تھا۔ اس لیے میں نے آپ سے اسی شرط پر شادی کروں گی کہ آپ میری ڈگری کے حصول تک آپ مجھ سے زیادہ محبت کے لیے رجوع نہیں کریں گے۔ آپ سے شادی کے بعد میں آپ کے بنگلے کے اوپری کمرے میں اپنی اسٹڈی میں مصروف تھی کہ اچانک ایک بار پھر گنیش جن مجسم بن کر وہاں بھی آگیا۔ میری پھر وہی کیفیت ہو گئی یعنی اس نے نہ جانے مجھ پر کیا پڑھا...... میں نے چلانا شروع کیا۔ میری آواز میرے حلق میں دب کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ۔

''نامیدل! اب تو میرے ساتھ میری دنیا میں چلنے

کی تیاری کرو"۔ میں جھنجلا کر اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ گاڈ کے واسطے میری زندگی سے نکل جاؤ"۔ گنیش جن نے کہا۔

"نامیدل! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری چاہت کسی اور کی بانہوں میں جھولے"۔

"دیکھو! یہ تم کیا بے وقوفوں والی بات کر رہے ہو۔ تم مجھے جیت کر بھی ہار جاؤ گے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ میرے دل کا مرکز فائز ہے"۔

گنیش جن نے کہا کہ۔

"تم اس بات کو چھوڑو کہ تم مجھے کبھی بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دو گی۔ یہ میرا کام ہے تمہارے دل میں اپنے جادو سے اپنی محبت پیدا کر دوں گا۔ تم اگر مجھ سے روزانہ اوپر اس اسٹڈی روم میں ملنے نہ آئی تو یاد رکھو میں فائز کو موت کا مزا چکھا دوں گا"۔

"تم ایسا نہیں کرو گے"۔ میں نے چلا کر کہا۔

"اچھا تمہیں اگر واقعی اپنا شوہر عزیز ہے تو میں اس کی جان ایک شرط پر نہیں لوں گا"۔

"کس شرط پر؟" اس نے اپنے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا کہ۔

"تم مجھ سے روزانہ لائبریری میں رات 9 بجے ملنے آیا کرو۔ ویسے میں نیچے تمہارے خاوند کے سامنے بھی دھڑلے سے آ سکتا ہوں"۔

"دیکھو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

"سوچنے دو۔ اگر سوچتا ہے۔ میں نے تو ویسے بھی تمہیں اپنی دنیا میں اپنی دلہن بنا کر لے جانا ہے۔ نامیدل! تم فکر نہ کرو میں تمہیں اپنی دنیا میں تمہارے شوہر مسٹر فائز سے زیادہ خوشحال رکھوں گا"۔

"نہیں گنیش! مجھے مزید اور کچھ نہیں چاہیے تم پلیز میری پرسکون، خوشحال زندگی خراب نہ کرو۔ دیکھو میری مسٹر فائز سے شادی کرنے کے بعد زندگی معیاری اور مکمل ہے"۔

"لیکن تمہارے بغیر میں اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا میری ضد ہے"۔

نامیدل نے روتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کا یہ عجیب وغریب باب سنایا وہ اپنی جگہ انتہائی پریشان تھی۔

"اچھا تم فکر نہ کرو، پریشان نہ ہو۔ میں کچھ کرتا ہوں"۔ نیز میں نے اسے یہ سمجھایا کہ۔ "تم اپنی اسٹڈی کو چھوڑو اور روٹین کی محبت سے لبریز بیوی بن کر میرے پہلو میں آؤ"۔ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ وہ روٹین کے مطابق میرے پہلو میں آ کر مجھ سے محبت کرنے لگی..... اس نے خود مجھے کہا کہ۔

"تمہارے اور میرے درمیان میری تعلیم مکمل ہونے کا یہ معاہدہ غیر اخلاقی بلا جواز تھا کہ تم اور میں حقِ زوجیت کے معاملے میں صرف چھٹی کے روز رجوع کریں گے۔ آج میں بذاتِ خود معاہدہ ختم کرتی ہوں"۔

ایک رات اس نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ۔

"میں آخری وقت تک تم سے وفا کروں گی"۔ اس رات میں نے دل کھول کر محبت بھری باتیں کیں تھیں۔ صبح کے وقت میری گہری نیند سے آنکھ لگ گئی۔ میرے خواب میں پہلے عجیب وغریب شبیہ بننا شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ شبیہ سے ایک مکمل شکل اختیار کر گئی۔ بالکل ایسی طرح جیسا کہ نامیدل نے مجھے بتائی تھی۔ اس شخص نے مجھے بڑے تحمل بھرے لہجے میں کہا۔

"فائز! تم نامیدل کی عارضی محبت ملنے کی وجہ سے زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو میں نے نامیدل کا دل و دماغ تبدیل کر دیا ہے۔ تم آنکھیں کھول کر دیکھو نامیدل اب تمہاری نہیں رہی..... میں اس کے دل و دماغ میں بس گیا ہوں"۔ میں نے چونک کر آنکھ کھولی تو میں نے اپنے ساتھ لیٹی نامیدل کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ۔

"نامیدل! اٹھو..... نامیدل اٹھو"۔ وہ گہری نیند میں بڑبڑاتے میں اٹھی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک زوردار چیخ مارنے کے بعد مجھے دھکیلتے ہوئے دیوانہ وار انداز میں کہا۔

"تم کون ہو؟ میں کہاں ہوں.....؟"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے.....؟ نامیدل! میں تمہارا

شوہر مسٹر فائز ہوں اور تم میری بیوی ہو۔" اس نے جنونی حالت میں میرا منہ نوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں گنیش کی بیوی ہوں"۔ میرا دل اس اندیشے سے زور زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ اس خبیث گنیش جن نے اپنا کام کرڈالا ہے۔

ثامیدل اپنے آپ میں نہ تھی۔ میں نے کاسوبابا کو کہا کہ "ہم فوری طور پر ثامیدل کو مینٹل ہسپتال لے کر جائیں گے۔ تم کسی طرح اسکی فیملی کو اطلاع کرو"۔ ہم ثامیدل کو فوری طور پر ہسپتال لے کر پہنچے۔ وہاں اسے ڈاکٹروں نے شانت کرنے کے لیے کچھ ٹیکے لگائے۔ چند لمحوں کے بعد اس کی فیملی بھی ہسپتال میں آ گئی۔ میں نے مسٹر بیرٹ کو کہا کہ "تم نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکہ کیا ہے۔ کہ تم نے میرے گلے اپنی پاگل لڑکی ڈال دی ہے"۔

بیرٹ نے شرمندہ ہونے کی بجائے کہا۔

"تمہارا اور ہمارا اسٹیٹس ایسا تھا کہ تم میری بیٹی سے شادی کے قابل نہ تھے"۔ اس نے بڑے مغرورانہ انداز میں اپنا سینہ پھلاتے ہوئے کہا کہ۔

"میں ایک رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا اعلیٰ آفیسر ہوں اور تم ایک معمولی ایجوکیٹڈ تم جیسے ہزاروں بھارت میں رلتے پھرتے ہیں"۔

ثامیدل کی دیوانگی، پاگل پنا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہسپتال کی جانب سے دی جانے والی نشہ آور دوائیاں اور ٹیکے سب بے اثر ثابت ہورہے تھے۔ ثامیدل مسلسل فلک شگاف چیخ مار کر شور کررہی تھی کہ۔

"گنیش جن تم کہاں ہو......؟ میں کہاں آ گئی ہوں......؟ یہ فائز بدمعاش کون ہے؟ جو مجھے میرے بستر سے اٹھالایا ہے......؟ گنیش مجھے تم سے محبت ہے"۔

میں اس کے قریب جاتا تو وہ میرے چہرے پر تھوک کر کہتی تھی۔

"خبردار! تم مجھے ہاتھ نہ لگانا میں گنیش کی دلہن ہوں"۔ مینٹل ہسپتال والوں نے اپنے طور پر اسے شانت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے قابو میں نہ آئی۔ مسٹر بیرٹ اور اس کی بیوی ہسپتال سے چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے مجھے کہا کہ۔

"سچی بات ہے ثامیدل کا کیس ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ لہٰذا تم اسے جن وغیرہ کے سلسلے کو سمجھنے والے ماہر عملیات، روحوں کو نکالنے والوں کو دکھلاؤ"۔ میں ثامیدل کو تھل لال کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھے کہا کہ۔

"یہ کیس میرے پاس پہلے بھی مسٹر بیرٹ لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے یہ مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ گنیش ایک طاقتور جن اور عشق مزاج، ضدی اور نادیدہ مخلوق ہے۔ لہٰذا وہ اسے ہر صورت میں اپنالے گا۔ لہٰذا اب تمہارا ادھر ادھر پھرنا بے کار ہے"۔

"کاش! وہ مجسم انسان ہوتا تو میں اس کے بخیے ادھیڑ دیتا"۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو کھینچ کر کہا۔

میں نے تھل لال کے بعد ثامیڈل کو نہ جانے کہاں کہاں لے کر پھرا، میں نے دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن گنیش جن کا نام سن کر بڑے بڑے ماہر عملیات اپنے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔

ادھر ثامیدل کے دل و دماغ کو گنیش نے میری جانب سے اتنا تبدیل کردیا تھا کہ وہ جنونی حالت میں مسلسل چلا چلا کر کہتی تھی کہ۔

"مسٹر فائز! مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم کون ہو؟ میرا شوہر گنیش ہے"۔

ایک دن ثامیدل مردہ پائی گئی تھی۔ مجھے تھل لال ماہر عملیات نے بتایا کہ۔

"گنیش جن اس کی روح کو اپنی دلہن بنا کر اپنی دنیا میں لے جاچکا ہے"۔

اس کہانی کا ایک پہلو راوی فائز نے یہ بتایا کہ۔

"مجھے ایک بار اس قسم کا خواب آیا جس میں میں نے دیکھا کہ ثامیدل خوبصورت دلہن والے کپڑے پہنے ایک خوبصورت نوجوان گنیش جن کے ساتھ ایک پارک میں بیٹھی اس سے محبت بھری اٹکھیلیاں کررہی تھی"۔

خوفناک مندر

صفدر شاہین۔ملتان

خوبرو حسینہ کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ چارپائی پر چادر اوڑھے ایک شخص سو رہا ہے تو اس نے طیش میں آکر چادر کھینچ لی اور پھر اگلا منظر حسینہ کا دل دہلا گیا کیونکہ چارپائی پر کوئی انسان نہیں بلکہ ایک ڈھانچہ موجود تھا اور پھر......

کہنہ مشق رائٹر کی لکھی ہوئی اچھوتی انوکھی خوفناک دہشت ناک اور حیرت انگیز شاہکار کہانی

رحمان جیولرز کا نیون سائن دیکھ کر شازیہ رک گئی۔ اس بازار میں اسے یہ پہلی جیولری شاپ نظر آئی تھی جس کے نام سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی مسلمان کی دکان ہے اس نے اپنے شوہر تنویر احمد کو اس دکان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس دکان پر خریداری کی جائے تو ہندو جیولرز کے مقابلے میں یہاں قیمتیں کچھ کم ہی ہوں گی۔"

"ہاں...... کچھ نہ کچھ تو فرق ضرور ہوگا۔" تنویر نے دکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں شکیل کے پاس پہنچنا ہے تاکہ رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے ورنہ ہوٹل میں رات گزارنی پڑے گی...... شاپنگ تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے بھی شاپنگ ابھی نہیں کرنی ہے۔ میں تو آئندہ کے لئے کہہ رہی تھی۔" شازیہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ ان کی شادی پندرہ دن پہلے ہوئی تھی اور وہ ہنی مون منانے کے لئے ایک گھنٹہ قبل لاہور سے یہاں پہنچے تھے۔ تنویر احمد کی لاہور میں اسپیئر پارٹس کی بہت بڑی دکان تھی۔ والد صاحب نے شادی سے پہلے ہی کاروبار اسے سونپ دیا تھا۔ دکان پر ایک منیجر اور دو سیلز مین ملازم تھے۔

شادی کے بعد ہنی مون کا پروگرام بنا تو تنویر نے سنگاپور جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن شازیہ کو انڈیا دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے دہلی میں ہنی مون منانے کی خواہش ظاہر کی تو تنویر انکار نہ کر سکا، اسے شازیہ سے بہت محبت تھی اور دونوں میں سال بھر افیئر چلتا رہا۔ پھر شازیہ نے ایف اے پاس کر لیا تو تنویر کی خواہش پر اس کے والد نے شازیہ کے والدین سے شازیہ کا رشتہ مانگ لیا۔ وہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک تاجر گھرانے میں بیٹی کا رشتہ کرنا ان کے لئے فخر کی بات تھی۔ اس لئے انہوں نے رشتہ کر لیا اور شازیہ دو کمروں کے مکان سے نکل کر تنویر کی کوٹھی میں آ گئی۔ یہ کوٹھی علامہ اقبال ٹاؤن میں تھی جبکہ تنویر کے والد سمن آباد والی کوٹھی میں رہتے تھے۔

شکیل، تنویر احمد کا دوست تھا، اس کی یہاں کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی، دو سال پہلے تنویر اور شکیل کے درمیان دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ شکیل اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے سلسلے میں ان دنوں لاہور آیا تھا۔ لیکن لاہور ریلوے اسٹیشن پر اس کا پاسپورٹ اور سفری کاغذات گم ہو گئے۔ اتفاق سے تنویر کسی کام کے سلسلے میں اس وقت اسٹیشن پر موجود تھا جب شکیل امیگریشن والوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے کاغذات گم ہو گئے



www.urdusoftbooks.com

ہیں۔ امیگریشن کے عملے میں تنویر کا ایک دوست اور کلاس فیلو بھی تھا۔ اسے شکیل کی بے بسی پر بہت ترس آیا اور اس نے دوست کہہ کر شکیل کی جان چھڑائی۔

شکیل نے تنویر کا شکریہ ادا کیا اور اس کا ایڈریس لے لیا۔ پھر دو دن بعد وہ تنویر سے اس کی دکان پر ملا اور دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے تنویر کو پیشکش کی کہ کبھی دہلی آنے کا پروگرام بنے تو اسے خدمت کا موقع ضرور دے۔

اس واقع سے ان میں دوستی کی ابتدا ہوئی۔ وہ شادی شدہ نوجوان تھا۔ دہلی واپس جانے کے بعد اس نے تنویر کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کردیا۔ گزشتہ سال اس نے اپنے ایک عزیز کے ہاتھ تنویر کے لئے کچھ تحائف بھی بھیجے تھے پھر جب تنویر نے اسے اطلاع دی کہ آئندہ ماہ اس کی شادی ہورہی ہے تو شکیل نے جوابی خط میں اسے دعوت دی کہ وہ ہنی مون دہلی آکر منائے۔

تنویر کے پاس اس کا ایڈریس تھا۔ چنانچہ ایئر پورٹ سے وہ شازیہ کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ صرافہ بازار سے متصل کلاتھ مارکیٹ میں شکیل کی دکان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ وہ اپنے چار پانچ سیلز مینوں کے ساتھ دکان پر موجود تھا۔ اس نے فوراً ہی تنویر کو پہچان لیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا پھر اس نے شازیہ کو سلام کیا اور شادی کی مبارکباد دی۔

"بھائی۔ تم مجھے فون کردیتے میں ایئر پورٹ پہنچ جاتا۔" اس نے تنویر سے کہا۔

"کیا ضرورت تھی۔ ہم تو آ ہی رہے تھے۔ تمہار اوقت کیوں ضائع کرتے۔" تنویر نے ہنس کر کہا۔ "پھر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ دو سال بعد تم مجھے پہچان لوگے یا نہیں اور ہماری اچانک آمد پر تمہیں کتنی حیرت ہوتی ہے۔"

تنویر کی بات سن کر شکیل مسکرانے لگا۔ تنویر اور شازیہ کے لئے کولڈ ڈرنکس منگوانے کے بعد شکیل نے اپنے گھر پر فون کرکے اپنی بیوی کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔

"لنچ کا وقت ہورہا ہے۔ ہم ہوٹل میں لنچ کرلیں گے۔ البتہ رات کا کھانا گھر پر ہی ہوگا۔ لنچ کے بعد میں انہیں گھر لاؤں گا۔"

اس نے بیوی سے کہا۔ "اور ہاں ان کے لئے ایک کمرہ آراستہ کردو۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔" فون بند کرکے اس نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ "آپ کو ہوٹل میں لنچ پر اعتراض تو نہیں ہے بھابی؟"

"نہیں شکیل بھائی۔ اس میں اعتراض کا کون سا پہلو ہے۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں تنویر؟"

"اور کیا۔" تنویر نے جلدی سے کہا۔ "یوں بھی اب اتنا وقت نہیں ہے کہ گھر پر لنچ تیار ہوسکے۔ ایک بج رہا ہے۔"

چند منٹ تک باتیں ہوتی رہیں پھر شکیل نے اپنے ایک سیلز مین کو طلب کرکے اسے ہدایات دیں اور امکان ظاہر کیا کہ ممکن ہے اسے واپس آنے میں کافی دیر لگ جائے۔ اس لئے کوئی ضروری بات ہو تو وہ اسے گھر پر فون کرلے۔ اس کے بعد اس نے ایک ملازم کو ان کا چھوٹا سا سوٹ کیس اپنی گاڑی تک پہنچانے کا حکم دیا جو مارکیٹ سے باہر مین روڈ پر پارک تھی۔ ملازم کے جانے کے بعد وہ شازیہ اور تنویر کے ساتھ دکان سے چل پڑا۔ سڑک پر پارکنگ لین میں اس کی خوب صورت کار کے پاس ملازم موجود تھا۔ اس نے سوٹ کیس ڈگی میں رکھ دیا تھا۔ شکیل نے اس سے گاڑی کی چابیاں لیں۔ تنویر اور شازیہ عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ شکیل نے انجن اسٹارٹ کیا اور ایک طرف چل دیا۔ تنویر اور شازیہ باہر کا نظارہ کرنے لگے۔

چند منٹ بعد شکیل نے ایک فور اسٹار ریسٹورنٹ کے باہر کار روکی اور ان دونوں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں آ بیٹھا۔ کافی شاندار اور وسیع ریسٹورنٹ تھا۔ اس نے کئی ڈشیں منگوالیں۔ پرتکلف کھانے کے بعد وہ انہیں گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر کو چل دیا۔ تنویر کو اس نے چھ ماہ پہلے بھی خط میں بتادیا تھا کہ اس نے شہر والا فلیٹ بیچ کر دہلی کے نواح میں ایک نئی آبادی میں گھر خرید لیا ہے۔ لیکن تنویر کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی تھی۔ شہر کی پرہجوم سڑکوں سے گزرتے ہوئے جب وہ کھلے علاقے میں پہنچے تو تنویر کو حیرت ہوئی۔

"یار...... تم ہمیں سیر کرارہے ہو یا گھر لے جارہے ہو؟" اس نے شکیل سے پوچھا۔

"دونوں کام ایک ساتھ کررہا ہوں پیارے......"

شکیل ہنس پڑا۔"ویسے ہم گھر ہی جارہے ہیں۔"

"تم تو شاید مارکیٹ کے قریب ہی کسی فلیٹ میں رہتے تھے۔" تنویر نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... لیکن اب نہیں۔ شاید تم بھول گئے ہو۔ میں نے تمہیں چھ ماہ پہلے اطلاع دے دی تھی کہ میں شہر سے باہر ایک بنگلہ خرید کر اس میں شفٹ ہو گیا ہوں۔"

اوہ۔ آئی سی!" تنویر نے سر ہلایا۔"واقعی میرے ذہن میں نہیں رہا۔"

"شادی کے بعد کافی باتیں آدمی کے ذہن سے نکل جاتی ہیں۔" شکیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور اس کا مطلب سمجھ کر شازیہ بھی مسکرا دی۔ مزید پندرہ منٹ کے سفر کے بعد وہ شکیل کے گھر پہنچ گئے بنگلہ چھوٹا مگر بہت خوب صورت تھا۔ گیٹ پر مسلح چوکیدار موجود تھا۔ اس نے گیٹ کھولا۔ شکیل کی بیوی حنا نے برآمدے میں آ کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی، شکیل نے شازیہ اور تنویر سے اس کا تعارف کرایا، پھر وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ حنا نے ملازمہ کو چائے لانے کی ہدایت کردی۔ چائے کے دوران میں ہی وہ دونوں کافی بے تکلف ہو گئیں۔ شازیہ اور تنویر کے لئے اس نے بیڈ روم سیٹ کر دیا تھا۔

"اچھا بھئی...... اب آپ لوگ آرام کریں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔" ایک گھنٹہ بعد شکیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ واپس دکان پر چلا گیا۔ حنا نے ان دونوں کو بیڈ روم میں پہنچا دیا تا کہ وہ سفر کی تھکان دور کر سکیں۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا بہت ہی پرتکلف تھا۔ حنا نے کئی ڈشیں تیار کی تھیں۔ شکیل نے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں تنویر سے کہا۔"تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے ہنی مون کے سلسلے میں؟"

"کیا مطلب؟" تنویر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی تم لوگ پاکستان سے یہاں ہنی مون منانے آئے ہو۔ اب ہنی مون یہاں گھر میں بیٹھ کر تو نہیں منایا جا سکتا۔"

شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔"آخر ہنی مون کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ مثلاً سیر سپاٹا، خوب صورت مقامات پر جانا اور دوسری تفریحات، تم لوگ کہیں جانا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں...... لیکن کیا تم ہمارا ساتھ دو گے۔" تنویر نے کہا۔

"لاحول ولا...... ارے بھئی ہنی مون تم دونوں نے منانا ہے۔ ہم تو دو سال پہلے اس مرحلے سے گزر چکے ہیں۔"

شکیل کی بات سن کر حنا اور شازیہ بے اختیار ہنس دیں۔ تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔"خیر تمہاری مرضی ہم پہلے تو دہلی کا لال قلعہ اور دوسرے مقامات دیکھیں گے پھر آگرہ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ کل اتوار ہے۔ میں فارغ ہوں گا۔" شکیل نے سر ہلا دیا۔

"شکیل بھائی...... میں نے ہندوؤں کے رسم و رواج کے بارے میں کافی پڑھا ہے۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"اور ہاں مجھے ستی کی رسم دیکھنے کا بہت شوق ہے جس میں مرنے والے کی بیوہ کو بھی شوہر کے ساتھ جلایا جاتا ہے۔"

"بھابھی...... یہ رسم اب شہروں میں تو ختم ہو چکی ہے البتہ دیہی علاقوں میں کٹر قسم کے ہندوؤں میں ابھی بھی یہ رسم جاری ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی گاؤں میں جانا پڑے گا۔"

"اچھا تو پھر کل ہی ہمیں گاؤں لے چلیں...... کل تو آپ کی چھٹی ہے ناں۔" شازیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" تنویر نے سر ہلایا پھر شکیل سے بولا۔ "بھئی میری بیگم بہت ایڈونچر پسند ہے۔ شادی سے پہلے اس نے "دت بھارتی" اور "کرشن چندر" کے ناول و افسانے پڑھے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہندو عورت شوہر کی محبت میں کیسے ستی ہوتی ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن بھابھی کو انتظار کرنا پڑے گا۔" شکیل نے مسکرا کر کہا۔

"انتظار" شازیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔"کس کا انتظار۔"

"کسی کے مرنے اور بیوہ ہونے کا۔" شکیل ہنس پڑا۔ "ظاہر ہے ہماری فرمائش پر تو کوئی عورت ستی نہ ہوگی۔"

اس کے جواب میں سب ہنسنے لگے پر شکیل نے دوبارہ کہا۔ "بھابھی اگر آپ یہ رسم دیکھنا چاہتی ہیں تو میں آپ دونوں کو ایک گاؤں پہنچا دیتا ہوں۔ میرے ایک سابقہ ملازم کا وہاں گھر ہے۔ آپ کو وہاں دو تین دن رہنا پڑے گا۔ اس دوران میں ممکن ہے وہاں کسی کے مرنے پر ستی کی رسم ادا کی جائے۔ کیا خیال ہے؟"

"گڈ آئیڈیا...... ہمارے پاس ایک ماہ ہے۔" شازیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"وہاں کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی۔" تنویر نے پوچھا۔

"بالکل نہیں چھوٹا سا گاؤں ہے۔ سب لوگ شہر سے آنے والوں کی پیروں کی طرح عزت کرتے ہیں۔ رہائش کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے سابقہ ملازم کرشن کا وہاں تین کمروں کا گھر ہے۔ جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ چھ ماہ پہلے میں اس کی شادی پر وہاں گیا تھا۔ شادی کے لئے میں نے اسے معقول امداد بھی دی تھی۔ اس کی بیوی سیتا بہت خوب صورت ہنس مکھ ہے۔ اس کے ساتھ بھابھی کا اچھا وقت گزرے گا۔ گاؤں کے باہر مرگھٹ ہے۔ جہاں گاؤں والے اپنے مردے جلاتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ صبح وہاں جائیں گے۔ اس وقت تو نیند آرہی ہے۔" تنویر نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ اور شازیہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ شازیہ سمجھ گئی کہ وہ بیڈروم میں جانے کے لئے بےتاب ہے۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے...... کیا سوچ رہے ہو؟" شازیہ نے تنویر کو چھت کی طرف متوجہ پا کر آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں......" تنویر نے چونکتے ہوئے کہا۔

"کچھ تو ہے...... جو سوچوں میں ڈوبے ہوئے ہو۔" شازیہ نے اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے۔"

"بس یونہی...... ایک خیال آ گیا تھا۔" تنویر اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے مسکرایا۔

"کیسا خیال؟" شازیہ نے سوال کیا۔

"یہی کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی حسن کی دیوی مل گئی۔"

"غلط۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ "دیوی تو مردہ ہوتی ہے۔ پتھر کی مورتی۔ جب کہ میں زندہ ہوں۔"

"ڈارلنگ میں چاہتا ہوں کہ ہم سارا وقت تفریح میں گزاریں...... اس لئے تم گاؤں میں چھاؤنی مت ڈالنا۔" چند لمحوں بعد تنویر نے اس سے کہا۔ "میں نے تمہاری خوشی کے لئے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن مجھے شہر کا ماحول اور روشنیاں پسند ہیں۔ اس لئے میں دو دن سے زیادہ وہاں نہیں رہ سکوں گا۔ بس یہ خیال ضرور رکھنا۔"

شازیہ نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ گاؤں میں زیادہ دن نہیں رہے گی۔

☆......☆......☆

دستک کی آواز سن کر شازیہ بیدار ہوگئی۔ اس نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی تو آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے تنویر پر چادر ڈالی اور سلیپنگ گاؤن پہن کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے پر حنا دکھائی دی۔

"بہت گہری نیند سوتی ہو بھابھی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "تین بار دستک دے چکی ہوں۔"

"سوری......؟" شازیہ بھی مسکرا دی۔ "دراصل نیند دیر سے آئی تھی۔"

"او پھر تو میں نے غلطی کی ہے تمہیں جگا کر۔ بھائی جان تو شاید اندر آتے ہی سو گئے ہوں گے۔"

"بہت شریر ہو حنا تم۔" شازیہ نے اس کا مطلب سمجھ کر اس کے رخسار پر چٹکی لی۔

"میں ناشتہ تیار کرنے لگی ہوں تم لوگ غسل سے فارغ ہو کر ڈائننگ روم میں آ جاؤ۔"

وہ یہ کہہ کر واپس چل دی۔ شازیہ مسکراتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ غسل سے فارغ ہو کر اس نے تنویر کو جگایا پھر نو بجے کے قریب وہ دونوں ناشتے کی میز پر پہنچے تو حنا اور شکیل اس کے منتظر تھے۔ ناشتے کے دوران میں باتیں

ہوتی رہیں۔ پھر ساڑھے نو بجے شکیل انہیں اپنی کار میں لے کر چل دیا۔ حنا بھی ساتھ ساتھ تھی، لیکن اس کو شکیل کے ساتھ واپس آنا تھا۔ شکیل کے سابقہ ملازم کا گاؤں وہاں سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ جس میں پندرہ میل کچی سڑک کا سفر تھا۔ کچا راستہ ناہموار تھا۔ اس لئے شکیل احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔

پچاس میل کا فاصلہ مین روڈ پر ایک گھنٹے میں ہوا تھا لیکن کچے راستے پر پندرہ میل کرنے میں چالیس منٹ لگ گئے۔ آخر نہر کے پار انہیں اپنی منزل نظر آنے لگی۔ نہر کے پل سے گزر کر وہ پانچ منٹ میں گاؤں کے پاس پہنچ گئے، چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس میں ساٹھ ستر کچے پکے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ آبادی کی دوسری جانب ایک مندر نظر آ رہا تھا۔ گاؤں کے آس پاس کی زمین ناہموار تھی جس پر گھنے درختوں کی بہتات تھی۔ کہیں کہیں سرسبز کھیت بھی تھے اور اونچے نیچے ٹیلے بھی۔

کرشن کا گھر گاؤں کے ابتدائی حصے میں تھا۔ کچا راستہ اس گاؤں تک ہی تھا۔ چنانچہ شکیل نے راستے پر ہی گاڑی روک دی۔

اتنے میں گاؤں کے چند بچے گاڑی کے قریب آ گئے۔ شکیل نے ان میں ایک سے کہا۔

"بیٹے ذرا کرشن کمار کو تو بلاؤ...... ہم اس کے مہمان ہیں......"

لڑکا فوراً پلٹ کر گھروں کی طرف دوڑ گیا۔ تین چار منٹ بعد ایک نوجوان تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ وہ شکیل اور تنویر سے عمر میں آٹھ دس سال کم ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر دبلا پتلا اور قد لمبا تھا۔

"کرشن آ رہا ہے۔" شکیل نے اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حیرت ہے۔"

"حیرت کس بات پر۔" اس کے ساتھ بیٹھے تنویر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی صحت پر...... شادی سے پہلے یہ پہلوانوں کی طرح صحت مند اور موٹا تھا۔ لیکن اب کافی کمزور معلوم ہوتا ہے۔"

اتنے میں کرشن قریب آ پہنچا۔ شکیل اور تنویر کار سے نکل آئے تھے۔ کرشن نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ شکیل اور تنویر نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر شکیل اسے بتانے لگا کہ وہ اس سے ملنے اور گاؤں کی سیر کرنے آئے ہیں۔

کرشن ان کی آمد پر خوش ہو رہا تھا۔ وہ انہیں اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی سیتا کو دیکھ کر شازیہ اور حنا احساس کمتری محسوس کرنے لگیں۔ وہ ان دونوں سے کئی گنا خوب صورت اور متناسب الاعضا جسم رکھتی تھی۔ رنگ بھی گورا تھا۔ کرشن نے انہیں کمرے میں کرسیوں پر بٹھایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ ان کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر کے پرتکلف کھانے سے فارغ ہو کر شکیل نے کرشن کو اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ تنویر اور شازیہ گاؤں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے دو تین دن اس کے مہمان رہیں گے۔

"یہ تو ہماری خوش قسمتی ہوگی جناب۔" کرشن نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سے جو ہو سکا ان کی خدمت کریں گے۔"

شکیل نے کرشن کو یہ بتانے سے گریز کیا کہ تنویر اور شازیہ پاکستان سے آئے ہیں۔ تا کہ گاؤں والے تعصب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کے بجائے اس نے کرشن سے یہ کہا کہ تنویر اس کا کزن ہے اور دہلی میں اس کا بہت بڑا بزنس ہے۔ بعد میں اس نے تنہائی میں تنویر اور شازیہ کو ہدایت کی کہ وہ خود کو وہاں پاکستانی ظاہر نہ کریں۔

کرشن نے اپنے مکان کے بقیہ دو کمروں میں سے ایک کمرہ ان دونوں کے لئے سجا دیا۔ برابر کے کمرے میں وہ اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ جبکہ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ جسے کرشن نے بند کر دیا تھا۔ چار بجے شکیل اور حنا نے واپس جانے کا ارادہ کیا اس نے کرشن سے کہا۔

"کرشن میں جا رہا ہوں۔ اپنے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دینا۔ جلدی میں تم لوگوں کے لئے کوئی تحفہ نہ لا سکا۔ یہ رکھ لو۔"

اس نے ایک ہزار روپے کا نوٹ کرشن کی طرف بڑھایا۔ لیکن کرشن نے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی شکیل نے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔ چند منٹ بعد

دونوں رخصت ہو گئے۔ کرشن انہیں گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ اس کی بیوی سیتا ایک چارپائی پر بیٹھی شازیہ اور تنویر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تنویر بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیتا کا حسن اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہا تھا۔
کرشن واپس آیا اور سیتا کے پاس بیٹھ گیا۔
''تم دونوں میں میاں بیوی کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ہے؟'' شازیہ نے کرشن سے پوچھا۔
''ہاں بیگم صاحب۔ یہ میرے ماموں کی بیٹی ہے۔'' کرشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اچھا۔ کیا وہ بھی اسی گاؤں میں رہتے ہیں؟''
''جی ہاں۔ وہ مندر میں رہتے ہیں۔'' کرشن بولا۔
''ان کی سیتا کے سوا کوئی اولاد نہیں ہے اور بیوی دو سال پہلے مر گئی تھی۔ ہماری شادی کے بعد انہوں نے مندر میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ وہ مندر کے مہا پجاری ہیں۔''
''مندر کتنی دور ہے۔ میں اس کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔'' شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ضرور کریں۔ جب آپ کا دل چاہے بتا دیجئے گا۔ سیتا آپ کو وہاں لے جائے گی۔''
''تم کیا کام کرتے ہو کرشن؟'' تنویر نے سوال کیا۔
''جی پہلے تو میں شہر میں شکیل صاحب کے پاس کام کرتا تھا لیکن اب گاؤں میں زمیندار کے پاس نوکری کرتا ہوں۔''
''کس قسم کی نوکری؟ کیا اس کی زمین پر کاشت کرتے ہو۔'' تنویر نے چونکتے ہوئے کہا۔
''نہیں..... میں رات کے وقت اس کی بھینسوں، بکریوں کے باڑے کی رکھوالی کرتا ہوں۔ کیونکہ رات میں جنگل کی طرف سے بھیڑیے اس طرف آتے ہیں اور بھیڑ، بکریوں کو کھا جاتے ہیں۔ وہاں سے میں صبح سات آٹھ بجے گھر آ جاتا ہوں۔''
''تو کیا رات کو سیتا یہاں تنہا رہتی ہے۔'' شازیہ نے حیرت سے پوچھا۔
''جی ہاں...... یہ گاؤں ہے...... یہاں کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ ویسے بھی سیتا کی حفاظت اس کا باپ کرتا ہے۔''
کرشن کی بات سن کر تنویر کو بہت حیرت ہوئی۔
چند منٹ بعد شازیہ نے کرشن سے کہا۔ ''کرشن میں ذرا مندر دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''کیا آپ نے پہلے کبھی مندر نہیں دیکھا دیدی۔'' کرشن نے حیرت سے کہا۔
شازیہ نے تنویر کی طرف دیکھا۔ تنویر جلدی سے بولا۔ ''دیکھا تو ہے۔ لیکن یہ شہری اور دیہی مندر میں فرق معلوم کرنا چاہتی ہے۔''
''ٹھیک ہے، چلیے میں آپ کو دکھاتا ہوں۔'' کرشن بولا۔ ''لیکن پوجا پاٹ صبح کے وقت ہوتی ہے وہاں۔''
''فی الحال، میں باہر سے دیکھوں گی۔'' شازیہ نے مسکرا کر کہا۔ پھر تنویر سے بولی۔ ''چلو تنویر۔''
''سیتا۔ تم مہمانوں کے لئے رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دو۔'' کرشن نے سیتا کو ہدایت کی۔
''ابھی سے۔'' شازیہ حیرت سے بولی۔ ''ہم لوگ تو رات نو بجے سے پہلے نہیں کھاتے۔''
کرشن نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے دیدی۔ شہر والے نو دس بجے رات کا کھانا کھاتے ہیں لیکن گاؤں میں سورج ڈوبتے ہی لوگ کھانا کھا لیتے ہیں۔''
تنویر نے شازیہ سے کہا۔ ''تم بھی اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آ جانا۔''
''اوہ، تو کیا تم نہیں چل رہے ہمارے ساتھ۔'' شازیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''سوری ڈیئر...... میں کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔ اس سفر نے چولیں ہلا دی ہیں۔'' تنویر نے مسکرا کر کہا۔ ''تم جاؤ کرشن بہت مخلص آدمی ہے۔ یہ تمہارا خیال رکھے گا۔''
''ہاں دیدی، آپ کوئی فکر مت کریں۔'' کرشن جلدی سے بولا۔ ''یہاں میری بڑی عزت ہے۔ مندر کے پروہت کا بھانجا اور داماد ہونے کے سبب سارا گاؤں ہماری عزت کرتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو آپ کی طرف میلی نگاہ سے دیکھے۔ میرے ماموں کے جاہ و جلال سے سب

ڈرتے ہیں۔"

"اچھا۔ پھر تم آرام کرو۔ کوئی اسپرین وغیرہ لے لو۔ تاکہ شام تک ٹھیک ہو جاؤ۔" شازیہ نے تنویر سے کہا۔

پھر وہ کرشن کے ہمراہ باہر چلی گئی۔ سیتا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ تنویر دانستہ شازیہ کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ سیتا کے ملکوتی حسن سے آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتا تھا۔ جس نے پہلی نظر میں ہی اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سیتا کی طرف دوستی کا قدم بڑھائے تو اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ سیتا نے چند لمحوں بعد سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور تنویر کی نگاہوں کا مرکز جان کر ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو سیتا؟" تنویر نے آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔

"کہیں نہیں۔ بابو جی۔ کھانے کی تیاری کرتی ہوں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"ابھی تو شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ بیٹھو۔" تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی کام ہے بابو جی۔ حکم کریں۔" وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کام تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن تنہائی میں مجھے بوریت ہوتی ہے۔ چند منٹ بیٹھو۔ پھر چلی جانا۔"

سیتا کے گلابی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور وہ دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تنویر کی کرسی اس سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر تھی اور اس کا رخ سیتا کی طرف ہی تھا۔

"کرشن کیسا ہے۔ کیا وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔" تنویر نے اس کے رخساروں پر نگاہیں جما کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتا بابو جی۔" وہ شرما کر بولی۔ "یہاں تو ماں باپ جس سے بیاہ دیں گزارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے زیادہ خوش نہیں ہو۔" تنویر نے کہا۔ "شاید اس لئے کہ وہ تمہیں بھرپور محبت نہیں دیتا۔"

"اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا بابو جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "شادی کا پہلا مہینہ ٹھیک گزرا تھا۔ اس کے بعد اس نے زمیندار کی ملازمت شروع کر دی اب اس کی راتیں وہیں بسر ہوتی ہیں۔ صرف دن کے وقت وہ گھر پر ہوتا ہے۔ اس میں سے بھی وہ چھ سات گھنٹے سو کر گزار دیتا ہے۔ کچھ وقت وہ گاؤں کے دوستوں کے ساتھ یا اپنے ماں باپ کے گھر وقت گزار دیتا ہے۔ میرے لئے اس کے پاس دو تین گھنٹے ہی ہوتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر تنویر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً سیتا مرد کی محبت کی پیاسی تھی اور کرشن سے اسے ضرورت کے مطابق محبت نہیں ملی تھی۔ اس صورت میں اس کی پیش قدمی سیتا کے لئے تسکین کا باعث بن سکتی تھی۔

"بڑے دکھ کی بات ہے سیتا....." اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "کرشن کو تمہارے جذبات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اول تو اسے ایسی نوکری کرنی ہی نہیں چاہئے کہ تمہاری رات تنہائی میں گزرے اور اگر مجبوراً نوکری کر رہا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ سارا دن تمہارے پاس گزارے اور تمہیں بھرپور محبت دے جو ہر عورت کا حق ہے تم کسی وقت اسے سمجھاؤ نا۔"

"میں اسے کیسے سمجھا سکتی ہوں بابو۔" سیتا کی آواز بھرا گئی۔ "اسے تو خود احساس کرنا چاہئے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ تنویر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اوہ۔ تم رو رہی ہو پگلی۔ شاید میری باتوں سے تمہیں دکھ پہنچا ہے۔" وہ سیتا کے قریب پہنچا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے شہابی رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "مجھے معاف کر دو سیتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے کاش میں تمہیں کرشن کی محبت دے سکتا۔"

اس کے رخساروں کو چھوتے ہوئے جذبات سے تنویر کی آواز بھاری ہو گئی۔ سیتا کے جسم پر بھی چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ تنویر کے ہاتھوں کے لمس سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور جسم لرزنے لگا تھا۔ اس نے تنویر کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تنویر نے دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں سیتا، مجھے حیرت

ہے کہ کرشن کو تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں، کیا وہ اتنا ہی نادان ہے۔"

"نہیں بابو جی۔" سیتا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا خاصا سمجھدار ہے۔"

"پھر وہ تمہاری قدر کیوں نہیں کرتا۔" تنویر نے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا جو سرخ ہوتی جارہی تھیں۔ "کیا اسے تمہارے کشمیری سیبوں جیسے رخسار اچھے نہیں لگتے۔ کیا وہ گلابی ہونٹوں کو پسند نہیں کرتا۔"

وہ سسک کر اس کے سینے سے آ لگی۔ "یہ...... یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو جی؟"

"ہاں سیتا۔ میں درست کہہ رہا ہوں۔" تنویر اسے سمیٹتے ہوئے بولا۔ "شاید اسے تمہاری قدر و قیمت کا احساس نہیں۔ حالانکہ تم میری بیوی کو دیکھ چکی ہو کہ وہ کتنی بھرپور ہے۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری ان گلاب کی پنکھڑیوں میں زیادہ لذت و خوشبو ہے۔ جس نے مجھے دیوانہ کردیا ہے۔"

☆......☆......☆

وہ آبادی سے نکل آئے۔ تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر مندر کی قدیم عمارت نظر آرہی تھی۔ مندر کے بائیں جانب بلند ٹیلے تھے۔ گاؤں والوں نے شازیہ کو حیرت سے دیکھا لیکن کسی نے کرشن سے اس کے متعلق پوچھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہاں سے ایک راستہ مندر کی طرف جاتا تھا۔ جس کے دونوں طرف گھنے اور بلند درخت تھے۔ کرشن اسی راستے پر ہولیا۔ شازیہ اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ گھنے درختوں کے سبب وہاں سے مندر کی عمارت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

"کرشن یہاں مرگھٹ بھی ہے جہاں تم لوگ مرنے والے کی چتا جلاتے ہو......؟" شازیہ نے کرشن کو مخاطب کیا۔

"ہاں دیدی۔ وہ تو ہر گاؤں میں ہوتا ہے۔ مندر کے بائیں جانب جو ٹیلے ہیں وہی مرگھٹ ہے۔" وہ رکے بغیر بولا۔

"اچھا۔ کیا ان ٹیلوں پر مردے جلائے جاتے ہیں۔" شازیہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے چند منٹ بعد مندر کے قریب جا پہنچے۔ مندر کے آس پاس اس وقت کوئی نہ تھا۔ مندر کا دروازہ بھی بند نظر آرہا تھا۔ مندر کی عمارت بہت پرانی معلوم ہوتی تھی۔ شازیہ نے اس کے گرد گھوم کر جائزہ لیا۔ پھر وہ دونوں مندر کے دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا آدمی باہر نکل آیا۔ اس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہیں تھی۔ لیکن وہ بہت صحت مند اور توانا دکھائی دیتا تھا۔ حلیے سے وہ مندر کا پروہت معلوم ہوتا تھا۔ اس نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ کرشن نے جلدی سے ہاتھ باندھ کر اسے پرنام کیا۔ "نمستے ماما۔"

"نمستے کرشن بیٹا۔ یہ لڑکی کون ہے؟" اس نے سلام کا جواب دے کر شازیہ کی طرف غور سے دیکھا۔

شازیہ سمجھ گئی کہ وہ بوڑھا سیتا کا باپ اور کرشن کا ماموں ہے۔ کرشن نے مختصراً شازیہ اور تنویر کے بارے میں اسے بتایا۔

"اچھا پھر تو یہ ہم سب کے مہمان ہوئے۔" کرشن کا ماموں مسکراتے ہوئے بولا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

شازیہ کو اس کی آنکھوں سے خوف محسوس ہورہا تھا۔ اس بوڑھے کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ بھنوؤں اور پلکوں سے محروم اس کی آنکھوں میں عجیب سی درندگی محسوس ہوتی تھی۔ مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ جبکہ سر کے ایک جانب بالوں کی لٹ ہوا سے لہرا رہی تھی۔ اس نے صرف ایک دھوتی باندھ رکھی تھی۔ توند قدرے نکلی ہوئی اور سینہ بالوں سے پاک تھا۔ گلے میں موٹے منکوں والا مالا اور کانوں میں بالے تھے۔

"ان کی کوئی خاطر تواضع بھی کی ہے یا نہیں۔" بوڑھے پروہت نے شازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کرشن سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ انہیں مندر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لئے انہیں یہاں لایا ہوں۔"

"تو اسے اندر لے آؤ بیٹا، باہر کیوں کھڑے ہو۔" پروہت نے ہنس کر کہا۔

"نہیں جی۔" شازیہ نے جلدی سے کہا۔ "میں صبح

پھر آؤں گی اور پوجاپاٹ بھی دیکھوں گی۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے پوجا پاٹ رات کے وقت بھی ہوتی ہے۔ آنا چاہو تو آٹھ بجے کے بعد سیتا یا کرشن کے ساتھ آ جانا۔“ پروہت نے نرم لہجے میں کہا۔ ”بلکہ آج رات آنے کی میری طرف سے دعوت سمجھو۔ آج رات یہاں خاص پوجا ہوگی۔ تمہیں بہت شانتی ملے گی۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور مندر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ شازیہ انکار کرنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ اس کی جرأت نہ کر پائی تھی۔ اس نے کرشن سے پوچھا۔

”تمہارے ماموں کا کیا نام ہے؟“

”شنکر لال۔“ گاؤں والے انہیں پنڈت شنکر کہتے ہیں۔ بہت گیان دھیان والے اور پراسرار علوم کے ماہر ہیں۔“ کرشن نے کہا۔ ”آپ کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے آپ کو خاص پوجا دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ مجھے اور سیتا کو انہوں نے کبھی دعوت نہیں دی۔“

شازیہ نے مرگھٹ دیکھنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کرشن کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ اس کے ذہن پر عجیب سا خوف طاری ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور تنویر کرسی پر آ بیٹھا۔ سیتا نے ہانپتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ تنویر اپنے بھڑکے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ دستک دینے والا گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے کیونکہ شازیہ اور کرشن اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتے۔ چند لمحوں بعد سیتا ایک بڑھیا کے ساتھ اندر آئی۔

”بابو جی۔ یہ کرشن کی ماتا ہیں۔“ اس نے تنویر کی طرف دیکھ کر کہا۔

تنویر نے اخلاقاً اٹھ کر بڑھیا کو سلام کیا۔ بڑھیا نے اسے دعا دی۔ پھر سیتا سے بولی۔ ”کرشن کہاں ہے؟“

”وہ بابو جی کی بیگم کو مندر دکھانے گیا ہوا ہے ماتا جی۔“ سیتا نے بتایا۔ ”کیا کوئی ضروری کام تھا؟“

”نہیں تو۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ شہر سے اس کے مہمان آئے ہیں گاڑی میں۔ مگر میں نے تو سنا تھا کہ وہ چار ہیں۔“

”ہاں۔ کرشن شادی سے پہلے جس دکان پر شہر میں کام کرتا تھا اس کا مالک اور اس کی بیگم آئے تھے لیکن وہ کچھ دیر پہلے چلے گئے۔ یہ بابو اور ان کی بیگم چند دن ہمارے مہمان رہیں گے۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور انہیں گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“

”اچھا اچھا۔ میں سمجھ گئی۔“ بڑھیا نے سر ہلایا۔ ”مہمانوں کی سیوا کرنے سے بھگوان خوش ہوتا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے تو لے آنا۔“

”بہت بہتر ماتا جی۔“ سیتا نے سر ہلا کر کہا۔

تنویر نے اس کے لہجے میں اکتاہٹ محسوس کی تھی شاید اسے بڑھیا کی آمد ناگوار گزری تھی اور وہ اس سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

”بیٹا تم مندر دیکھنے نہیں گئے، اپنی بیگم کو اکیلا ہی کرشن کے ساتھ بھیج دیا۔“ اچانک بڑھیا نے تنویر کو مخاطب کر لیا۔ تنویر نے دیکھا کہ اس کے سوال پر سیتا کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ تنویر سے پہلے ہی بول پڑی۔

”ماتا جی۔ وہ اکیلی گئی ہیں تو کرشن انہیں کھا نہیں جائے گا۔ بابو جی کے سر میں درد تھا اس لئے آرام کر رہے ہیں۔“

”ارے۔ میں تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ شہر والے اپنی عزت کے معاملے میں دوسروں پر اعتبار نہیں کرتے۔“ بڑھیا نے ہنس کر کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ماسی۔“ تنویر نے جلدی سے کہا۔ ”ہمیں کرشن پر اعتبار نہ ہوتا تو ہم یہاں نہ آتے۔“

”اچھا ماتا جی...... میں تو رات کے کھانے پکانے میں لگ رہی ہوں۔ آپ نے بیٹھنا ہو تو بیٹھیں۔“ سیتا نے منہ بنا کر کہا۔

”نہیں۔ میں بھی چلتی ہوں...... صبح آؤں گی ان کی بیگم سے ملنے۔“ بڑھیا نے مڑتے ہوئے کہا۔

اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سیتا بھی باہر گئی اور تنویر بے تابی سے اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ پیار کا

سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کے لئے۔ چند لمحوں بعد ہی وہ اندر آئی اور تنویر نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ لیکن وہ قریب آنے کے بجائے دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

"کرشن اور بیگم صاحبہ واپس آرہے ہیں بابو جی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس لئے اب میں کام کرنے لگی ہوں۔"

"اوہ۔ کیا تم نے انہیں دیکھا ہے۔" تنویر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے دیوار پر لگی سیڑھی پر چڑھ کر دیکھا تو وہ دونوں مندر کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"پھر۔ تم سے دوبارہ کب ملاقات ہوگی۔" تنویر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"رات کو جب بھی آپ کو فرصت ملے۔" وہ قدرے شوخی سے بولی۔ "میں اپنے دروازے کی کنڈی نہیں لگاؤں گی۔"

"اندھیرے میں کہیں تم ڈر نہ جاؤ۔" تنویر نے خدشہ ظاہر کیا۔ "کیا تم چراغ بجھا کر سوتی ہو۔"

"نہیں۔ لیکن آج بجھادوں گی۔ تاکہ آپ کی بیگم آپ کو میرے کمرے میں نہ دیکھ سکے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن سو مت جانا۔ کیونکہ سونے میں جاگنے پر کہیں تم......"

"میں جاگتی رہوں گی ساری رات۔ آپ کا انتظار کروں گی۔" اس نے تنویر کی طرف پیاسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب پر تنویر کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ چلی گئی اور تنویر آنے والے حسین لمحات کے تصور میں کھو گیا۔ چند لمحوں بعد باہر سے قدموں کی آہٹیں ابھرنے لگیں تو اس نے جلدی سے جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

شازیہ نے اندر آکر تنویر کی طرف دیکھا اور چونکتے ہوئے بولی۔ "اوہ کرسی پر ہی سو گئے۔"

تنویر نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "تم کب آئیں؟"

"ابھی......" وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس دوسری کرسی پر آبیٹھی۔ "کیا اسپرین کھائی تھی؟"

"نہیں۔ بس بیٹھے بیٹھے نیند آگئی تھی۔ مندر دیکھ آئیں؟"

"ہاں۔ لیکن باہر سے ہی دیکھا ہے۔ وہاں سیتا کے باپ شنکر لال سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے آج رات مندر میں پوجا پاٹ دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"رات کو کون سی پوجا پاٹ ہوتی ہے۔" تنویر نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی خاص قسم کی پوجا ہے۔ تم بھی چلنا لطف دے گا۔" شازیہ نے کہا۔

"نہیں شازی، رات کے وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی ہم مسلمان ہیں اور ہمارا وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔ تم اگر محض دلچسپی کی خاطر ان کی پوجا پاٹ دیکھنا چاہتی ہو تو یہ کام صبح کے وقت بھی ہوسکتا ہے۔"

"لیکن اس نے دعوت دی ہے ڈیئر اور میں انکار نہیں کرسکی۔ آخر ہم اس کی بیٹی کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں تمہیں معلوم ہے کہ مجھے پراسرار علوم سے بہت دلچسپی ہے اور کرشن بتا رہا تھا کہ شنکر لال پراسرار علوم کا ماہر ہے۔ اس نے دعوت دے کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ کیونکہ ہم اس کے داماد کے مہمان ہیں۔"

اتنے میں کرشن اندر آیا اور تنویر سے بولا۔ "اب کیسی طبیعت ہے بابو جی۔ کہیں تو حکیم جی سے کوئی دوا دارو لے آؤں۔"

"نہیں یار دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹھو۔" تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کرشن چارپائی پر جا بیٹھا۔ تنویر نے دوبارہ کہا۔ "سنا ہے تمہارے ماموں نے آج رات مندر میں پوجا دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ پوجا کس قسم کی ہوتی ہے۔ کیا سارے گاؤں والے اس میں شرکت کرتے ہیں۔"

"نہیں بابو جی۔ سارے تو نہیں البتہ صرف وہی جاتے ہیں جنہیں ماموں بلاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر

نوجوان مرد وعورتیں ہوتی ہیں۔ پندرہ بیس سے پچیس برس کے عمر والے۔ لیکن یہ پوجا ہفتے میں صرف ایک رات ہوتی ہے۔ اس میں دیوتا مستقبل کی باتیں بتاتے ہیں اور نصیحت دیتے ہیں، آسمان سے بھگوان اپنے اوتار کو اتارتا ہے اور وہ پجاریوں کے من کی آشا پوری کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" تنویر حیران رہ گیا۔ "تم نے بھی ان اوتاروں کو دیکھا ہوگا۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ ماموں نے مجھے کبھی اس پوجا میں نہیں بلایا نہ مجھے اور نہ ہی سیتا کو۔"

"اوہ۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" شازیہ نے حیرت سے پوچھا۔

کرشن نے مسکرا کر کہا۔ "ماموں کہتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے اجازت نہیں کہ مندر کا پروہت اپنے خونی رشتے داروں کو اس پوجا کے لئے بلائے کیونکہ بھگوان کو اقربا پروری پسند نہیں ہے۔"

"ہوں...... تم نے خود بھی وہاں جانے کی کوشش نہیں کی......؟" تنویر نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

"نہیں۔ مندر کے پروہت کی دعوت کے بغیر کوئی اس پوجا میں شرکت نہیں کرسکتا۔ کوئی ایسا کرنے کی جرأت کرے تو دیوتا کا اس پر قہر نازل ہوتا ہے اور وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مرجاتا ہے۔" کرشن نے بتایا۔

"عجیب بات ہے۔" تنویر بڑبڑایا۔ "اس نے تو مجھے بھی دعوت نہیں دی۔ پھر میں اپنی بیگم کے ہمراہ وہاں کیسے جاسکتا ہوں۔"

"تو آپ مت جائیں۔ یا بیگم صاحبہ کو چھوڑ کر واپس آجائیں۔ مجھے کام پر نہ جانا ہوتا تو میں خود مندر چھوڑ آتا انہیں۔"

اس کے کام پر جانے کی بات سن کر تنویر کو یاد آگیا کہ آج رات اپنے کمرے میں سیتا تنہا ہوگی اور اس کا انتظار کرے گی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ کیا وہ شازیہ کو مندر تک چھوڑ کر واپس آجائے گا اور سیتا کی تنہائی دور کرنے میں مصروف ہوجائے گا۔

شام ہوتے ہی آسمان پر بادل گھر آئے اور سردی میں اضافہ ہونے لگا۔ شازیہ اور تنویر دوسرے کمرے میں آبیٹھے تھے۔ جہاں مٹی کے تیل والا لیمپ جلادیا گیا تھا۔ لیمپ کی چمنی کرشن نے خود صاف کی تھی اور اس کی اچھی خاصی روشنی تھی۔ ان کے سونے کے لئے وہاں ایک بڑا پلنگ بچھایا گیا تھا جو کافی کشادہ تھا۔ بستر کی چادر اور ریشمی لحاف نئے معلوم ہوتے ہیں تکیے کے غلاف بھی اجلے تھے۔

چند منٹ بعد کرشن اندر آیا۔ "بابو جی۔ کھانا تیار ہے۔ لے آؤں۔"

"ہاں۔ لے آؤ۔" تنویر کے بجائے شازیہ نے جواب دیا۔

"اتنی جلدی......؟" تنویر بولا۔ "ابھی تو آٹھ بھی نہیں بجے۔"

"ٹھنڈا ہوجائے گا اور بے چاری کو دوبارہ گرم کرنا پڑے گا۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر مندر بھی جانا ہے۔"

"اگر آپ لوگ دیر سے کھانا چاہیں تو سیتا گرم کردے گی۔ میں تو اب کام پر جارہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لے آؤ۔" تنویر بولا۔ "صبح کس وقت آتے ہو۔"

"میں وہاں سے سات بجے چل پڑتا ہوں۔ آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ دن کا اجالا پھیل چکا ہوتا ہے۔ اس وقت۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ دوسرے کمرے سے میز اٹھالایا اور پلنگ کے آگے رکھ دی۔ اتنے میں سیتا کھانا لے آئی۔ اس نے کن انکھیوں سے تنویر کی طرف دیکھتے ہوئے میز پر کھانا سجایا اور چلی گئی۔ شازیہ کی وجہ سے تنویر نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ کرشن پانی کا جگ اور گلاس میز پر رکھ کر چلا گیا اور وہ کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہوکر شازیہ نے سیتا کو آواز دی۔ وہ آئی تو شازیہ نے کہا۔ "یہ برتن لے جاؤ سیتا، کیا کرشن چلا گیا؟"

"ہاں۔ بیگم صاحبہ وہ کھانا کھا کر جاچکا ہے۔" وہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ "چائے بناؤں آپ کے لئے؟"

"رہنے دو، ہم چائے کے عادی نہیں۔ صبح پئیں گے۔" شازیہ نے مسکرا کر کہا۔

اور وہ برتن لے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شازیہ نے تنویر سے کہا۔ "اب چلنا چاہئے۔ نو بجنے والے ہیں۔"

تنویر نے گھڑی پر وقت دیکھا اور اٹھ گیا۔ شازیہ نے اپنی گرم شال کندھوں پر ڈالی اور تنویر کے ساتھ باہر آ گئی۔ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سیتا چارپائی پر لیٹی جاگ رہی تھی۔ شازیہ نے دروازے پر رک کر کہا۔

"سیتا۔ ہم مندر جا رہے ہیں۔ باہر کا دروازہ بند کرلو۔"

"اچھا بیگم صاحب۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا بابو جی بھی مندر میں جائیں گے؟"

"نہیں۔ یہ باہر رہیں گے۔ پوجا ختم ہونے پر ہم دونوں......"

"مگر پوجا تو دو تین گھنٹے جاری رہے گی۔ بیگم صاحب۔" سیتا نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ مجھے وہاں پہنچا کر واپس آ جائیں گے۔" شازیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ آ جاؤں گی۔"

"نہیں شازی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تین گھنٹے کی تو بات ہے۔ میں مندر کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔" تنویر نے جلدی سے کہا۔

"مجھے بھی تم سے یہی توقع ہے ڈیئر۔" شازیہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کرشن کے گھر سے نکل کر وہ مندر کی طرف روانہ ہوئے تو بادلوں کی اوٹ سے چودہویں شب کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ آبادی سے نکلے تو چند افراد مندر کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ چند لمحوں بعد چاند پھر بادلوں میں چھپ گیا۔ لیکن اندھیرا اگیا نہیں تھا۔

"تنویر سردی کافی ہے۔" شازیہ نے اپنی شال اچھی طرح لپیٹے ہوئے کہا۔ "یوں کرنا کہ تم مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آ جانا۔ پھر دو ڈھائی گھنٹے بعد مجھے لینے آ جانا۔ اتنی دیر سردی میں وہاں کھڑے رہنا درست نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو یونہی سہی۔ میں تو حکم کا غلام ہوں۔" تنویر نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"دونوں مندر کے سامنے جب پہنچے تو مندر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شازیہ تنویر کو خدا حافظ کہہ کر مندر میں چلی گئی۔

تنویر واپس گاؤں کی طرف چلا لیکن ابھی پندرہ بیس قدم ہی چلا تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش ہونے لگی۔ تنویر تیزی سے قدم اٹھانے لگا تاکہ بارش تیز ہونے سے پہلے کرشن کے گھر پہنچ جائے۔ جہاں سیتا اس کا بے تابی سے انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن بارش میں شدت آ گئی اور اس کا لباس بری طرح بھیگ گیا۔ کچے راستے پر کیچڑ ہوتا جا رہا تھا اور پھسلنے کا اندیشہ تھا اس لئے وہ احتیاط سے قدم اٹھانے لگا۔ اسی لمحے بجلی کڑکی اور بارش میں مزید تیزی آنے لگی۔

تنویر کو مجبوراً رکنا پڑا۔ کچے راستے پر مٹی کے سبب پانی جمع ہونے لگا۔ اس کا لباس پانی سے تر ہو چکا تھا۔ اور وہ کافی سردی محسوس کر رہا تھا۔ بارش کی براہ راست بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بارش رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ گہرے سیاہ بادلوں کے سبب کافی تاریکی پھیل گئی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف گنجان درختوں کی وجہ سے وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ چند فٹ تک بھی دیکھنا دشوار تھا۔

"بابو جی، آپ نے کہاں جانا ہے۔" اچانک ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

اور تنویر بے ساختہ اچھل پڑا۔ اس نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا تو دوسرے درخت کے نیچے ایک انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر تنویر کے ذہن پر خوف سوار ہوگیا۔ نجانے وہ عورت وہاں کب پہنچی تھی۔

"کک۔ کون ہو تم؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"ایک کنواری بیوہ۔" اس ہیولے کی طرف سے آواز آئی۔

"کنواری بیوہ۔" وہ حیرت سے بولی۔ "کیا مطلب کنواری کیسے بیوہ ہوسکتی ہے؟"

"ایسی بیوہ جس کا شوہر شادی سے پہلے مرجائے وہ عورت بننے سے پہلے بیوہ ہوجائے۔"

"عجیب بات ہے۔" تنویر بڑبڑایا۔ "اب کیا تم بوڑھی ہوچکی ہو؟"

"نہیں بابو۔ ابھی تو پندرہ سال بھی پورے نہیں ہوئے۔" اس کی آواز کچھ قریب آگئی۔

"لیکن تم بارش میں یہاں کیا کررہی ہو؟" اس نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"مندر پوجا کے لئے جارہی تھی کہ بارش نے آلیا۔" اس نے جواب میں ہنس کر کہا۔

اس کی ہنسی بہت مترنم تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ستار کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ تنویر کو وہ ہنسی بہت پیاری لگی۔

"کہو تو میں مندر چھوڑ آؤں۔" تنویر نے پیشکش کی۔

"اب وہاں جانا بیکار ہے۔ دروازہ بند ہوچکا ہوگا۔" وہ کچھ اور قریب آگئی۔ "سردی بھی لگ رہی ہے۔ شاید بخار چڑھ رہا ہے مجھے۔ کیا تمہیں نبض دیکھنا آتا ہے بابو؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں....." تنویر نے تیزی سے کہا۔

"ذرا دیکھنا میرا ہاتھ۔ بخار ہے یا نہیں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ "دیکھتی ہوں تم کتنے بڑے حکیم جی ہو۔"

اسی لمحے آسمان پر بجلی چمکی اور اس کی چمک میں تنویر کو ایک لمحے کے لئے وہ نظر آگئی۔ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ لڑکی سرتاپا قیامت تھی۔

"بابو ہاتھ دیکھونا۔" تاریکی میں اس حسن کے مجسمے کی دلکش آواز ابھری۔

اور تنویر نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑلی مگر اسے چھوتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پورے بدن میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔ لڑکی کا ہاتھ بے حد ملائم اور گداز مگر برف کی طرح یخ بستہ تھا۔

"نہیں بخار تو نہیں ہے۔" اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "حرارت بالکل نہیں ہے۔"

"مگر میرا جسم تو جل رہا ہے بابو۔ سردی بھی لگ رہی ہے۔" وہ ہاتھ چھڑائے بغیر بولی۔ "میں گھر کیسے جاسکوں گی؟"

"تمہارا نام کیا ہے۔ گاؤں میں کس طرف تمہارا گھر ہے؟" تنویر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"نام تو میرا رانی ہے لیکن گھر گاؤں میں نہیں ادھر مرگھٹ کی طرف ہے۔" وہ بولی۔

"رانی۔ بہت پیارا نام ہے۔" وہ بولا تو جذبات سے اس کا حلق خشک ہورہا تھا۔ "وہاں تمہارے ماں باپ ہیں....."

"نہیں۔ وہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ کنواری بیوہ کو گاؤں سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ بالکل تنہا، کیا تم مجھے میرے گھر پہنچا سکتے ہو بابو؟"

رانی کی بات سن کر تنویر کو بے حد خوشی ہوئی، وہ تنہا رہتی تھی اور اسے پیشکش کررہی تھی۔ اس صورت میں وہ کیسے انکار کرسکتا تھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "لیکن میں راستہ نہیں جانتا..... بارش بھی ہورہی ہے۔"

"بارش نہ جانے کب رکے۔ تم میرا ہاتھ پکڑے رہو۔ آؤ۔" رانی نے کہا۔

اور اسی راستے کے دوسری جانب بڑھی۔ تنویر کے قدم بھی خودبخود اٹھ گئے۔

وہ ایک بلند ٹیلے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ جو کافی پھیلا ہوا تھا اور اس میں کسی غار کے دہانے کی طرح ایک بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ رانی اس غار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تنویر کو عجیب سا محسوس ہوا اور اس نے قدم روک لئے۔

"کیا تم اس غار میں رہتی ہو؟" اس نے رانی کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"مجبوری ہے۔" چاندنی کی روشنی میں اس کے خوب صورت لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دی۔ "لیکن اندر سے یہ بہت آرام دہ ہے۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں....." تنویر کو ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔

"کیوں بابو..... کیا میرا گھر نہیں دیکھو گے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کیا مجھے خدمت کا موقع نہیں دو گے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے تنویر کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس سے نگاہیں ملتے ہی تنویر کے ذہن پر عجیب سا خمار طاری ہونے لگا۔ لیکن اسی لمحے چاند پھر بادلوں میں چھپ گیا۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "آؤ بابو۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔"

تنویر انکار نہ کرسکا وہ اس کے ساتھ نیم تاریک غار میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک اس کے نتھنوں سے عجیب سی بدبو ٹکرائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہاں گوشت جلنے کی سڑانڈ پھیلی ہوئی ہو۔ غار میں باہر کی نسبت زیادہ تاریکی تھی۔ وہ دو قدم چل کر رک گیا۔ سڑانڈ اور بدبو سے اس کا ذہن پراگندہ ہونے لگا۔

"بابو۔" وہ تاریکی میں اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "رک کیوں گئے، آگے قدم بڑھاؤ نا۔" اور اسی لمحے غار ایک خوفناک چیخ سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

شازیہ کے اندر داخل ہوتے ہی مندر کا دروازہ بند ہوگیا۔ شازیہ نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے کے پاس ایک آدمی کھڑا تھا۔ حلیئے سے وہ مندر کا کوئی پجاری دکھائی دیتا تھا۔ اس نے شازیہ سے کہا۔ "شازیہ دیوی۔ میرے ساتھ آؤ۔ پنڈت شنکر لال تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے ابھی تک پوجا پاٹ شروع نہیں ہوئی۔"

شازیہ اس پجاری کے پیچھے چل دی۔ وہ ایک راہداری میں داخل ہوا اور بائیں جانب واقع ایک دروازے پر رک گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور شازیہ سے بولا۔ "اندر چلی جاؤ۔ پنڈت شنکر کے پاس پہنچ جاؤ گی۔"

دروازے کی دوسری طرف نیم تاریکی تھی۔ شازیہ نے اندر قدم رکھا لیکن اس کا پاؤں فرش پر پڑنے کے بجائے خلا میں پڑا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سر کے بل اس خلا میں گرتی چلی گئی۔ وہ گھپ تاریک خلا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چلائی اور پھر اس کے ہوش و حواس تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

پھر اسے ہوش آیا تو اس کے پاس روشنی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ تب اس نے سر کو حرکت دی اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک کمرے کے فرش پر دراز تھی۔ ایک طرف چراغ جل رہا تھا۔ چراغ کے سامنے والی دیوار کے پاس ایک بھیانک شکل والی بڑی مورتی کھڑی تھی۔ جس کے کئی ہاتھ تھے۔ اسے دیکھ کر شازیہ خوف سے چیخ پڑی۔

اسی لمحے بائیں جانب سے آواز آئی۔ "گھبراؤ مت شازیہ یہ کالی دیوی ہے۔"

شازیہ نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا اور اچھل پڑی۔ اس طرف دروازے میں پنڈت شنکر لال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوفناک آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔

"میں۔ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے پنڈت جی۔" وہ اٹھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"تم مندر میں ہو شازیہ۔" وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "مگر پجاری کی غلطی سے تہہ خانے میں گرگئی تھیں۔"

"مجھے یہاں سے نکالو۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" شازیہ نے تیزی سے کہا۔

"کیا ہماری پوجا پاٹ نہیں دیکھوگی۔" شنکر لال نے قریب آکر پوچھا۔

"نہیں۔ میں واپس جاؤں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں ہوس ناکی محسوس کرکے لرزتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن واپسی کے لئے کالی دیوی کی اجازت ضروری ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دیکھو تو کالی دیوی کی نگاہیں کیا کہہ رہی ہیں۔ اسی سے اجازت مانگو۔"

شازیہ نے کالی دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کالی دیوی کی پتھریلی آنکھوں میں ایک مسحور کن چمک تھی۔ جو اس کے ذہن پر عجیب سا خمار طاری کررہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے نگاہیں نہ ہٹا سکی۔ اس کی سانسیں بہکنے

لگیں اور جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔

چند لمحوں بعد اسے اپنے جسم پر ایک ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اچانک اس کے ذہن کو زوردار جھٹکا لگا اور اس کے ذہن پر چھایا ہوا خمار ایک دم صاف ہوگیا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں لوٹ آئیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے یکدم دونوں ہاتھوں سے خود پر جھکے ہوئے وجود کو دھکا دیا اور مخالف سمت میں دوڑ پڑی۔ دوڑتے ہوئے اس نے نجانے کتنا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک دم ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری پھر وہ تیزی سے اٹھی اور ٹھٹھک کر رک گئی۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے مرگھٹ کے بلند ٹیلوں کے درمیان کھڑی تھی۔

مرگھٹ کی فضا میں جلے ہوئے گوشت اور ہڈیوں کی سڑانڈ پھیلی ہوئی تھی اور چاند کی روشنی میں اس کے سامنے ایک بڑھیا کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا کے چہرے پر جھریاں تھیں اور اس کے کھلے بال گھٹنوں تک پہنچ رہے تھے۔

"لڑکی..... تم کون ہو اور کہاں جانا ہے؟" بڑھیا نے سوال کیا مگر اس کے لہجے میں عجیب سی ٹھنڈک تھی۔

"میں، میں شازیہ ہوں۔ کرشن کمار کی مہمان۔ مجھے اس کے گھر جانا ہے۔" شازیہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"اوہ۔ تم کرشن کمار کی مہمان ہو۔ کمال ہے۔" بڑھیا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ مگر تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟" شازیہ نے تیزی سے پوچھا۔

"میں کرشن کی خالہ ہوں۔ اپنے پتی کے مرنے کے بعد سے یہیں رہتی ہوں۔" بڑھیا نے ہنس کر کہا۔

اس کی ہنسی سن کر شازیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی عجیب غیر مرئی ہنسی تھی۔

"آؤ۔ میں تمہیں گاؤں میں پہنچا دیتی ہوں۔" بڑھیا نے دوبارہ کہا۔

اور پلٹ کر چل دی۔ شازیہ نے اس کے پیچھے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ "ہمارا حصہ مت بھولنا۔"

شازیہ نے پلٹ کر دیکھا اور خوف کی شدت سے اس کے پاؤں زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ پیچھے کوئی نہ تھا۔ لیکن بائیں جانب ٹیلے کی ڈھلان پر ایک انسانی کھوپڑی حرکت کر رہی تھی۔ یقیناً اسی سے آواز بلند ہوئی تھی۔ شازیہ کا خوف سے بدن لرزنے لگا۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔

"خالہ..... خالہ تم کہاں ہو.....؟" شازیہ خوفزدہ انداز میں چلائی۔

لیکن جواب میں کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو دائیں جانب کے ٹیلے پر تین عورتیں بیٹھی دکھائی دیں۔

"تم کسے پکار رہی ہو؟" ان میں سے ایک نے شازیہ کو مخاطب کیا۔

"کرشن کمار کی خالہ کو۔ وہ کہاں چلی گئی؟" شازیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا جواب سن کر وہ تینوں ہنسنے لگیں۔ پھر ان میں سے ایک بولی۔ "ابھی آجائے گی۔ اتنی دیر ہم سے باتیں کرو۔"

"ت۔ تم کون ہو؟" شازیہ کو ان سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"ہم۔" وہ عورت ہنس کر بولی۔ "ہم وہی ہیں جن کی موت کا تماشا دیکھنے تم یہاں آئی ہو۔"

"م۔ مگر۔ تم تو زندہ ہو۔" شازیہ خوف سے ہکلائی۔

"ہم زندہ ہیں۔" اس نے حیرت سے اپنی ساتھی عورتوں کی طرف دیکھا۔

اور وہ سب یکدم غضبناک نظر آنے لگیں۔ ایک نے شازیہ کو گھورتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ۔ اسے بتائیں کہ ہم کس حد تک زندہ ہیں۔ اس نے ہمیں زندہ کہہ کر ہماری قربانی کی توہین کی ہے۔"

وہ سب اٹھیں اور خطرناک تیوروں کے ساتھ ٹیلے سے اترنے لگیں۔ شازیہ کا خوف سے رگوں میں خون جمنے لگا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ ستی ہونے والی عورتوں کی روحیں

ہیں۔ وہ ٹیلے سے اتر کر شازیہ کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ شازیہ خوف سے چلائی اور اس نے دوڑ لگا دی۔ عقب سے ان عورتوں کے قہقہے سنائی دیئے۔ شازیہ بدحواس ہو کر دوڑتی ہوئی چلا رہی تھی۔

''بچاؤ۔ بچاؤ۔'' اچانک اس نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل زمین پر آ گری۔ اس نے جلدی سے سنبھل کر پیچھے دیکھا تو وہ ایک جلی ہوئی انسانی کھوپڑی تھی۔ جس سے ٹکرا کر وہ گری تھی۔ کھوپڑی دیکھ کر وہ اور بھی دہشت زدہ ہو گئی پھر اس نے بدروحوں کی طرف دیکھا تو وہ بدروحیں یا عورتیں تیزی سے اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ شازیہ نے خوف سے چیخ ماری اور پھر اٹھ کر دوڑ پڑی۔

''رک جاؤ لڑکی۔ تم بچ کر اس مرگھٹ سے باہر نہیں جا سکو گی۔'' عقب سے ایک عورت کی غراہٹ آمیز آواز ابھری۔ شازیہ اس کی دھمکی سن کر اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ مرگھٹ کی بدروحیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ بھیانک چیخ سن کر تنویر بے ساختہ اچھل پڑا اور رانی اس کی آغوش سے نکل گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر غار کے دوسرے حصے کی طرف دیکھنے لگا لیکن گہری تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ خوفناک چیخ اسی سمت سے آئی تھی اور اس کے انداز سے کے مطابق کسی عورت کی ہی تھی۔

''را۔ رانی۔ تم کہاں ہو؟'' اس نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں رانی کو پکارا۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ غار میں مکمل سناٹا طاری تھا اور رانی کی سانسیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ شاید وہ چیخ سے ڈر کر بھاگ گئی تھی۔ تنویر نے ڈرتے ڈرتے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ چلائے کہ شاید رانی وہیں قریب ہی ہو۔ لیکن رانی کے بجائے اس کے ہاتھ غار کی دیواروں سے ٹکرائے اور اسے ان میں کوئی سخت چیز دبی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اس سخت چیز پر ہاتھ پھیرا اور خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سخت چیز بناوٹ کے لحاظ سے کوئی خشک انسانی کھوپڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بوکھلا کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ اسے فوراً غار سے نکل جانا چاہئے۔

چنانچہ وہ اندازے سے اس طرف پلٹا جدھر سے غار میں داخل ہوا تھا۔ باہر بھی اندر کی طرح تاریکی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگا مگر دس بارہ قدم چل کر بھی وہ کھلے آسمان کے نیچے نہ پہنچا تو اسے خوف کا ایک اور جھٹکا لگا کہ شاید وہ غار کے دہانے کی طرف جانے کے بجائے غار کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا ہے اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ رانی کے ساتھ غار میں داخل ہو کر دو چار قدم ہی چلا تھا اور رک گیا تھا۔ لیکن اب دس بارہ قدم چلنے کے باوجود وہ غار سے نہیں نکل سکا تا۔ یقیناً وہ غلط سمت میں جا رہا تھا۔

یہ خیال آتے ہی وہ رکا اور پلٹ کر چلنے لگا۔ اس طرف بیس پچیس قدم چلنے کے باوجود وہ غار کے دہانے تک نہ پہنچ سکا۔ پھر بھی وہ رکنے کے بجائے چلتا رہا۔ ابھی وہ چالیس پچاس قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے کچھ ایسی آواز آئی۔ جیسے کچھ لوگ اس کے پیچھے چل رہے ہوں لیکن اس کے رکتے ہی پیچھے سے آنے والی قدموں کی آہٹیں بھی رک گئیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چہرہ گھما کر پیچھے دیکھا تو اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔

وہ خوفزدہ ہو کر دوبارہ آگے بڑھنے لگا، تب عقب سے قدموں کی آہٹیں بھی دوبارہ سنائی دینے لگیں۔ لیکن اب ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو عورتیں آپس میں سرگوشی کے انداز میں باتیں کرتی آ رہی ہوں۔ ان کے الفاظ تنویر کی سمجھ میں نہ آ سکے کیونکہ وہ ہندی زبان میں باتیں کر رہی تھیں اور آواز بھی بہت ہلکی تھی۔ تنویر نے خوف سے لرزتے ہوئے اپنی رفتار بڑھا دی۔ سردی کے باوجود خوف سے اس کا بدن پسینہ پسینہ ہوتا جا رہا تھا اور پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

وہ ایک ہاتھ سے غار کی دیوار کو چھوتا ہوا چل رہا تھا۔ مزید دس بارہ قدم چلنے کے بعد غار بائیں جانب مڑ گیا۔ وہ بھی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی طرف مڑا تو ادھر روشنی دیکھ کر اچھل پڑا۔ موڑ کے دوسری جانب غار کسی گول کمرے کی طرح وسیع و عریض تھا۔ جس میں عجیب سی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس کا کوئی ذریعہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہاں وسط

میں ایک سفید چادر فرش پر بچھی ہوئی تھی جس پر دو سرخ کشمیری سیب اور ناشپاتی رکھی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رانی غار کے اسی حصے میں رہتی ہے وہ سوچنے لگا کہ آگے بڑھے یا واپس چل دے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا ایک سرد سی آواز گونجی۔ ”آگے آجاؤ بابو، اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔“

وہ آواز رانی کی ہی تھی۔ تنویر نے آواز کی سمت دیکھا۔ غار کے اس حصے میں تاریکی تھی اور اس میں دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر تنویر خوف سے جھرجھری لے کر رہ گیا۔ ان آنکھوں سے خونخواری ٹپک رہی تھی۔ نہ جانے وہ کس کی آنکھیں تھیں۔ کم از کم وہ رانی کی خوب صورت غزالی آنکھیں ہرگز نہ تھیں۔ اس نے صرف ایک لمحہ ان آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ اسے دوبارہ ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ خوف سے خشک ہوتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”رانی تم کہاں ہو۔ سامنے آؤ۔“

جواب میں غار کے تاریک حصے سے قدموں کی آہٹیں ابھرنے لگیں۔ اس نے بے اختیار دوبارہ اس طرف دیکھا۔ خونخوار آنکھیں حرکت کر رہی تھیں اور آہٹیں قریب آتی جارہی تھیں۔ پھر چند لمحوں بعد اس طرف سے آنے والا روشنی میں آیا اور اسے دیکھ کر خوف سے تنویر کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔

☆......☆......☆

مرگھٹ کی بدروحوں سے بچنے کے لئے شازیہ بے لگام گھوڑے کی طرح بگٹٹ دوڑ رہی تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر طاری رہی۔ پھر اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ نرم گیلی زمین کے بجائے پختہ فرش پر پڑی تھیں۔ اسے بدروحوں کا خیال آیا اور وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی لیکن ماحول کا جائزہ لیتے ہی وہ حیران رہ گئی۔

بدروحیں غائب تھیں اور وہ کسی عمارت کی راہداری میں موجود تھی۔ وہ راہداری کافی طویل تھی اور اس کے اختتام پر ایک دیوار تھی جس میں بنے طاقچے میں ایک چراغ جل رہا تھا۔ دائیں بائیں کئی کمرے تھے جن کے دروازے بند نظر آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا چوبی دروازہ نظر آیا جو بند تھا۔ وہ خوفزدہ ذہن کے ساتھ سوچنے لگی کہ وہ کس عمارت میں ہے اور یہ عمارت کہاں واقع ہے؟ وہ بدحواسی کے عالم میں مرگھٹ سے بھاگی تھی اور شاید اس عمارت میں داخل ہوتے ہی گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

راہداری میں گھمبیر سناٹا طاری تھا اور کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن چراغ کی موجودگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ عمارت ویران نہیں تھی اور اس کے علاوہ بھی کوئی عمارت میں موجود تھا۔ وہ اٹھی اور راہداری کے بند دروازے کی طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ شاید دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر زور سے دو تین ہاتھ مارے اور انتظار کرنے لگی لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ چند لمحوں بعد اس نے مایوس ہوکر راہداری کے دوسرے حصے کی طرف دیکھا اور اس طرف بڑھنے لگی۔ پرانی طرز کے چوبی دروازے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ عمارت قدیم زمانے کی تھی۔

راہداری کے وسط میں پہنچ کر وہ رکی اور بلند آواز سے بولی۔ ”کوئی ہے؟“

”تم کون ہو؟“ جواب میں آخری کمرے کی طرف سے ایک آواز ابھری۔ لہجے میں نرمی تھی۔ بولنے والا کوئی مرد تھا۔

”میں گاؤں میں مہمان ہوں۔ بھٹک کر ادھر آگئی تھی مگر اب باہر کا دروازہ بند ہے۔“ شازیہ نے بتایا۔

”یہاں آجاؤ لڑکی۔“ آخری کمرے سے آواز آئی۔ ”میں ذرا مصروف ہوں۔“

شازیہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ پھر آخری کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جلد ہی وہ اس کمرے کے پاس پہنچ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ایک دو لمحوں بعد اس نے

دوبارہ دستک دی۔

"اندر آجاؤ لڑکی۔ دروازہ بند نہیں ہے۔" اس بار اندر سے وہی مردانہ آواز ابھری۔

شازیہ نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تاریکی تھی اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ اسی لمحے اندر سے آواز ابھری۔ "اندر آجاؤ۔ جھجکو مت۔ میں ابھی چراغ جلاتا ہوں۔"

شازیہ نے ڈرتے ڈرتے تاریک کمرے میں قدم رکھا۔ اندر داخل ہو کر وہ رک گئی۔ کمرے میں کسی کی گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ شازیہ روشنی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن اچانک اسے عقب میں ہلکی سی چرچراہٹ سنائی دی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ اچھل پڑی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف جھپٹی۔ ٹھیک اسی لمحے کمرے میں چراغ کی روشنی پھیل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

کمرے کی سامنے والی دیوار کے ایک طاقچے میں چراغ جل رہا تھا۔ اس نے روشنی میں ادھر ادھر دیکھا۔ بائیں جانب کے کونے میں ایک چارپائی پر کوئی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ اس کے سوا وہاں کوئی آدمی تھا نہ کسی قسم کا سامان۔ سونے والے نے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ شازیہ کو حیرت ہوئی کہ وہ آدمی کہاں ہے جس نے اسے اندر آنے کو کہا تھا اور چراغ کس نے جلایا۔ اس نے سونے والے کو مخاطب کیا۔ "تم کون ہو اور چراغ کس نے جلایا؟"

جواب میں سونے والے نے اپنی چادر اتار پھینکی اور اسے دیکھ کر شازیہ کی خوف سے چیخ نکل گئی۔

☆......☆......☆

وہ سفید لمبے بالوں والی ایک خوفناک بڑھیا تھی جس کا چہرہ انتہائی بھیانک تھا۔ دونوں ہونٹ کٹے ہوئے تھے جن سے لمبے لمبے دانت جھانک رہے تھے۔ جسم انتہائی کمزور اور دبلا پتلا تھا۔ آنکھوں میں خون کی سرخی تھی۔ لباس سے محروم اس کا بدن توے کے مانند سیاہ تھا اور پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ کوئی چڑیل تھی۔ تنویر کا دہشت سے برا حال تھا۔ کالی چڑیل اس کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اپنی خوفناک آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

تنویر کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن حلق خشک تھا، اس لئے آواز نہ نکل سکی۔ کالی چڑیل اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹتا جارہا تھا مگر پھر اچانک پراسرار روشنی غائب ہوگئی اور وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ اندھیرا ہوتے ہی تنویر کے ذہن میں ایک دم خیال آیا کہ اسے فوراً اپنی جگہ سے ایک طرف ہٹ جانا چاہئے تاکہ چڑیل کی زد میں نہ آسکے۔

چنانچہ وہ تیزی سے بائیں جانب ہٹتا چلا گیا۔ تین چار قدم چل کر وہ رک گیا اور چڑیل کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن تاریکی میں وہ نظر نہ آئی۔ اس کی خونخوار آنکھیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ توجہ سے اس کے پاؤں کی چاپ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے لیکن کوئی آہٹ نہ سنائی دی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹھیک اسی لمحے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دہشت کے مارے گھگیانے لگا۔

"کک...... کون......" اس کے حلق سے بمشکل نکل سکا۔

"میں رانی ہوں بابو جی......" اس کے کان کے پاس ایک ہلکی سی آواز ابھری۔

"ر...... را...... رانی۔" وہ خوف سے ہکلایا۔ "کون رانی...... تم تو چڑیل ہو۔"

"واہ بابو۔ اتنی جلدی بھول گئے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتی ہوئی بولی۔ "کیا چڑیل اور مجھ میں فرق نہیں ہے۔"

ہاتھ چھونے پر تنویر کے ذہن سے خوف کی چادر سرکنے لگی۔ چند منٹ بعد اچانک روشنی پھیل گئی اور تنویر بے اختیار اچھل پڑا۔

☆......☆......☆

چادر اترنے پر سونے والے کو دیکھ کر شازیہ کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ بے اختیار پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ وہ دہشت زدہ نگاہوں سے چارپائی کی طرف

دیکھ رہی تھی۔ جس پر زندہ انسان کے بجائے ایک انسانی ڈھانچہ دراز تھا۔ گوشت پوست سے محروم اس ڈھانچے کی استخوانی کھوپڑی میں صرف ایک چیز زندہ تھی اور وہ تھی اس کی آنکھیں، خوفناک اور خونخوار آنکھیں جن میں بھیڑیے کی سی چمک تھی اور وہ آنکھیں شازیہ کو گھور رہی تھیں۔

خوف کی شدت سے شازیہ کا حلق خشک ہوگیا اور جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مردہ ڈھانچے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک دو لمحے گزر گئے اور ڈھانچے نے کوئی حرکت نہ کی۔ شازیہ کے ذہن میں آیا کہ اسے کمرے سے نکل جانا چاہئے۔ اس نے سر گھما کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا جو اس کے اندر آتے ہی بند ہوگیا تھا۔ پھر اس نے ڈھانچے کے سینے کی ہڈیوں پر نگاہیں جمادیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف سیر کرنے لگی۔ ڈھانچے کی خونخوار آنکھوں کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

ڈھانچہ بے حس وحرکت پڑا تھا۔ وہ انچ انچ سرکتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی۔ پھر اس نے ایک دم دروازے کی طرف رخ کرکے دروازے میں لگا لکڑی کا ہینڈل پکڑ کر جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ دروازہ نہ کھلنے پر وہ اور بھی گھبرا گئی اور بار بار کوشش کرنے لگی لیکن ناکام رہی۔

"شریمتی جی۔ تم سے دروازہ نہیں کھلے گا۔" اچانک چارپائی کی طرف سے آواز آئی۔

شازیہ نے پلٹ کر چارپائی کی طرف دیکھا اور خوف سے اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔ وہ ڈھانچہ چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس انداز میں کہ اس کے پاؤں فرش پر تھے اور نگاہیں شازیہ پر مرکوز تھیں۔

"م۔مم۔میں۔ باہر جانا چاہتی ہوں۔" شازیہ خوف سے ہکلائی۔

"جانا تھا تو آئی کیوں تھیں؟" ڈھانچے کے منہ سے آواز خارج ہوئی۔ "اب تم صبح سے پہلے نہیں جاسکتیں۔"

"کک۔ کیوں۔" وہ دہشت زدہ لہجے میں بولی۔

"پنڈت شنکر لال کی یہی مرضی ہے۔" ڈھانچے کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وہ۔ وہ تو مندر میں تھا۔ تمہارا اس سے کیا واسطہ۔ مجھے جانے دو۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ مندر میں ہے تو تم کون سا مندر سے باہر ہو۔ تم اس وقت مندر میں ہی ہو۔" ڈھانچے نے کہا۔ "وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر یہاں آئے گا۔ میں اس کا داس ہوں۔"

یہ سن کر شازیہ کے حواس گم ہونے لگے کہ وہ مندر میں ہی تھی۔ بدروحوں سے بچنے کے لئے وہ نادانستگی میں دوبارہ اسی مندر میں آ پھنسی تھی جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ اسے کرشن کمار کی بات یاد آئی کہ پنڈت شنکر لال پراسرار علوم کا ماہر ہے۔ یقیناً وہ بہت بڑا جادوگر تھا جس نے اپنے جادو سے مردوں کو اپنے تابع کر رکھا تھا۔ وہ خوفزدہ ذہن سے سوچنے لگی کہ وہاں سے کیسے نکلے۔ دروازہ باہر سے بند معلوم ہوتا تھا جسے وہ کھولنے میں ناکام رہی تھی۔ یقیناً ڈھانچے کو بھی معلوم تھا کہ اس سے دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس لئے اس نے شازیہ کو دروازے تک جانے سے نہیں روکا تھا۔

"وہ۔ وہ کیا چاہتا ہے مجھ سے۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں ڈھانچے سے پوچھا۔

"بدلہ۔ انتقام۔" ڈھانچے نے کہا۔ "وہ تم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"کک۔ کس بات کا؟" وہ چونکتے ہوئے ہکلائی۔

"تمہارے شوہر کا...... اپنی عزت کا۔ تمہارے شوہر نے اس کی بیٹی سیتا کے جسم کو چھوا تھا۔ اسے گناہ کی طرف راغب کیا تھا اور لذت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سیتا کی حفاظت پر مامور غیبی طاقت نے پنڈت شنکر لال کو خبر کردی تھی۔" ڈھانچے کی بات سن کر شازیہ سناٹے میں رہ گئی۔ اسے تنویر سے ایسی حرکت کی توقع نہ تھی۔

ڈھانچا چارپائی پر کسی زندہ وجود کے مانند بیٹھا خوفناک نگاہوں سے شازیہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور شازیہ فرش پر نگاہیں جمائے تنویر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے

تنویر کسی دوسری عورت کی خواہش کرسکتا ہے۔ تنویر نے طویل نوانیئر کے بعد اسے شادی کی تھی اور شادی سے پہلے اس کے سوا تنویر کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔ اس نے شادی سے پہلے تو پیریڈ میں اپنے طور پر پوری تحقیق کرلی تھی کہ تنویر کے کسی دوسری لڑکی سے تعلقات نہیں تھے۔ خود تنویر نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اس کی پہلی اور آخری محبت ہے اور اگر وہ اس سے شادی کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو ساری عمر کنوارہ رہے گا۔

چنانچہ اب ڈھانچے ہے سیتا اور تنویر کا چکر سن کر اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ تنویر نے اس کی غیر موجودگی میں سیتا سے چھیڑ چھاڑ کی ہوگی۔ سیتا اس کی میزبان کی بیوی اور ہندو تھی۔ پھر سماجی اور مالی اعتبار سے بھی وہ اس نا قابل نہیں تھی کہ تنویر اس پر توجہ دیتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شام سے پہلے صرف ایک گھنٹے کے لئے اس نے تنویر کو سیتا کے پاس چھوڑا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں تنویر کا سیتا سے ناجائز تعلقات قائم ہوجانا بھی ممکن بات نہ تھی جبکہ ان کے گھر آئے انہیں چند ہی گھنٹے گزرے تھے۔ یہ دلائل تنویر کو بے گناہ ثابت کرتے تھے۔

چند منٹ تک شازیہ اسی سوچ میں الجھی رہی۔ پھر ایک دم اسے یاد آیا کہ شنکر لال اس سے تنویر کی زیادتی کا انتقام لینا چاہتا ہے اور وہ کسی بھی لمحے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ شنکر لال کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور بے اختیار اچھل پڑی۔ وہاں نہ ڈھانچا تھا اور نہ اس کی چارپائی۔ وہ جگہ خالی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سوچنے کے دوران میں نہ جانے وہ چارپائی سمیت کہاں غائب ہوگیا تھا۔

اس نے سوچا کہ موقع اچھا ہے، دروازہ کھولنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچنے لگی مگر اس بار فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ باہر راہداری میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راہداری کا بیرونی دروازہ کس سمت میں ہے۔ پھر بھی وہ باہر نکل کر دبے پاؤں ایک طرف چلنے لگی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن راہداری شیطان کی آنت کی مانند بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ سو ڈیڑھ سو قدم کا فاصلہ طے کرچکی تھی۔ لیکن نہ راہداری کا اختتام آیا اور نہ ہی بیرونی دروازہ۔

مزید دس بارہ قدم چلنے کے بعد اسے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا کہ اس سمت میں کچھ لوگ بھجن گانے میں مصروف ہوں۔ اس نے ایک لمحہ رک کر غور سے وہ آوازیں سنیں اور دوبارہ آگے بڑھنے لگی۔ پوجا کرنے والوں کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ پھر اچانک اس کا بڑھا ہوا ہاتھ سامنے کسی درواز سے ٹکرایا اور وہ رک گئی۔ بھجن گانے کی آواز اسی دروازے کے عقب سے آرہی تھی۔ یقیناً وہ مندر کا پوجا پاٹ والا حصہ تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے خیال آیا کہ کیوں نہ پوجا کرنے والوں میں پہنچ جائے۔ پجاریوں کی موجودگی میں شنکر لال اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا اور وہ پوجا ختم ہونے پر گاؤں والوں کے ساتھ گاؤں پہنچ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن دستک کی آواز بھجن کی آواز میں دب گئی۔ تب اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور دروازہ کھلتا چلا گیا اندر بہت بڑا ہال تھا جس میں بیس پچیس نوجوان مرد اور لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ سب ایک بت کے سامنے سر جھکائے بھجن گا رہے تھے۔ سب سے آگے شنکر لال کھڑا تھا۔

شازیہ ہال میں داخل ہو کر دروازے کے پاس ہی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اب اسے قدرے اطمینان تھا کہ یہاں وہ محفوظ ہے اور پوجا ختم ہونے کے بعد گاؤں والوں کے ساتھ مندر سے نکل جائے گی لیکن چند لمحوں بعد اچانک شنکر لال نے پلٹ کر اس کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہاں گہری تاریکی اور سناٹا پھیلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

فرش پر پڑا نسوانی وجود رانی کا ہی تھا لیکن وہ زندگی کی حرارت سے محروم تھی۔ لباس کے بغیر اس کا سفید بدن بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے نور دکھائی دے رہی تھیں۔ یقیناً وہ مرچکی تھی۔ تنویر چند لمحوں تک پھٹی

پھٹی آنکھوں سے رانی کی لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے خیال آیا کہ اس کی نبض چیک کرنی چاہئے۔ ہوسکتا ہے بارش میں کافی دیر بھیگتے رہنے کے بعد اس کی یہ حالت ہوئی ہو۔ وہ آہستہ قدموں سے رانی کی لاش کے پاس پہنچا اور فرش پر بیٹھ کر اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے لئے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ایک دم وہاں تاریکی پھیل گئی اور تنویر نے گھبرا کر ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔

"اوہ۔ بابو۔ تم آ گئے۔" اچانک رانی کی آواز بلند ہوئی۔

"کک۔ کیا۔ کیا تم زندہ ہو رانی۔" تنویر خوف سے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں میرے ساجن۔" اندھیرے میں رانی نے اس کے سینے سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انتظار میں سو گئی تھی۔"

اچانک غار میں ایک خوفناک غراہٹ گونجی اور تنویر اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے غراہٹ کی سمت دیکھا تو خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ذہن سے جذبات کا سارا نشہ دور ہوتا چلا گیا۔ غار میں پراسرار روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بائیں جانب ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی۔ جو زیادہ لمبی نہ تھی۔

"بے حیا۔ بے غیرت رانی۔" ڈھانچے کے منہ سے غراہٹ آمیز آواز خارج ہوئی۔ "تمہیں آج ستر برس بعد تسکین حاصل کرنے کا شوق چرایا ہے۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ تم میری بیوہ ہو۔ اور دوسرے جنم میں تم سے میری شادی ہونی ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق کو فنا کر ڈالوں گا۔ جس طرح تمہارے باپ نے رسی سے میرا گلا اس دبا کر مارا تھا مجھے۔"

ڈھانچے کی بات سن کر تنویر سمجھ گیا کہ وہ رانی کا مردہ شوہر ہے۔ وہ موت کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

☆......☆......☆

تاریکی پھیلتے ہی شازیہ خوفزدہ ہو کر دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ مندر میں پوجا کرنے والے خاموش ہو چکے تھے اور وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اس سناٹے میں اسے اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد اندھیرے میں اپنی جگہ سے سرکتی ہوئی ہال کے دروازے کی طرف بڑھی لیکن دروازے کو ہاتھ لگانے پر محسوس ہوا کہ دروازہ بند ہے تو وہ ڈر گئی اور خوف سے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہاہاہا......!" اچانک خوفناک قہقہے سے سناٹے کا سینہ مجروح ہو گیا۔ "فضول کوشش مت کرو لڑکی۔"

اس آواز کو پہچان کر شازیہ کے بدن میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ وہ پنڈت کی آواز تھی۔ لیکن تاریکی میں وہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پھر اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور وہ سہم کر دروازے سے چپک گئی۔ جلد ہی وہ آہٹیں قریب آ گئیں۔

پھر اندھیرے میں کسی نے اس کی داہنی کلائی پکڑ لی۔ شازیہ کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی اور وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگی لیکن پکڑنے والے کی گرفت اتنی سخت تھی کہ شازیہ کو اس کی انگلیاں اپنی کلائی میں پیوست ہوتی محسوس ہوئیں۔ اچانک اس کے خوفزدہ ذہن میں دوسرے پجاریوں کا خیال آیا جنہیں تاریکی پھیلنے سے پہلے اس نے پوجا کرتے دیکھا تھا۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔" وہ زور زور سے چلانے لگی۔

"گاؤں والو۔ مجھے بچاؤ۔ میں کرشن کماری کی مہمان ہوں۔"

"ہاہاہا......" کلائی پکڑنے والے نے قہقہہ لگایا۔ "اس وقت سب بے ہوش پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا لڑکی۔ وہ چیخ و پکار سے بے نیاز ہیں۔"

وہ شنکر لال کی ہی آواز تھی۔ شازیہ خاموش ہو گئی۔ شنکر کی بات سن کر اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ ایک لمحے بعد شنکر لال کا ہاتھ اس کی کمر میں پڑا اور اس نے شازیہ کو اٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ شازیہ اس کے کندھے سے اترنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگی لیکن شنکر لال کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ وہ اندھیرے میں کسی طرف چل دیا تھا۔ شازیہ نے مزاحمت ترک کر دی اور سوچنے لگی کہ خود کو شنکر لال کے انتقام سے کیسے بچائے۔

دو منٹ بعد شنکر لال نے اسے کندھے سے اتار پھینکا اور وہ کسی نرم جگہ پر جا گری۔ اس نے جلدی سے سنبھلتے

ہوئے ادھر ادھر ہاتھ مارا۔وہ کوئی نرم اور گداز بستر تھا۔اس نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔لیکن اسی لمحے شنکر نے اسے دبوچا اور اسے آغوش میں لئے بستر پر دراز ہوگیا۔

شازیہ نے تیزی سے سر اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس کی کلائی میں اپنے دانت پیوست کردیئے۔شنکر لال درد کی شدت سے بلبلایا اور اس نے شازیہ کے سر کے بال دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ کر بھینچ ڈالے۔شازیہ کے دانتوں کی گرفت سے اس کی کلائی چھوٹ گئی اور وہ چیخنے لگی۔شنکر لال نے اس کے بال چھوڑے ہی تھے کہ شازیہ نے تیزی سے دوسری طرف کروٹ لی اور بستر سے نیچے فرش پر آگری، گرتے ہی وہ بستر کے پیچھے سرک گئی اور پھر دوسری طرف سے نکل کر وہ کھڑی ہوگئی۔

”اندھیرے میں شنکر لال کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں، شازیہ دبے پاؤں بستر کی مخالف سمت میں چل دی۔اسی لمحے شنکر لال کی غضبناک آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ لڑکی......ورنہ خون پی جاؤں گا تمہارا۔“

لیکن اس کی غراہٹ سنتے ہی شازیہ نے دوڑ لگادی۔دوڑتی ہوئی وہ چند لمحوں بعد ہی روشنی میں پہنچ گئی۔یہ ایک راہداری تھی جس کے اختتام پر اوپر جانے کے لئے زینے بنے ہوئے تھے۔زینوں کے پاس ہی ایک طاقچے میں چراغ جل رہا تھا۔اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو وہاں ایک دروازہ تھا جس سے وہ گزر کر باہر آئی تھی۔اس نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور زنجیر لگادی۔

☆......☆......☆

رسی کے سرے پر گول پھندا بنا ہوا تھا اور ڈھانچا ان کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔تنویر نے پلٹ کر رانی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اچھل پڑا۔رانی اپنی جگہ سے غائب تھی۔نہ جانے وہ ایک دو لمحوں میں کہاں بھاگ گئی تھی۔تنویر نے بوکھلا کر پھر ڈھانچے کی طرف دیکھا مگر وہ رکے بغیر آگے بڑھ رہا تھا اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ ڈھانچا اب صرف اسے ہلاک کرنے کے لئے آرہا ہے۔یقیناً یہی بات تھی اگر وہ رانی کو پھندے سے گلا دبا کر مارنا چاہتا تھا تو وہ اب موجود نہیں تھی۔پھر وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ دونوں کو فنا کرنے آیا ہے۔رانی تو جان بچانے کے لئے غائب ہوگئی تھی لہٰذا اسے بھی اپنی جان بچانی چاہئے تھی۔

یہ خیال آتے ہی تنویر تیزی سے غار کے دہانے کی طرف دوڑ پڑا۔اس کے بھاگتے ہی عقب سے ڈھانچے کی آواز ابھری۔”رک جاؤ۔میری عزت سے کھیلنے والے عیاش۔تم میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔“

تنویر اس کی دھمکی سن کر کانپ کر رہ گیا لیکن وہ رکے بغیر دوڑتا رہا۔وہ غار کے دہانے کی طرف مڑا تو اس طرف تاریکی تھی۔اسی لمحے سامنے کی جانب سے کسی نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھتے ہوئے اسے روک دیا۔

”ٹھہرو بابو۔“ اسے رانی کی سرگوشی سنائی دی۔”میں نے اس خبیث کا انتظام کرلیا ہے۔ڈرنے کی ضرورت نہیں۔وہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔آؤ دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔“

”نن۔نہیں۔مجھے جانے دو۔“ تنویر خوف سے ہکلایا۔

”مجھ پر اعتبار کرو بابو۔“ رانی کا لہجہ سخت ہوگیا۔”اگر تم خوفزدہ ہو تو یہاں ٹھہرے رہو۔لیکن یہاں سے باہر جانے کی کوشش مت کرنا۔میرے پتی کے کئی مددگار باہر موجود ہیں۔جو تمہیں دیکھتے ہی کچا کھا جائیں گے۔“

پھر وہ غار کے روشن حصے کی طرف بڑھ گئی۔تنویر رک کر اس طرف سے آنے والی آوازیں غور سے سننے لگا۔

”اچھا ہوا۔تم خود ہی واپس آگئیں۔“ ڈھانچے کی غصیلی آواز سنائی دی۔”تمہارا وہ جھوٹا عاشق تو میری ایک للکار سے ہی بھاگ گیا۔“

”بکواس مت کرو۔وہ جھوٹا نہیں سچا عاشق ہے۔“ رانی کی غراہٹ ابھری۔”وہ بھاگا نہیں غار میں ہی موجود ہے۔“

”آہا۔پھر تو تم دونوں کو ہلاک کرنے میں بڑا لطف آئے گا۔“

”وہ کس خوشی میں۔اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ رانی غرائی۔

”اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔کوئی غیرت مند پتی یہ برداشت نہیں کرسکتا۔“

''واہ......؟'' رانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اتنے ہی غیرت مند تھے تو مرنے سے پہلے مجھ سے شادی کر لیتے۔''

''تمہارے باپ نے مجھے اس رسی سے مار ڈالا تھا۔ ورنہ شادی میں تو چند دن رہ گئے تھے۔'' ڈھانچے کی آواز سنائی دی۔

''تمہارے کرتوت ہی ایسے تھے۔ پھر وہ تمہیں کیسے معاف کر دیتا۔''

تنویریان کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ڈھانچے کی آواز آئی۔ ''تم اس بابو کے ساتھ عیاشی کر رہی ہو۔ آخر تمہیں اس کی جرأت کیسے ہوئی نابکار۔''

''بکواس بند کرو کتے۔ میں تمہاری پابند نہیں ہوں کہ تمہارے دوسرے جنم کا انتظار کرتی۔ مجھے تو تم سے شدید نفرت ہے۔''

''اچھا۔ تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' ڈھانچے کی غراہٹ بلند ہوئی۔

لیکن اگلے ہی لمحے غار میں اس کی چیخیں گونجنے لگیں یقیناً وہ کسی اذیت میں مبتلا تھا۔ نہ جانے رانی نے کیا کیا تھا۔ پھر یکدم کسی کے گرنے کی آواز آئی اور ڈھانچے کی چیخیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔

☆......☆......☆

راہداری کے اس دروازے کو باہر سے بند کر کے وہ ہانپنے لگی۔ اسے امید تھی کہ پنڈت شنکر لال دروازہ کھول کر باہر نہ آ سکے گا۔ پھر وہ تیزی سے زینوں کی طرف بڑھی ہی تھی کہ عقب سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ یقیناً شنکر لال دروازے تک آن پہنچا اور اس دروازے سے باہر آنے کے لئے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ شازیہ نے ایک لمحے کے لئے رک کر چہرہ گھمایا اور بند دروازے پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ تیزی سے زینے کی طرف بڑھنے لگی۔

''دروازہ کھولو لڑکی!'' پنڈت شنکر لال کی غضبناک آواز سنائی دی۔ ''تم یہاں سے کبھی باہر نہ جا سکو گی۔'' شازیہ کو خطرہ ہوا کہ کہیں شنکر لال اپنے جادو سے اس کا راستہ بند نہ کر دے۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک دم دوڑ پڑی۔ زینوں کے پاس پہنچ کر اس نے ایک لمحے کے لئے دروازے کی طرف دیکھا اور زینے چڑھنے لگی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلنے کی تیز آواز آئی۔ شازیہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور بوکھلا گئی۔ دروازہ کھل چکا تھا اور شنکر لال اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

شازیہ فوراً ہی تیزی سے زینے چڑھنے لگی۔ عقب سے شنکر لال چیخا۔ ''رک جاؤ لڑکی ورنہ فنا کر ڈالوں گا۔'' اس کی دھمکی سن کر شازیہ رکنے کے بجائے اور تیزی سے زینے طے کرنے لگی۔ پندرہ سولہ زینے طے کر کے وہ کھلے دروازے کے سامنے پہنچی۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا جس میں چراغ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شازیہ جلدی سے اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اسی لمحے نیچے سے شنکر لال کے دوڑنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ شازیہ نے تیزی سے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کسی مردے کی خشک ہڈیاں پڑی تھیں۔

شازیہ نے یک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ شنکر لال راہداری والے دروازے کی طرح اس دروازے کو بھی کھول سکتا تھا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان ہڈیوں میں سے ایک لمبی ہڈی اٹھالی۔ جو شاید مردے کی ٹانگ کی ہڈی تھی۔ وہ ہڈی اٹھا کر زینوں کے دروازے کے پہلو میں آئی اور دیوار سے پشت لگا کر انتظار کرنے لگی۔ تہ خانے سے شنکر لال کے قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ آہٹیں زینوں پر آ گئیں۔ شازیہ نے ہڈی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جلد ہی آہٹیں دروازے کے پاس پہنچ گئیں۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور شنکر لال تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اسی لمحے شازیہ نے آڑ سے نکلتے ہوئے پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کی۔ ضرب خاصی شدید تھی شنکر لال کے حلق سے کربناک سی چیخ بلند ہوئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ شازیہ نے دوسرے وار کے لئے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا۔ لیکن شنکر لال نے دوبارہ کوئی حرکت نہ کی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

شازیہ نے ہانپتے ہوئے ہڈی پھینکی اور کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھی جو بند تھا۔ اس نے دروازہ

کھولنے کی کوشش کی اور اسے ناکامی نہ ہوئی۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے باہر جھانکا۔ ادھر بھی ایک راہداری تھی جس کے ایک سرے پر چراغ جل رہا تھا اور ایک بند دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ شازیہ پہچان گئی۔ وہ پوجا پاٹ والے بڑے کمرے کا دروازہ تھا۔ راہداری کی دوسری سمت میں چند قدم کے فاصلے پر مندر کا داخلی دروازہ تھا جو بند نظر آرہا تھا۔

پوجا پاٹ والے کمرے کی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید پوجا ختم کرکے گاؤں والے باہر جاچکے تھے۔ چنانچہ وہ کمرے سے نکل کر تیزی سے راہداری کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ شنکر لال کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ وہ جلد ہوش میں نہ آسکے گا۔ اس کے باوجود وہ اب بھی خوفزدہ تھی۔

ابھی وہ دروازے سے آٹھ دس قدم پیچھے ہی تھی کہ ایک دم چراغ بجھ گیا اور وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ تاریکی پھیلنے پر وہ گھبرا گئی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ لیکن اچانک بائیں جانب کا ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے وہ کسی سے ٹکرا کر فرش پر گرتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

غار کے تاریک حصے میں کھڑا تنویر سوچ رہا تھا کہ رانی نے اس ڈھانچے پر کیسے قابو پایا ہوا۔ اچانک اسے ڈھانچے کی بات یاد آئی۔ جس نے رانی سے کہا تھا کہ وہ ستر سال بعد عیاشی کررہی تھی۔ گویا رانی کا ہونے والا شوہر ستر سال پہلے مرا تھا۔ یہ خیال کرکے تنویر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ چودہ پندرہ برس کی نظر آنے والی رانی اصل میں ستر برس سے زیادہ عمر کی تھی لیکن پراسرار طور پر اس کا شباب نوجوان دوشیزہ کی طرح تھا۔

"بابو۔" اچانک تاریکی میں اسے قریب سے رانی کی آواز سنائی دی۔ اور وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔

"اوہ۔ تم نے اپنے پتی کے ساتھ کیا کیا۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"وہی۔ جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔" رانی کی دلکش ہنسی سنائی دی۔ "میں نے اس کا جو حشر کیا ہے اسے دیکھ کر تم خوف سے بے ہوش ہوجاؤ گے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"نہیں بابو۔ پہلے میرا کام کرو۔" رانی ضد کرنے لگی۔ "دیکھو۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے پتی کو ہمیشہ کے لئے فنا کردیا ہے۔ اب تم بھی جانا چاہتے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھے اپنی بانہوں میں لے لو بابو۔"

وہ اس کے ساتھ غار کے روشن حصے میں آگیا۔ وہاں فرش پر اس ڈھانچے کی کھوپڑی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ نجانے رانی نے کیسے اس کی کھوپڑی پاش پاش کی تھی۔ تنویر کی آنکھیں بند تھیں اور ذہن پر آسودگی کا نشہ طاری تھا۔ چند لمحوں بعد نشہ اترا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ لیکن اب غار میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رانی کو چھوا لیکن رانی فرش پر موجود نہیں تھی۔ اس نے آگے سرکتے ہوئے دو تین فٹ تک ہاتھ پھیرا لیکن رانی نہ ملی۔

"رانی۔ رانی۔ تم کہاں ہو؟" اس نے پریشان ہوکر اسے آواز دی۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ شاید رانی کہیں دور جاچکی تھی۔ خود کو وہاں تنہا محسوس کرکے اس کے ذہن پر دوبارہ خوف طاری ہونے لگا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ پیچھے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ رانی کی ہنسی پہچان کر پلٹا تو رانی کے بجائے وہ کالی چڑیل کو دیکھ کر خوف سے اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔

☆......☆......☆

اس کا سر فرش سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اسی لمحے باہر سے دوڑتے قدموں کی آہٹیں ابھرنے لگیں۔ شازیہ اٹھ بیٹھی۔ چوٹ لگنے سے اس کا سر چکرا رہا تھا اور ذہن پر دہشت طاری تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کسی انسانی ڈھانچے سے ٹکرا کر گری تھی۔ باہر سے دوڑتے قدموں کی آہٹیں قریب آتی جارہی تھیں۔ پھر یکدم

راہداری کا دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک کے پاس ٹارچ تھی جس کی روشنی شازیہ پر پڑ رہی تھی۔

"ارے۔ یہ تو کرشن کمار کی مہمان ہے۔" ان میں سے ایک نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ٹارچ والا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔" مگر یہ یہاں کیسے آ گئی۔"

"پتا نہیں۔" دوسرے نے کہا۔ پھر قریب پہنچ کر شازیہ سے بولا۔ "بیگم صاحبہ۔ آپ چیخی تھیں؟"

"ہاں۔ میری مدد کرو...... مجھے باہر لے چلو......" شازیہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

پھر وہ خود ہی اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا وہ دونوں بھی اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ وہ مندر سے باہر آئے تو چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ شازیہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے تنویر کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

"تم نے میرے شوہر کو تو یہاں نہیں دیکھا۔" شازیہ نے ان دونوں سے سوال کیا۔

"نہیں۔ لیکن ہم آئے انہی کی تلاش میں تھے۔" ٹارچ والے نے کہا۔

"کیوں؟" شازیہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کس نے اس کی تلاش میں بھیجا ہے؟"

"کرشن کمار کی پتنی سیتا نے۔" ٹارچ بردار بولا۔

"میں ان کا پڑوسی ہوں۔ کچھ دیر پہلے وہ پریشانی میں میرے گھر آئی اور مجھے کہا کہ میں بابو کو بلا لاؤں جو مندر کے باہر بیٹھے ہوں گے کہیں وہ بارش میں بھیگ کر سردی سے بے ہوش نہ ہو گئے ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی ٹارچ نکالی اور اپنے دوست گوپال کے ہمراہ اس طرف آیا۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی آپ کی چیخ سنائی دی۔ تو ہم اندر آ گئے۔"

"اگر وہ گھر پر نہیں ہے تو یہیں کہیں ہوگا۔ مہربانی کر کے اسے تلاش کرو۔" شازیہ نے پریشان کن لہجے میں ان سے کہا۔

وہ دونوں شازیہ کے ساتھ تنویر کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگے لیکن تنویر نہ ملا۔ شازیہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے مندر کے چاروں طرف کا علاقہ دیکھ ڈالا۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ مندر میں کیا کر رہی ہیں؟ سیتا نے آپ کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔" ٹارچ والے نے پوچھا۔

"میں پنڈت شنکر لال کی دعوت پر پوجا دیکھنے کے لئے آئی تھی لیکن وہاں مجھے نیند آ گئی۔" شازیہ نے جھوٹ بولا۔ "آنکھ کھلی تو خود کو اندھیرے میں پا کر خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ تم ذرا مرگھٹ کی طرف چلو کہیں میرا شوہر ادھر نہ گیا ہو۔"

"نہیں بیگم صاحبہ۔" ٹارچ والے کا ساتھی گوپال سہم کر بولا۔ "آدھی رات کو مرگھٹ میں جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"کیوں۔" شازیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اس وقت وہاں مرنے والوں کی روحیں گھومتی ہیں اور زندہ انسانوں کو پکڑ کر ان کا خون چوس لیتی ہیں۔" گوپال نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ "ممکن ہے بابو جی ادھر گئے ہوں اور بدروحوں نے انہیں پکڑ لیا ہو۔"

شازیہ تو پہلے ہی خوف کی ماری ہوئی تھی۔ بدروحوں کا ذکر سن کر وہ پھر خوفزدہ ہو گئی۔ "اب میں کیا کروں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر میرے شوہر کو کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گی۔"

"آپ فکر مت کریں بیگم صاحبہ۔ میرے پاس ٹارچ ہے۔ میں جاتا ہوں مرگھٹ میں۔" ٹارچ والے نے کہا پھر وہ گوپال سے بولا۔ "گوپال۔ تم بیگم صاحبہ کو لے جاؤ اور کرشن کمار کے گھر پہنچا دو۔"

☆......☆......☆

ٹھیک اسی لمحے مرگھٹ کی طرف سے ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور وہ دونوں چونک کر اس طرف دیکھنے لگے جبکہ شازیہ اس چیخ کو سن کر بوکھلا گئی۔

کالی چڑیل کو دیکھ کر تنویر کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ہنستی ہوئی اس کے قریب آئی۔ "کہاں جا رہے ہو؟" اس چڑیل کے منہ سے نکلنے والی آواز رانی کی تھی۔ تنویر خوفزدہ ذہن سے سوچ رہا تھا کہ کیا چڑیل ہی رانی ہے۔ جس سے اس نے آسودگی حاصل کی تھی؟ اگر رانی چڑیل تھی تو وہ دوشیزہ کے روپ میں اس سے کیوں ملتی تھی؟ کنواری لڑکی

کے روپ میں اس کا بھرپور شباب نظر آتا تھا۔ وہ چڑیل کے بدن پر کیوں نہیں تھا؟

"کیا سوچ رہے ہو بابو؟" کالی چڑیل کے منہ سے رانی کی آواز خارج ہوئی۔

"تت۔ تم کون ہو..... رانی کہاں ہے؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں ہی رانی ہوں۔ بابو۔" چڑیل نے ہنس کر کہا۔

"تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہارے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھائی۔ کیا تم اس کی وجہ جانتے ہو؟"

"نن۔ نہیں۔" وہ ہکلایا۔ خون چوسنے کے ذکر پر اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

"وجہ صرف یہ ہے کہ میں ستر سال سے پیاسی تھی اور تم نے میری پیاس بجھا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔" وہ خوفناک انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "آؤ۔ میں تمہیں کرشن کمار کے گھر پہنچا دوں۔ بیچاری سیتا ابھی تک تمہارے انتظار میں جاگ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر چڑیل نے اچانک ہاتھ بڑھایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ جھٹکا لگنے سے تنویر لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر آگرا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ کرشن کمار کے گھر کے صحن میں موجود تھا اور قریب سیتا کھڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم کب آئے بابو۔ میں نے تمہاری تلاش میں پڑوسی کو مندر کی طرف بھیجا تھا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"اوہ۔ کب۔ کتنی دیر ہوئی ہے؟" تنویر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی۔ ابھی وہ مندر تک نہ پہنچا ہوگا۔" سیتا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "اوہ۔ تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔ کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں۔ آؤ لباس تبدیل کر کے بستر میں گھس جاؤ۔"

پھر سیتا نے صحن کا دروازہ بند کیا اور تنویر کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہاں لیمپ جل رہا تھا۔ اس نے تنویر کا کوٹ اتارا۔ پھر پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور بولی۔

"بابو کپڑے اتار کر بستر میں گھس جاؤ۔ جلدی کرو کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔"

تنویر نے اندھیرے میں اپنے گیلے کپڑے اتارے اور قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ کر لحاف اوڑھ کر دراز ہو گیا۔

"بابو۔ مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔ کہو تو میں بھی لحاف میں آ جاؤں۔" سیتا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں ہاں۔ آ جاؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔" تنویر بولا اور سیتا اس کے دائیں پہلو سے لحاف میں گھس گئی۔ ٹھیک اسی لمحے کسی نے تنویر کو اٹھا کر فضا میں اچھال دیا۔

☆......☆......☆

گوپال مرگھٹ سے سنائی دینے والی چیخ سے پریشان ہو کر ٹارچ بردار سے بولا۔ "موہن داس۔ تم تنہا وہاں مت جاؤ۔ ہمارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ چلیں۔"

"کیوں گوپال بھائی چیخ سن کر ڈر گئے ہو۔" ٹارچ بردار نے ہنس کر کہا جس کا نام موہن داس تھا۔

"یہی سمجھ لو۔ پنڈت شنکر لال نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد مرگھٹ کی بدروحیں کالی دیوی کی پوجا کے لئے مندر کی طرف آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ اس طرف آنے ہی والی ہیں۔" گوپال نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں یار۔ تم بیگم صاحبہ کو لے جاؤ۔ بابو جی کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ وہ ہم سب کے مہمان ہیں۔"

پھر موہن داس نے شازیہ سے کہا۔ "بیگم صاحبہ آپ گوپال کے ساتھ جائیں۔ یہ آپ کو کرشن کمار کے گھر پہنچا دے گا۔" شازیہ چیخ سن کر پریشان ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ چیخ تنویر کی ہے۔ اب اس نے موہن سے کہا۔ "موہن بھائی میں تمہارے ساتھ مرگھٹ میں چلوں گی۔ گوپال بے شک گھر چلا جائے۔"

"بیگم صاحبہ۔ بدروحوں کے ٹھکانے پر جانا آپ کے لئے مناسب نہیں۔" گوپال نے جلدی سے کہا۔ "میری مانیں اور......"

"سنو موہن......" شازیہ نے گوپال کی بات قطع کرتے ہوئے ٹارچ بردار سے کہا۔ "وہ چیخ کسی بدروح کی نہیں میرے شوہر کی محسوس ہوئی ہے۔ تم میرے

ساتھ ادھر چلو۔"

"میں تو ہرگز وہاں نہیں جاؤں گا۔" گوپال نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔تم یہیں ٹھہرو یا گھر چلے جاؤ۔" موہن داس نے ناگواری سے کہا۔ پھر شازیہ سے بولا۔"آیئے بیگم صاحبہ۔"

شازیہ اس کے ساتھ مرگھٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ سنائی دینے والی چیخ تنویر کی تھی۔ لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ مرگھٹ کی طرف کیوں گیا تھا۔ موہن داس ٹارچ روشن کئے اس سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔ ٹارچ نہ بھی ہوتی تو وہ دور تک کا منظر دیکھ سکتے تھے کیونکہ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ گوپال مندر کے پاس کھڑا رہا۔ وہ بہت خوف محسوس کررہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں ٹھہرنے کے بجائے گھر چلا جائے لیکن تنہا جانے کی بھی اس میں ہمت نہیں تھی۔

شازیہ موہن داس کے پیچھے چلتی ہوئی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دونوں مرگھٹ کے قریب پہنچ گئے۔ جہاں جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ کے ٹیلے تھے۔ ٹیلوں کے پاس پہنچ کر موہن داس رک گیا اور ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر پھینکنے لگا۔ شازیہ وہاں پہنچ کر ایک بار پھر خوف محسوس کررہی تھی۔

"آپ یہاں ٹھہریں، میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔" موہن داس نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نن۔نہیں۔ میں بھی چلوں گی۔" شازیہ نے تیزی سے کہا۔

اور اس کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔ چند قدم چل کر وہ ٹیلوں کے درمیان پہنچ گئے۔ وہاں زمین پر جلی ہوئی انسانی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں مکمل اور ٹوٹی ہوئی کھوپڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر شازیہ کا خوف بڑھتا جارہا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ موہن داس کی ٹارچ کا روشن ہالہ دائیں بائیں حرکت کررہا تھا۔ اچانک بائیں جانب سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اور شازیہ نے دہشت زدہ ہوکر موہن کا بازو پکڑ لیا۔

"کیا بات ہے بیگم صاحبہ۔" موہن نے حیرت سے پوچھا۔

"تت۔تم۔تم نے ہنسنے کی آواز سنی موہن بھائی؟" شازیہ نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔آپ کو وہم ہوا ہے۔" موہن نے کہا۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

شازیہ نے خوف زدہ نگاہوں سے بائیں طرف دیکھا جدھر سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آئی تھی لیکن ادھر دیکھتے ہی وہ بے اختیار اچھل پڑی۔ اس طرف ٹیلے کے پاس کوئی شخص منہ کے بل پڑا دکھائی دے رہا تھا۔

شازیہ کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ وہ تنویر نہ ہو۔ اس نے ایک دم موہن داس کے ہاتھ سے ٹارچ چھین کر اس شخص پر روشنی ڈالی اور بوکھلا کر اس کی طرف بڑھ گئی۔ لباس سے اس نے تنویر کو پہچان لیا تھا۔ موہن داس بھی اس کے پیچھے لپکا۔ قریب آکر اس نے تنویر کو سیدھا کیا اور حیرت سے اچھل پڑا۔"ارے۔یہ تو بابو جی ہیں۔"

شازیہ نے جلدی سے جھک کر تنویر کی نبض چیک کی۔ وہ بے ہوش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے موہن داس سے کہا۔"موہن بھائی۔انہیں جلدی سے گھر لے چلیں۔آپ کی مہربانی ہوگی۔"

موہن نے جھک کر تنویر کو اٹھایا اور کندھے پر لاد کر شازیہ کے ساتھ واپس چل پڑا۔ اسی لمحے شازیہ کو عقب سے ایک پراسرار آواز سنائی دی۔

"شازیہ۔تم خوش نصیب ہو کہ اپنے شوہر کو زندہ لے جارہی ہو۔تم دونوں کی خیریت اسی میں ہے کہ کل ہی گاؤں چھوڑ دو۔تم جس مقصد کے لئے یہاں آئی ہو اس میں کبھی کامیاب نہ ہوسکوگی۔

شازیہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہ تھا۔ یقیناً موہن داس نے وہ آواز نہیں سنی تھی۔ ورنہ وہ بھی رک کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا۔

شازیہ موہن داس کے آگے آگے چلنے لگی۔ مندر کے پاس گوپال ان کا منتظر تھا۔ وہاں سے وہ آبادی کی طرف چل پڑے۔ کرشن کمار کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

وہ اندر آئے۔اسی لمحے سیتا اپنے کمرے سے نکل آئی۔وہ تنویر کو موہن داس کے کندھے پر لدا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تنویر کو دوسرے کمرے میں بستر پر ڈال کر موہن داس نے سیتا سے کہا۔

"بابو جی کے لئے انگیٹھی میں آگ جلا کر لاؤ۔ انہیں حرارت ملے گی تو جلدی ہوش میں آجائیں گے۔"

پھر وہ گوپال کے ساتھ رخصت ہوگیا۔سیتا جلدی سے انگیٹھی میں آگ جلا کر لائی تو اتنی دیر میں شازیہ تنویر کا گیلا لباس اتار چکی تھی۔سیتا کے اندر آتے ہی اس نے تنویر پر جلدی سے لحاف ڈال دیا۔

"سیتا۔تم جلدی سے چائے بناؤ..... میں انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہوں۔" شازیہ نے اس سے کہا۔

سیتا باہر چلی گئی۔شازیہ تنویر کی ہتھیلیاں ملنے لگی۔ تنویر کا جسم بری طرح ٹھٹھرا ہوا تھا۔چند منٹ بعد اسے ہوش آ گیا مگر شازیہ کو دیکھ کر وہ بے اختیار اچھل پڑا۔

"اوہ۔ت۔تم کب آئیں شازیہ۔" مجھے یہاں کون لایا؟"

"پہلے تم چائے پی لو ڈیئر۔بعد میں باتیں کریں گے۔"

سیتا کو آرام کرنے کی ہدایت دے کر شازیہ تنویر سے دبی زبان میں باتیں کرنے لگی۔اس نے مندر میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کرنے کے بعد کہا۔

"تم مرگھٹ میں بے ہوش پڑے تھے۔مجھے بتاؤ تم وہاں کیا کرنے گئے تھے اور وہاں تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

تنویر نے گہرا سانس لے کر کہا۔" مجھے حیرت ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسے ہی خوفناک واقعات پیش آئے تھے۔ تمہیں مندر پہنچا کر واپس آرہا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔"

اس نے بارش میں رانی کے ملنے سے لے کر غار سے نکلنے تک کے واقعات بیان کئے لیکن سیتا کا بالکل ذکر نہ کیا۔

"غار سے نکلتے ہی کسی نے مجھے اٹھا کر زور سے پھینکا اور میری چیخ نکل گئی۔اس کے بعد شاید میں بے ہوش ہوگیا تھا۔"

شازیہ نے ہنس کر کہا۔"تو گویا بدروحوں کے ساتھ مزے لوٹتے رہے ہو۔"

"پتا نہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔" تنویر نے کہا۔

شازیہ بولی۔"شاید وہ آواز اسی چڑیل رانی کی تھی جس نے مجھے مرگھٹ سے واپسی پر یہاں سے رخصت ہوجانے کی ہدایت کی تھی اور ہاں مندر میں مجھے ایک ڈھانچے نے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ تم نے میری غیر موجودگی میں سیتا سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ میں ایسا کرسکتا ہوں۔" تنویر نے جواب دیا۔"کیا اپنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ کر میں ایک ہندو اور میزبان عورت سے......"

"چھوڑو اس بات کو...... میں نے کون سا ڈھانچے کی بات سچ سمجھی تھی۔" وہ بولی۔"صبح تو ہم نے چلے جانا ہے۔"

"اتنی جلدی کیوں۔دو چار دن تو گاؤں کی آب و ہوا کا مزہ لینے دو ڈارلنگ۔" تنویر نے سیتا کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔تم کون سا مزہ لینا چاہتے ہو۔مگر اب بدروحیں تمہارے خون سے اپنی پیاس بجھائیں گی۔ انہوں نے مجھے وارننگ دی ہے۔اس لئے اب تمہیں مجھ پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔میں نہیں چاہتی کہ پردیس میں ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے۔" اس نے کہا۔

"میں تو تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ورنہ میرا ارادہ آگرہ جا کر تاج محل دیکھنے کا تھا۔"

صبح آٹھ بجے کرشن کمار گھر آیا تو ناشتے کے بعد انہوں نے کرشن سے رخصت کی اجازت مانگی۔ پہلے تو اس نے اصرار کیا کہ چند دن یہاں رہیں لیکن تنویر نے ایک ضروری کام کا بہانہ کیا تو وہ خاموش ہوگیا۔پھر وہ انہیں بیل گاڑی پر بٹھا کر مین روڈ پر لے آیا۔وہاں سے وہ دہلی جانے والی بس میں سوار ہوئے اور بس دہلی شہر کی طرف دوڑنے لگی۔